Cata

پیشل ایڈیشن رہنمائے زندگی ی دلی

اکو اور جگاؤ



ق آموز واقعات



گرہست شاستر

مصنف
شری مہانند ایڈیٹر "رہنمائے زندگی"

جاگو اور جگاؤ

سبق آموز واقعات

عبرت انگیز حالات

زندگی بخش تجربات

دلچسپ آپ بیتی کہانیاں

دل میں اُتر جانے والی داستانیں

ایڈیٹر ——— مہانند

فی کاپی ڈیڑھ روپیہ .... بذریعہ ڈاک دو روپے

پبلشرز:- رسالہ "رہنمائے زندگی" نمبر ۹۳۴۱ ... گنج نئی دہلی

لمبے چوڑے لیکچر اور اُپدیش جہاں فیل ہو جاتے ہیں، وہاں روزانہ زندگی کا ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ، اِس قدر مؤثر ثابت ہوتا ہے کہ برسوں کے بھولے بھٹکے صحیح راہ پر آجاتے ہیں؀

اِن صفحات میں، بس اِسی قسم کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات دیئے گئے ہیں؀

زندگی

غور و فکر

زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی باتیں .. ۹

کھوٹا پیسہ ۱۱

خدا سے چکمہ ۱۲

ہمارا کمینہ پن ۱۳

چور سے بچو ۱۴

...نصاف سے کہیئے ۱۵

...وان ہی اچھے ۱۶

علم و عمل

تین گورو ٢١

سو سال جینے کے لئے ٢٣

دیش کی خدمت ٢٤

شادی کی پہلی شرط ٢٦

انگریزی کیوں نہیں پڑھائی ؟ ٢٨

روپیہ کی آمدنی ٣١

ریلوے کے چوہے ٣٤

راج جیوتشی ٣٧

سورگ کی ہنڈی دینے والے ٤٠

زبان کا رس ٤٢

موقعہ شناسی ، ایک ہنر ٤٤

ہمدردی کا مرہم ٤٦

بگڑتا کام سدھرتا ہے ٤٨

غیر بھی اپنے بن جاتے ہیں ٥٠

غصہ چنڈال ٥١

اپنا اپنا مزاج ٥٣

ہیئر کٹنگ سیلون میں ٥٧

مہذب عورتیں ٥٩

سرکاری پیشاب گھر ٦٠

مفت خورے ٦٢

مایا داس ٦٦

دوستوں کی لڑائی ۶۸
ایک آنکھ سے دیکھنے والے ۶۹
تین بھلے آدمی ۷۲
سائیکل رکشا ۷۴
وقت کی قیمت ۷۶
ٹائم ٹیبل ۷۷
کام کا وقت بنام اپنا وقت .. ۷۸
آفس منیجر ۷۹
پبلک سرونٹ ۸۰
کتنا خود غرض ۸۳
میں حیران رہ گیا ۸۵
خواہ مخواہ ۸۶
روز کا واقعہ ۸۸
نئی سپرٹ ۹۱
یہ پاگل نوجوان ۹۴
شرارت کا جواب ۹۶
گرہست کی گاڑی کیسے چلے گی ؟ .. ۹۸
گرہست کی گاڑی ایسے چلے گی .. ۱۰۰
ایک ایسی مسکراہٹ ۱۰۳
میرا — تیرا ۱۰۵
بے چاری بہو ۱۰۸
ٹوٹے دل ۱۱۰

طلاق ۱۱۳

چند تجربے

صفائی کے دُشمن ۱۱۶
مارنے والی ماں ۱۱۸
پیار کی جیت ۱۱۹
یہ ڈر، یہ خوف ۱۲۱
جھُوٹ کا بیج ۱۲۲

دِل چسپ آپ بیتیاں

شہر کا فیشن ۱۲۵
جھُوٹی خیرات ۱۲۸
مُسکراہٹ کی قیمت ۱۲۹
کالج کی لڑکی ۱۳۱
سُکھ کہاں ؟ ۱۳۳
شہر سے دُور ! ۱۳۴
پرائیویٹ بات چیت ۱۳۵
پنشن کا حق ۱۳۶
رَوا داری کا سبق ۱۳۷
دُو رنگ ۱۳۸
فرض شناس ۱۴۰
کرایہ کا مکان ۴۱
پڑوسی ۱۴
سادھو بابا .. ..

سچ کی قیمت ۱۴۵

گندی عادتیں ۱۴۶

کچّی زبان ۱۴۷

ناپسندیدہ لہجہ ۱۴۹

اپنی زبان ۱۵۰

سنت موچی ۱۵۲

یہ سنسار ہمارا ۱۵۴

ایمان کا ترازو ۱۵۶

عورت کی عزت ۱۵۷

انسانیت کا سبق ۱۵۸

اوپر والے کا خیال رکھو ۱۵۹

کتاب کی لاش ۱۶۱

یہ کالج سٹوڈنٹ! ۱۶۶

ٹھنڈے دل سے سوچیے ۱۶۹

بُڈھی گوالا ۱۷۲

چھوٹے چھوٹے واقعات

لگن ۱۷۴

بُرا ۱۷۵

ٹوپی

قومی اخلاق

اپنے عیب ۱۷۶

پیار کا اشارہ ۱۷۷

محنت کی کمائی ۱۷۷

ووٹ کی قیمت ۱۷۸

شرافت کا نمونہ

پولیس کا ڈر

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی - ۱۷۹

سچائی ہو تو ایسی ۱۸۰

پیسے کی قدر

کیلا کا چھلکا ۱۸۱

ضروری اور غیر ضروری

حصہ دار

جگ بیتی کہانیاں

دو خدا ۱۸۳

جنت اور جہنم ۱۸۵

اپنی کمائی ۱۸۷

دولت کی لائنیں ۱۸۹

قانون کے محافظ ۱۹۰

یہ کتے ۱۹۲

بے ایمان ۱۹۳

پہلے جیب دیکھئے ۱۹۴

اچھا بولنے والا ۱۹۶

فرق تو ہے! .. .. ۱۹۸ یب

اپنے آپ کو سزا دیجئے .. ..

چند غیر مُلکی حالات

سیبوا کی زندگی ۲۰۱
اِنگلستان کا بھنگی ۲۰۴
ماں کا دِل ۲۰۶
تیسرے دَرجہ کا سَفر ۲۰۸
اچھّی پولیس ۲۰۹
جاپانیوں کا اِخلاق ۲۱۲
صفائی کا شوق ۲۱۳
گنّو بھگت
قانون کی اطاعت ۲۱۴

چُٹکیاں (اکار آمد اِشارے)

میباڑل ۲۱۷
یہ آدمی ۲۲۱
بَڑھ کا درخت ۲۲۴
خوبصورت کھلونا ۲۲۶
سُنہری کتاب ۲۲۸
لیمپ اَور پرَوانہ ۲۳۰
کھٹمل کی پھٹکار ۲۳۲
داستانِ معدہ ۲۳۳
تین پریاں ۲۳۶
کانچ کا محل ۲۳۷
تیسرا دُوست ۲۳۸



غور و فکر

زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی چھوٹی چھوٹی باتیں

آج کل "لیڈر شاہی" کا بول بالا ہے، اہمیت لمبی چوڑی تقریروں کو، اعلانوں کو، بیانوں کو، دی جاتی ہے۔ خوبصورت زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف کون توجہ دے۔ بڑے کاموں سے ہمیں فرصت کہاں ہے؟ لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی ہماری زندگی بنتی یا بگڑتی ہے۔ اصل میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہی کسی قوم کی تہذیب کی صاف جھلک ملا کرتی ہے۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے، شاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی۔ بہت سے ملکوں کے لوگ جوبلی کی شان دیکھنے لنڈن آئے تھے، انگریزوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ رات بھر پبلک پارکوں اور باغ باغیچوں میں کھیلتے، گاتے اور ناچتے رہتے تھے۔ بچے بوڑھے سبھی۔ جوبلی کی تقریب ختم ہونے کے بعد پارکوں اور باغیچوں کے افسر کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں لکھا تھا کہ جہاں تک پتہ چلا ہے، کسی کیاری یا باغیچے کا ایک بھی پھول جوبلی کے دنوں میں نہیں توڑا گیا۔ کتنے تعجب کی بات ہے!

ہمارے بھائی پوچھا کرتے ہیں، باغیچے کے پھول اور ہیں کس لئے ؟ کسی پارک میں گئے تو وہاں پھولوں پر دھاوا بول دیا، کھُلے عام یا چوری سے !!

○ ٹرینوں میں ہماری کیا حالت ہے ؟ تیسرے درجہ میں بیٹھ کر اُسے ہم اپنا گھر جیسا ہی گندہ بنا لیتے ہیں، وہیں کھا کر ہاتھ منہ دھونا، وہیں تھوکنا، وہیں ناک صاف کرنا، اور وہیں بچّوں کو ٹٹّی کرانا۔ ہمیں دُوسروں کی بے آرامی یا تکلیف کا کوئی خیال نہیں رہتا ۔

○ ٹکٹ گھر، ڈاک گھر، سنیما وغیرہ جگہوں پر کس طرح جانوروں کی طرح ایک دُوسرے کو ہم دھکا دیتے ہیں۔ جب سنیما گھر کے دروازے کھُلتے ہیں تب ہم کس طرح بے صبری کے ساتھ ایک دُوسرے سے پہلے اندر گھُسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا سوگ کے دروازے ہی کھُلے ہوں ۔

○ سڑک پر چلتے چلتے کھانسی آئی تو جھٹ راستے کے عین بیچ تھوک دیا۔ کیا ہمیں اُن بھائیوں کا بھی خیال رہتا ہے جو ننگے پیر سڑک پر چلتے ہیں ؟

○ کسی لائبریری میں گئے تو کتابوں کی اچھی اچھی تصویریں ہی پھاڑ لیں، اور بڑے ٹھنڈے دِل سے، کبھی کبھی طبیعت آگئی تو کتابوں کے صفحے ہی نکال لئے۔ اور یہ حرکتیں کرتے ہیں ہمارے مہذّب اور تعلیم یافتہ نوجوان !

○ اپنے نوکروں کے ساتھ ہم کِتنا اچھا برتاؤ کرتے ہیں ! اُن سے اس طرح کام لیتے ہیں، جیسے وہ آدمی کی شکل کے جانور ہوں۔ اُن بیچاروں کو ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ صبح سے شام تک اور مِلتا ہی کیا ہے ! ان سے غلطیاں ہوتی ہیں، لیکن جب وہ اچھا کام کرتے ہیں تب کیا ہم اُنہیں پیار یا تعریف کے دو لفظ کہتے ہیں ؟

جب ہم گرمیوں میں خس کی ٹٹّی لگا کر اندر بیٹھتے ہیں اور نوکر کو باہر لُو میں بٹھا کر ٹٹّی پر برابر پانی ڈالتے رہنے کو کہتے ہیں، تب کیا ہم نوکر کی حالت کا اندازہ بھی لگاتے ہیں ؟

○ یہ سب چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں، لیکن اِنہی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہ دے کر ہم نے اپنے دِل کو پتھر بنا لیا ہے۔ جب بڑے کام کرنے کے موقعے آتے

ہیں، تب ہمارا پتھر کا دل کیا کام آسکتا ہے؟

○ "ہماری زندگی چھوٹی باتوں سے ہی بنتی ہے" —— اِس چھوٹے سے فقرے کا ہم جاپ شروع کر دیں، تو اچھا ہی ہوگا۔ اپنی آزادی کو، اپنے سوراج کو، قایم رکھنے کے لئے ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ دینا ہوگا:

کھوٹا پیسہ

چند سال پہلے کاشی کے وشنوناتھ مندر میں جانے کا موقعہ مِلا تھا۔ مندر کی مورتی کے سامنے چوک میں مَیں نے دیکھا کہ فرش میں پیسے لگے ہوئے ہیں، جن پر لوگوں کے پَیر برابر پڑتے رہتے ہیں، شاید کچھ بھگت لوگ ہی اِن پیسوں کو لگوا دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ان پر اِدھر مہنتوں اور سادھوؤں کے مُبارک قدم پڑیں گے اور اُدھر سُورگ میں اُن کے لئے کوئی جگہ ریزرو ہو جائے گی۔ مُورتی پر بھی پیسوں کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے، مگر ایک دوست سے —— جنہیں مندر کا کافی تجربہ تھا، معلوم ہوا کہ جو پیسے اِس طرح چڑھائے جاتے ہیں ان میں سے کافی کھوٹے نکلتے ہیں:

○ کوئی بھی چیز بگڑ جانے پر اور ہمارے کام کی نہ رہنے پر ہمیں دان کی بات جھٹ یاد ہو آتی ہے۔ گائے اب بُڈھی ہو گئی اور دُودھ نہیں دیتی ہے تو کسی براہمن یا گئو شالہ کو دان دے دینے سے بڑھ کر اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کپڑے پہنتے پہنتے جب گھس جاتے ہیں تب اُنہیں بڑی شان سے بھکاریوں اور نوکروں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ گھر میں کچھ پھل آئے اور کئی دِن کے بعد ان میں سے کچھ سڑنے لگے تو نوکروں کا خیال آتا ہے اور وہ سڑے پھل بڑے پریم سے انہیں دیئے جاتے ہیں۔ بچارے غریب بھکاری کو بھی کئی لوگ کھوٹا پیسہ پھینک دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے:

○ سوال کھوٹے پیسے کا نہیں، کھری کھوٹی نیت کا ہے۔ بھگوان کو ہم دُنیا کی معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز نذر کریں، مگر پاکیزہ دِل اور سچی عقیدت کے

ساتھ، تو ایشور کے نزدیک وہ بڑی سے بڑی بھینٹ ہو گی۔ ایشور ہمارے دھن کا بھوکا نہیں ہے۔ پھر اگر ہم کھوٹے پیسے چڑھانے لگیں تو ہمارا انیاگ ہو گا یا پاکھنڈ!

○ امیر دولت مند لوگ اپنی دولت سے ایشور کو بھی پھُسا کر رشوت دینا چاہتے ہیں۔ وہ روپوں پیسوں سے ایشور کو جیتنا چاہتے ہیں۔ مگر پنڈت پجاری اُلٹا انہی پہ ہاتھ صاف کر کے اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں۔ دولت مند غریبوں کو لُوٹ کر اپنی جیب بھرتے ہیں۔ پھر پجاری، مہنت، پادری، انسان کی جیبوں پر انہی کی رضامندی سے قینچی کیوں نہ چلائیں؟ لُوٹ کا پیسہ تو لُوٹ ہی میں چلا جانا چاہیئے، افسوس اتنا ہی ہے کہ وہ پیسہ غریبوں کے پاس واپس نہ پہنچ کر لُٹیروں ہی کے پاس رہ جاتا ہے، صرف جیبیں بدلتی رہتی ہیں۔

خُدا سے چکمہ

دُور کے ایک رشتہ دار کے ہاں شادی تھی چند کپڑے بنوانے تھے۔ بزازہ مارکیٹ میں جا دھمکا۔ خاصی بھیڑ تھی۔ حوا کی بیٹیاں دُکانوں پر دھرنا مارے مول تول کر رہی تھیں۔ مَیں بھی ایک دُکان پر جا بیٹھا۔ اپنی پینٹوں، بُش شرٹوں، اور کوٹوں کا کپڑا خرید چکا تو معاً خیال آیا، شریمتی جی نے شنون کے ڈوپٹے کی فرمائش کی تھی، چلو لگے ہاتھوں وہ بھی لے چلوں۔

سیٹھ صاحب (دہلی میں عام طور پر سبھی دُکانداروں کو اسی نام سے پکارتے ہیں) سے شنون دکھانے کے لئے کہا۔ اُس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس وقت اس کے پاس اچھی شنون نہیں ہے۔ لہذا آپ کل آ کر لے جاویں۔ مَیں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا کہ مَیں اگلے دن صبح آٹھ بجے آ کر لے جاؤں گا، وہ کپڑا الگ رکھیں۔

سیٹھ صاحب کہنے لگے۔ "بابُو جی، اتنے سویرے کیسے دُکان کھول سکتا ہُوں۔ سارا دن جھُوٹ سچ بولتے ہیں۔ کچھ عاقبت کی بھی فکر کرنی ہوتی ہے۔ سویرے چھ بجے سے آٹھ بجے تک پُوجا پاٹھ سے نپٹ کر پھر چائے پانی پیتا ہُوں۔ نو سے پہلے نہ آسکوں گا"۔

میں تحیر زا نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسا فریب ہے۔ اگر اسے پرماتما سے حقیقی لگن ہے تو یہ جھوٹ سچ کیوں بولتا ہے۔ پہلے ہی صداقت کا دامن کیوں نہیں تھامتا؟ انسان اپنے ہم جنسوں کو تو ٹھگتا ہی ہے۔ خدا کو چکمہ دینے سے بھی باز نہیں آتا۔

ہمارا کمینہ پن

اُس دن ایک مندر میں مَیں کیرتن سننے گیا، جب چپل کھول کر اندر جانے لگا تو خیال آیا کہ چپل بالکل نئی ہے، کہیں کسی کا جی نہ للچائے۔ چپل کو جان بوجھ کر اُلٹا رکھا تا کہ کسی کی نظر اس پر نہ پڑے، اندر جا کر بھی خیال باہر ہی رہا۔ آخر کیرتن سنتا تھا تو پھٹی پرانی چپل کیوں نہ پہن کر آیا؟ لیکن اُمید تھی کہ مندر میں تو کوئی چپل اٹھانے نہ آتا ہوگا۔

کیرتن ختم ہو جانے پر جب بھیڑ باہر نکلی، تو مَیں بھی جلد ہی باہر آ گیا۔ کچھ اندھیرا سا تھا، میرے پاس ٹارچ تھی۔ اس کی روشنی میں کئی اُلٹی چپلوں کو سیدھا کیا، لیکن میری چپل نہ دکھلائی دی، سوچا کہ شائد کسی نے ہٹا کر اِدھر اُدھر رکھ دی ہوگی۔ چاروں طرف کافی دیر تک ڈھونڈا، لیکن پتہ نہ چلا۔ دھیرے دھیرے سب لوگ چلے گئے، مَیں اسی اُمید سے کھڑا رہا کہ شائد کسی طرف چپل پڑی ہو گی۔ بعد میں بھی دیکھنے کو کھڑا رہا کہ میری چپل شائد کوئی غلطی سے پہن گیا ہوگا اور اپنی چپل چھوڑ گیا ہوگا۔ لیکن وہاں تو کوئی ٹوٹی چپل بھی نہ بچی۔

چپل کی طرح چھتری بھی کچھ کم نہیں کھوئی ہیں۔ ایک بار چھتری پہ نام بھی لکھوایا۔ لیکن وہ بھی نہ بچی۔ نہ جانے لوگ کس صفائی سے اس طرح کی چیزوں کو غائب کرتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ لاپتہ ہو جاتی ہیں۔ جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو سائیکلیں بھی غائب ہوتی تھیں۔ تعلیم کا یہ کتنا اچھا نتیجہ ہے!

یہ باتیں ہیں تو چھوٹی، لیکن مَیں تو سماج کو انہی چھوٹی چیزوں سے ناپتا ہوں۔

آخر چھوٹی چھوٹی چیزوں ہی سے ہماری زندگی بنتی ہے۔ اگر ہم اِن باتوں کی طرف سے لاپرواہ رہیں، تو بڑی بڑی باتوں میں بھی ہمارا کمینہ پن ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

چور سے بچّو

ایک دِن مَیں نے اپنے پانچ سالہ پوتے گوتم سے کہا—"اخبار میں ڈیرہ دُون میں کچھ چوروں کے پکڑے جانے کی خبر نکلی ہے۔ جنہوں نے گورکھپور، شاہ جہان پور لکھنؤ وغیرہ کئی جگہ چوریاں کی تھیں۔"

"باباجی! یہ چور ڈیرہ دُون کیسے پہنچ گئے"؟

"ریل سے"۔

"ریل میں کسی نے اِنہیں پہچانا نہیں"؟

"پہچانے گا کون؟ چور کے سینگ نہیں ہوتے۔ جیسے ہم تم آدمی۔ ویسے چور آدمی"۔

"چور کے کان کاٹ دیئے جائیں کہ سب اُنہیں پہچان سکیں"۔

گوتم نے اپنی سمجھ سے تو بات بالکل ٹھیک کہی تھی۔ پچھلے دِنوں ہمارے یہاں ایک چوری ہوئی۔ چور سو پچاس روپے کی چیزیں لے گئے۔ اُن چیزوں میں گوتم کا ایک دو روپے قیمت کا سکولی جھولا بھی تھا۔ چور اُس میں رکھی ہوئی کتابیں نکال کر باہر پھینک گئے تھے۔ گوتم کے نوکر نارائن غریب کے کپڑے، جوتے اور پرانی سائیکل لے گئے۔ گوتم نے ابھی تک اِتنے نزدیک سے کسی چوری کو نہیں سُنا تھا۔ اُسے یہ بہت بُرا لگا کہ آخر چوروں کی یہ کیا حرکت کہ اس طرح بغیر بتائے کسی کے کپڑے، جوتے، سائیکل، جھولا اُٹھا لے جائیں! اُس کے چھوٹے سے دماغ نے اِس کا علاج ڈھونڈ ہی نکالا، کہ بغیر پوچھے یوں رات کو کسی کی چیز لے جانے والے کے کان کاٹ دیئے جائیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ کان کٹ جانے پر ہر آدمی چوروں کو پہچان لے گا۔ اور پھر وہ چوری نہ کر سکیں گے۔

لیکن میرے دل میں رہ رہ کر ایک سوال اُٹھتا ہے ـــــ ہم چور کہیں کیسے ؟ جو رات کو چُپ چاپ چوری کرے جاتا ہے اُسے، یا جو دن میں چُراتا ہے اُسے بھی ؟ کہا جاتا ہے کہ غربت کی مار سے تنگ آ کر ہی آدمی چوری کرتا ہے ۔ مگر آج تو اچھے اچھے سفید پوش بھی چوری کرتے نظر آتے ہیں ۔ اب بتایئے کون ساہوکار کا بچہ ایسا بچلے گا جس کے کان نہ کاٹ دیئے جائیں ؟ ہم سب اِنسان کہلانے والے اپنے اپنے کانوں پر یا چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں !

(انند وردھن)

اِنصاف سے کہیئے

ایک بار کسی علاقے میں قحط جیسے آثار نظر آ رہے تھے ۔ جیسا کہ قحط کے وقت ہمیشہ ہوتا ہے ، بیچارے غریبوں کی حالت بگڑنے لگی ۔ اُن کے بچوں کی پرورش کا سوال سب سے ضروری تھا ۔ گاؤں کا زمیندار شریف اور ہوشیار تھا ۔ اُس نے سوچا ۔ اگر سب امیر اور متوسط طبقہ کے گرہستی مل کر ایک ایک گلاس بھی دودھ روزانہ دے دیں تو گاؤں کے سب غریب بچوں کی پرورش بخوبی ہو سکے گی ۔ اُس نے پنچایت کر کے اپنی سکیم پیش کر دی ۔ جسے سب نے منظور کیا ۔ طے پایا کہ زمیندار کے ایک بڑے پیتل کے برتن میں لوگ روز تڑکے ایک ایک گلاس ڈال دیا کریں ، اور وہ دودھ گاؤں کے بچوں کو دن نکلتے ہی تقسیم کر دیا جائے ۔

اُس دن رات کو سوتے وقت سب نے سوچا ـــــ "اگر میں دودھ کے بجائے ایک گلاس پانی ہی زمیندار کے برتن میں ڈال دوں تو کیا پتہ چلنے والا ہے ؟" ایسا ہی ہوا ۔ دوسرے دن صبح جب زمیندار صاحب دودھ بانٹنے کی تیاری کرنے لگے اور انہوں نے ایک گلاس سے دودھ نکالا تو اُس میں پانی دیکھ کر بہت حیران ہوئے ۔ برتن میں دودھ کی جگہ پانی ہی بھرا تھا ۔ خوب ! سب کا دماغ ایک ہی طرف چلا ، اور بس دودھ کا پانی بن گیا ۔

سچ پوچھئے تو ہم چیونٹیوں اور جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیا آپ نے غور کیا ہے کہ چائے پیتے وقت جب آپ کی ٹیبل پر کبھی تھوڑی کھانڈ گر جاتی ہے تب شروع میں ایک دو چیونٹیاں ہی دکھائی دیتی ہیں، مگر تھوڑی ہی دیر بعد اُن کا ایک اچھا مجمع دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایک چیونٹی کو کھانے کی کوئی چیز ملے تو وہ فوراً دُوسری چیونٹیوں کو بلا بھیجتی ہے۔ پرندوں میں بھی ایک دُوسرے کی ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے چڑیوں میں تو یہ ایک قاعدہ ہے کہ سب جمع ہونے پر پہلے بچے کھاتے ہیں، پھر بڈھے اور پھر جوان۔ بوڑھے جب کھا چکتے ہیں تو مجمع کے اردگرد بیٹھ کر پہرہ دیتے ہیں اور کوئی بھی خطرہ دیکھ کر فوراً سب کو چوکنا کر دیتے ہیں۔ جنگل میں جب کسی گائے پر کوئی خونخوار جانور حملہ کرتا ہے تب باقی سب اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑی نہیں ہوتیں بلکہ اُس جنگلی جانور کو سب مل کر گھیر لیتی ہیں اور اُس پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

انسان اشرف المخلوقات یعنی دُنیا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ اُسے اپنی تہذیب پر ناز ہے۔ لیکن ذرا انصاف سے کہیئے، خود غرضی میں ڈوبا ہوا یہ انسان تہذیب یافتہ ہے یا وہ چیونٹیاں، پرندے اور جنگلی جانور؟

حیوان ہی اچھے

الہ آباد شہر میں کشن چندر داس کے یہاں گاڑی کا ایک گھوڑا تھا، جو انہیں بہت ہی پیارا تھا۔ روز دفتر سے واپس آکر وہ اس گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے ایک پاؤ جلیبی کھلاتے تھے، اور تھوڑی دیر کھڑے ہو کر پیار سے اُس کی پیشانی اور گردن پر تھپکیاں دیتے تھے۔ گھوڑا اُن کے اس پیار کو سمجھتا اور انہیں دل سے چاہتا تھا۔ لیکن اپنے دلی جذبہ کے اظہار کے لئے اُس کی زبان بند تھی، اس لئے جتنی دیر کشن بابو اُس کے پاس کھڑے رہتے، وہ ناک پھڑ پھڑا کر اُن کی طرف عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ جس دن کشن بابو کا انتقال ہوا۔ گھر کے لوگ رونے چلانے

لگے، تو دیکھا کہ گھوڑا بھی اصطبل میں کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی روز تک اپنے پیارے مالک کو یاد کرکے آنسو بہاتا رہا۔ کشن بابو کے چھوٹے بھائی نے گھوڑے کو ایک صاحب کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ صاحب اُسے اپنے آفس کی گاڑی میں جوتتے تھے، لیکن گھوڑا بار بار چابک کی چوٹ کھانے کی کچھ بھی پرواہ نہ کر کشن بابو جس دفتر میں کام کرتے تھے صاحب کو وہاں لے جاکر حاضر کرتا اور ہنہنانے لگتا تھا۔ اُس نے کسی طرح صاحب کی راس نہیں مانی۔ آخر اپنے پُرانے مالک کی جُدائی کے غم میں اُس نے دانہ پانی بالکل چھوڑ دیا اور کئی دِنوں کی فاقہ کشی کے بعد دم توڑ دیا ؟

(۲)

بیرسٹر چندر شیکھر سین آب ہوا بدلنے کے لئے منگیر گئے۔ میکاڈو نام کا ایک جاپانی کُتا اُن کے ساتھ تھا۔ میکاڈو دیکھنے میں جیسا خوبصورت تھا، اُس کا مزاج بھی ویسا ہی اچھا تھا ؟

ایک دِن سب نے دیکھا، میکاڈو کو کھانے کے لئے جو کچھ دِیا گیا تھا، اُس میں سے کچھ حِصّہ وہ مُنہ میں لے کر کئی بار تھوڑا تھوڑا کرکے کہیں رکھ آیا۔ باقی کا حِصّہ وُہ آپ کھانے لگا۔ دُوسرے دِن بھی اُسے ایسا کرتے دیکھا گیا۔ پتہ لگانے پر معلوم ہؤا۔ کہ پاس ہی ایک دیسی کُتّا ٹانگ ٹوٹ جانے کے باعث لنگڑا ہوکر پڑا ہے۔ خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے کی طاقت اُس میں نہ تھی۔ میکاڈو اس لنگڑے کُتّے پر ترس کھاکر روزمرّہ اپنی خوراک میں سے کچھ حِصّہ لے جاکر اُسے دے آتا تھا۔ اس طرح خود آدھے پیٹ کھاکر ہی خوش رہتا تھا۔ دس بارہ دِن بعد جب وُہ دیسی کُتا ٹانگ جُڑ جانے پر کہیں چلا گیا، میکاڈو نے بھی اُسے روٹی پہنچانے سے چُھٹی پائی ؟

(۳)

ولائیت کے مشہور سیاست دان سر گورا ڈوسلی جب جہاز پر سوار ہوکر فارس گئے تھے۔ اُس جہاز کے کپتان کا ایک بندر تھا، جس کا نام پُوسا تھا۔ وہ بندر اپنے

دانائی اور خوش فہمی کی بدولت سب کا پیارا ہو گیا تھا۔ لیکن اپنی پیدائشی خصلت کا ثبوت بھی وہ وقتاً فوقتاً دیا کرتا تھا۔ ایک دن اُسے ایک بکری کا دُودھ پینے کی خواہش ہوئی۔ لیکن دُودھ دوہنے کے لئے اُسے کوئی برتن نہ مِلا۔ تب وہ ایک ملاح کی ٹوپی چُرا کر لے آیا اور اُسی میں دُودھ دوہنے لگا۔ اُسے یہ جُرم کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ اور کپتان کے سامنے پیش کیا گیا۔ کپتان نے اِس جُرم کی سزا یہ دی کہ سات دن کے لئے سب کے ساتھ اُس کی بول چال بند کر دی۔ سوشل بائیکاٹ کی یہ سزا بندر کے لئے بہت سخت ثابت ہوئی ؂

سب نے بندر کے ساتھ بولنا چھوڑ دیا۔ کوئی اُس کی طرف گھوم کر دیکھتا تک نہ تھا۔ یہ دیکھ کر وہ اُن ملاحوں کے پاس گیا اور کئی طرح سے اظہار محبت کرنے لگا۔ لیکن اُس سے کوئی خوشگوار نتیجہ نکلتا نہ دیکھ کر وہ اپنے کو بہت بے عزت اور ذلیل سمجھنے لگا۔ اس سوشل بائیکاٹ اور بے عزتی کو وہ بمشکل تین روز برداشت کر سکا۔ چوتھے روز اُس کی خودداری نے سمندر میں کُود کر جان دے دینے پر اُسے مجبور کر دیا ؂

(۴)

الجیریا میں میڈم نیپئر کے پاس ایک بڑا کتا ہے۔ وہ روزانہ سویرے ڈبل روٹی والے کی دُکان سے ایک جھولی میں روٹی لایا کرتا تھا۔ دُکاندار جھولی میں روز ۱۲ روٹیاں ڈال کر کُتّے کے مالک کے پاس بھیج دیا کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ۱۲ کی جگہ ۱۱ روٹیاں لانے لگا۔ روز بہ روز ایسا ہونے سے کُتّے کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھی جانے لگی۔ دیکھا گیا کہ روٹی والے کی دُکان سے لوٹتے وقت کتا راستے میں ایک جگہ ٹھہرتا ہے۔ اور جھولی سے ایک روٹی نکال کر بھوکی بیمار کُتیا کو دے آتا ہے۔ بچاری کُتیا اپنے اس مہربان کے گزرنے والے راستہ کی بغل میں چھُپ کر ایک طرف پڑی رہتی تھی۔ روٹی والے کو اب جھولی میں ۱۳ روٹیاں رکھ کر بھیجنے کے لئے کہہ دیا گیا۔ اُس دن سے بارہ (۱۲) روٹیاں گھر پہنچنے لگیں۔ چند دن بعد دیکھا گیا، کہ کُتّا

روز ۱۳ روٹیاں لاتا ہے۔ تب پھر پتہ لگانے پر معلوم ہُوا کہ وہ بیمار کُتیا چلنے پھرنے لائق ہو گئی ہے، اَب اُسے اُس کی اِمداد کی ضرورت نہیں رہی ؎

(۵)

ابھی پچھلے جاڑوں کا واقعہ ہے۔ میری کُتیا نے بچّے دِیئے۔ اُنہی دِنوں ایک مُرغی کے بھی بچّے نکلوائے گئے۔ گھر کے بچّوں کو بڑا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ ہر وقت اِن سے کھیلتے اَور خوش ہوتے۔ کھانا کھاتے وقت جب تک کُتیا اَور مُرغی مع بچّوں کے اَپنے پاس بُلا کر کھڑا نہ کر لیتے، ان کو کھانے میں مزہ نہ آتا ؎

ایک دِن کا ذِکر ہے، اسکول سے آکر بچّے کھانا کھا رہے تھے۔ حسبِ معمول مُرغی اَور کُتیا بھی اَپنے بچّوں کو ساتھ لِئے کھڑی تھیں، مُرغی کے بچّوں کو روٹی کے باریک ریزے اَور خشکہ تھوڑا تھوڑا کر کے بار بار ڈال دِیا جاتا تھا۔ جُونہی کوئی چیز پڑتی، مُرغی کُٹ کُٹ کر کے سب بچّوں کو جمع کر لیتی، اَور ذرا دیر میں ایک ایک ریزہ چُن کر زمین صاف کر دیتے۔ مُرغی اَپنے آپ بالکل نہ کھاتی۔ البتہ کبھی کبھی کوئی دانہ چونچ سے اُٹھا کر بچّوں کے آگے رکھتی اَور کُٹ کُٹ کر کے انہیں کھلا دیتی ؎

دُوسری طرف کُتیا اَپنے بچّوں کو لئے کھڑی تھی۔ اِس طرف بھی کبھی کبھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے جاتے تھے، لیکن کُتیا ان میں سے کوئی چیز نہ کھاتی، اَور سب بچّے کھا جاتے۔ البتہ وہ بڑی مستعدی کے ساتھ کھڑی حفاظت کرتی رہی۔ اَور اگر کبھی کسی مُرغے کے بچّے نے اِس کے بچّوں کے کھانے میں شرکت کی، تو فوراً اِس نے بھوں بھوں کر کے اُسے بھگا دِیا ؎

میری ملازمہ جو بالکل ناخواندہ ہے، برابر بیٹھی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ آخر کار بولی۔ کہ "بابُو جی! اِن جانوروں کی ماتا تو دیکھیئے، ہم اگر اَپنے بچّوں کو محبت سے پالتے اَور خود دُکھ اُٹھا کر اُنہیں سُکھ پہنچاتے ہیں تو اِس اُمید پر کہ یہ جوان ہو کر ہماری خدمت کریں گے، ہم بڑھاپے میں آرام سے بیٹھ کر اِن کی کمائی کھائیں گے۔ مگر اِن بے زبانوں کو کونسی کمائی کھانی ہے، جو ماتا کی ماریاں ایک ریزہ تک نہیں

کھاتیں، اور سب بچّوں کو کھلا دیتی ہیں - میں بڑی دیر سے بیٹھی ان کا تماشہ دیکھ دیکھ کر یہی سوچ رہی ہوں" ؎

مَیں نے کہا - "ان کی محبت بے غرض ہوتی ہے جو خُدا نے ہر ماں کے دِل میں پیدا کی ہے، خواہ اِنسان ہو یا حیوان - مگر افسوس کہ اِنسان اِس میں بھی لالچ، اور خود غرضی سے کام لیتا ہے، اور ماں باپ لڑکوں کو اِسی اُمید پر زیادہ لاڈ پیار سے پالتے ہیں کہ ان کی کمائی کھائیں گے - اور لڑکیاں پَرایا دھن سمجھی جاتی ہیں، اِس لیئے ان کی ناقدری ہوتی ہے - حالانکہ ماں کے دِل میں کبھی اِس کا خیال بھی نہ آنا چاہیئے ؎

کیا ہی اچھا ہو، اگر حیوانوں کے ان سو فیصدی سچے واقعات سے ہم اِنسان کچھ سبق سیکھیں ؎

علم و عمل

تین گورو





گاندھی جی پنچگنی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے مجھے ملاقات کے لئے بلایا۔ اس وقت اُن کے لئے بھوجن کی تیاری ہو رہی تھی۔ مجھے تنہائی ملے۔ اِس لئے انہوں نے شری پیارے لال اور راجہ جی کو بھوجن کرنے کے لئے بھیجا۔ اور روز بھوجن کرانے والی دُرگا بہن کو بھی باہر بھیج دیا۔ اِس لئے ہماری بات چیت کے وقت گاندھی جی کو بھوجن کرانے کا موقعہ مجھے نصیب ہوا۔ اُس وقت اُن کی میز پر رکھی ہوئی ایک چیز نے میری توجہ مبذول کی —— وہ تھا صرف کانچ کا ایک کھلونا۔ میں نے اُسے پہلے دیکھا بھی تھا۔ دوسری جگہ اُس نے شاید کبھی بھی توجہ کھینچی نہ ہوتی۔ وہ کھلونا تین بندروں کا تھا۔ تینوں بندر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے تھے۔ پہلے بندر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ لیا تھا، دوسرے نے دونوں ہاتھوں سے

دونوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تیسرے نے اپنے دونوں کان دبا رکھے تھے۔ گاندھی جی اپنا کھانا قریب قریب ختم کر چکے تھے۔ اور ہماری ملاقات کا وقت بھی تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ میں ان بندروں کو اس طرح رکھے جانے کا سبب گاندھی جی سے پوچھنے سے اپنے کو نہیں روک سکا۔ میرا دل پوچھنے کو للچا اٹھا، پوچھا——



"باپو! یہ کھلونا یہاں میز پر کیوں رکھا ہے"؟

انہوں نے کچھ دیر ٹھہر کر سنجیدگی سے جواب دیا —— یہ تینوں میرے گورو ہیں!

میں گاندھی جی کے منہ سے بڑے سے بڑا عجوبہ سن لینے کا عادی تھا۔ اس لئے ایک دم نہیں چونکا۔ لیکن کھلونے کے بارے ان کا نظریہ جاننے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔ میرے چہرے کے آثار کو صاف صاف دیکھ کر انہوں نے کہا——

"ٹھیک تو یاد نہیں ہے، لیکن شاید کئی سال پہلے یہ چیز ایک چینی نے سیوا گرام میں مہادیو (دیسائی) کو دی تھی اور مہادیو کے پاس سے یہ میرے پاس آئی۔ یہ معمولی سا کھلونا بھی ایک بہت بڑی بات کہتا ہے، جو روزانہ زندگی کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے"۔

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ وہ بولے —— پہلا بندر ہاتھوں سے آنکھیں بند رکھ کر ہمیں سکھا رہا ہے کہ ہم کوئی بری چیز دیکھنے کو آنکھیں نہ کھولیں —— اتنا کہتے

کہتے گاندھی جی ذرا رُکے اور پھر دھیرے سے کہنے لگے ——— "مَیں جب گھومنے جاتا ہُوں، میرے ہاتھ کِسی کے کندھے پر رہتے ہیں۔ اُس آدمی سے مَیں کہہ دیتا ہُوں کہ بھائی میری آنکھیں بند ہیں، تم مُجھے سنبھال کر لے جاتا"۔ اس سے مُجھے شانتی اور طاقت مِلتی ہے ؛

دُوسرا بندر جس نے اَپنے ہاتھ سے اَپنا منہ بند کر رکھا ہے، وہ ہمیں نصیحت کر رہا ہے کہ ہم کِسی کی بُرائی کے لئے مُنہ نہ کھولیں۔ کبھی جُھوٹ نہ بولیں ؛

"اور تیسرا بندر ہمیں سِکھاتا ہے" ——— اُنہوں نے اُسی شانتی اور سنجیدگی سے کہا ——— "کہ ہم کِسی کی بُرائی یا نِندا نہ سُنیں۔ کِتنا بڑا اُپدیش ہے یہ! کان کا ناجائز اِستعمال آدمی کے دِل کا چین چھین لیتا ہے۔ ہم سب کو زندگی میں ایک بار تو اَیسا محسُوس ہوتا ہی ہے!"

گاندھی جی کھانا کھا چُکے تھے، مَیں نے اُن کے ہاتھ دُھلائے۔ ہاتھ پُونچھنے پونچھتے اُنہوں نے کہا ——— "اِس کھِلونے کو مَیں آرٹ کی چیز کہتا ہُوں۔ جو آرٹ اِنسان کو اُونچا نہیں اُٹھا سکتا، جو آرٹ اِنسانیّت کی بھلائی نہیں کر سکتا۔ اُسے "آرٹ" نہیں کہا جا سکتا۔ آرٹ تو دِل کو پاکیزہ کر کے آتما کو چمکاتا ہے۔ مَیں سوچ سمجھ کر اِن بندروں کو اَپنا "گورو" کہتا ہُوں۔ اور جہاں جاتا ہُوں اِنہیں ساتھ لے جاتا ہُوں۔ مجھے ہر گھڑی یہ اپنی بات کہتے رہتے ہیں" ؛ (کرشن سنگھ چاوڑہ)

سَو سال جینے کیلئے

ایک دِن گاندھی جی کے آشرم میں جا پہنچا۔ گرمی کے دِن اور دوپہر کا وقت۔ بات چیت کے بعد بولے ——— "تُم یہاں بھوجن کر سکتے ہو"؟ مَیں نے منظور کر لیا۔ پرارتھنا کرنے کے بعد خُود باپُو جی ہی بھوجن پروسنے لگے۔ گیہوں کی روٹیاں اور ساگ۔ پروسنے کے بعد وہ بولے۔ "میٹھا کُچھ بھی نہیں ہے، کیا یہ سب بھائے گا؟ یہاں تو ہمیشہ ہی پھیکاپن

رہتا ہے۔ جواب میں میں صرف مُسکرا دیا ؛

سب نے بھوجن کر لیا۔ اُس دِن ایکادشی تھی۔ اِس لئے گاندھی جی ناریل کا دُودھ اور کھجور وغیرہ لے کر بیٹھے۔ اتنے میں ایک احمد آبادی سجن اُن سے مِلنے آئے۔ گاندھی جی نے اُنہیں بیٹھنے کو کہا۔ گاندھی جی کا بھوجن پانچ دس منٹ میں ختم ہونے والا نہ تھا۔ وہ سجن اِنتظار میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے اور بہت جلدی سے بولے ـــــ "آپ کو تو بہت وقت لگ گیا!" گاندھی جی ہنس کر بولے ـــــ "ابھی ایک گھنٹہ کہاں ہُوا ہے؟" وہ سجن بولے ـــــ "صرف پھل اور کھجور کھانے میں ایک گھنٹہ لگانا تو تعجب کی بات ہے!" تب گاندھی جی نے جواب دِیا ـــــ "اِس میں تعجب کیسا؟ مجھے تُم جیسا کم عُمر تھوڑے ہی بننا ہے!" وہ ہنس کر بولے ـــــ "تو کیا آپ اِتنے دھیرے کھانے سے لمبی عُمر پائیں گے؟" باپو جی بولے ـــــ "ضرور، مجھے تو پُورے سَو سال جینا ہے اور اُس کا طریقہ یہی ہے!" (سُکھ لال)

دیش کی خِدمت



بات بہت پُرانی ہے ؛

مہاتما گاندھی افریقہ سے ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ ہندوستان کے پولٹیکل آسمان پر چھائی ہُوئی تارِیکی پھٹنے لگی تھی، اور گاندھی جی نے سوئے ہُوئے لوگوں کو جگانا شرُوع کر دیا تھا۔ اُنہوں نے سابرمتی آشرم کی بُنیاد ڈالی۔ اِس آشرم میں ذات پات، رنگ و نسل، اعلیٰ و ادنےٰ کا کوئی سوال نہ تھا۔ اِس میں سبھی لوگ برابر تھے۔ اپنی طاقت کے مطابق کام کرتے تھے۔ حاکم و محکوم کے درمیان جو دیوار ہوتی ہے، ایسی دیوار اِس آشرم میں نہیں تھی۔ اس آشرم

میں وُہی لوگ رہتے تھے۔ جن کے دل میں وطن کا پریم ہوتا تھا، اور جو اپنی غلام قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے ؛

صبح کا وقت تھا۔ گاندھی جی بیٹھے ہُوئے رات کے کھانے کے لئے گیہوں صاف کر رہے تھے ۔ اس کام میں اور بھی دو چار لوگ لگے ہُوئے تھے ۔ اُسی وقت ایک گریجویٹ بابو سُوٹ بوٹ پہنے گاندھی جی کے پاس آئے ۔ گاندھی جی نے اِن کو نہایت پریم سے بٹھایا۔ گریجویٹ بابُو نے گاندھی جی سے کہا :۔

"مہاتما جی ! میرے دِل میں دیش کا پریم ہے، مَیں مُلک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو دیجئے، مَیں کروں گا" ؛

"کیوں نہیں۔ میرے پاس کاموں کی کیا کمی ہے ؟ کمی تو کام کرنے والوں کی ہے۔ آپ کے خیالات بڑے سُندر ہیں ۔ پر جو کام مَیں خُود کرتا ہُوں، وُہی کام آپ کو کرنا پڑے گا"۔ گاندھی جی نے کہا ؛

"آپ حکم دیجئے ۔ مَیں کرنے کو تیار ہُوں" ؛

"تو ذرا گیہوں صاف کرنے میں ہماری مدد کیجئے ۔ ابھی اِس کام کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر گیہوں صاف نہ ہُوئی تو آشرم کے تمام لوگ بھُوکے رہ جائیں گے" ؛

گاندھی جی کی باتیں سُن کر گریجویٹ بابُو سٹپٹائے ۔ اُنہوں نے سوچا ہوگا، کہ کوئی مضمون یا تقریر لکھنے کا کام ملے گا۔ اور بابُو جی اِسی مقصد کے لئے آئے بھی تھے ؛

مجبُوراً گریجویٹ بابُو گیہوں صاف کرنے لگے ۔ گاندھی جی چہرے کو دیکھ کر ساری باتیں سمجھ گئے، لیکن خاموش رہے ۔ گیہوں صاف کرتے کرتے بہت دیر ہوگئی ۔ گریجویٹ بابُو گھبرا گئے ۔ بولے :۔

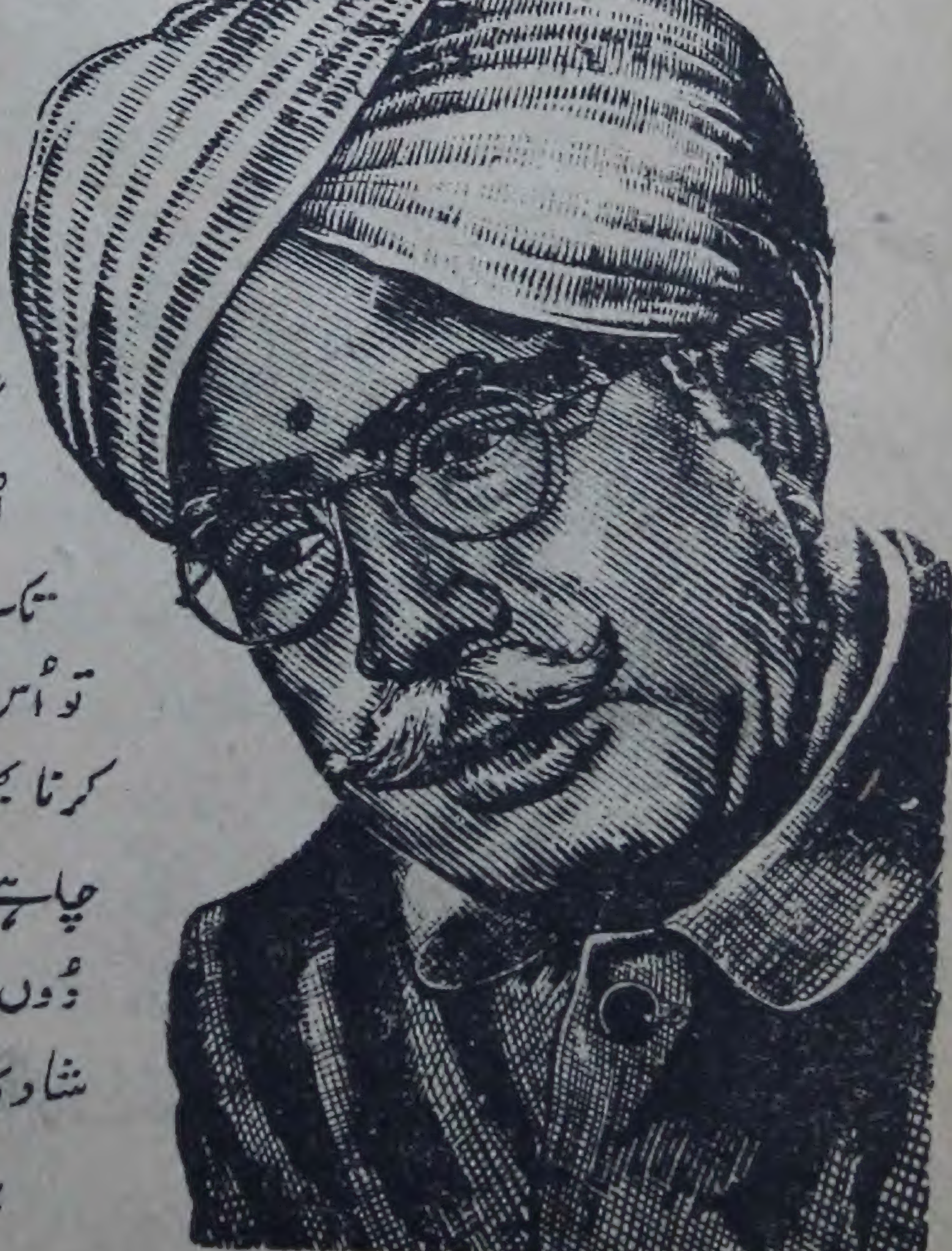
"اب اِجازت دیجئے" ؛

گاندھی جی تو یہ سُننا چاہتے تھے ۔ اُنہوں نے گریجویٹ بابُو کو اِجازت دیتے ہُوئے کہا ۔۔۔ "دیش کے لئے بہت سے لوگ دیش کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، لیکن سب اِسے نبھا نہیں سکتے ۔ صرف مضمون لکھنے اور تقریر اخباروں میں چھپوانے ہی سے دیش کی خدمت

نہیں ہوتی۔ جس کے دِل میں دیش کی محبت ہوگی، وہ تو ہر کام کو کرنے کے لئے تیار رہے گا۔ ہمارے دیش کے طالب علم صرف لکھنے پڑھنے ہی کو کام تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے"۔

شادی کی پہلی شرط

مجھے اپنی لڑکی کے لئے لڑکے کی ضرورت تھی۔ ایک جگہ سُنا، کہ لڑکا خالی ہے۔ مَیں وہاں گیا۔ ایک صاحب جنہوں نے یہ بات بتائی تھی، وہ بھی ساتھ تھے۔ لڑکا بی اے میں پڑھتا ہے۔ اس کا باپ سرکاری نوکر ہے۔ جب مَیں اُن سے مِلا۔ تو اُن کے والد بزرگوار نے ایسا برتاؤ کیا۔ جیسے مَیں اُن کے پاس قرض مانگنے گیا تھا۔ میرے آنے کی غرض جاننے پر بولے۔ "ابھی تو لڑکا پڑھتا ہے۔ جب تک لڑکا پڑھتا رہے گا، اُس کی شادی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا"۔ مَیں نے پوچھا۔ "آخر کب تک پڑھتا رہے گا؟" بولے — "یہ تو اُس کی مرضی کی بات ہے، اور شادی کرنا بھی اُس کی مرضی پر ہے۔ اگر وہ چاہے تو مَیں اُس کی آج ہی شادی کر دوں۔ لیکن اُس کی بھی خواہش ابھی شادی کرنے کی نہیں ہے"۔



یہ سُن کر مَیں نے اپنے ساتھی کی طرف

دیکھا۔ جو اس بات کے درمیانی تھے۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر لڑکے کے والد سے بولے "خیر رشتہ پکا کر لینے میں کیا حرج ہے۔ شادی چاہے جب کیجئے گا"۔

یہ سُن کر اُنہوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "ہاں حرج تو کوئی نہیں ہے۔ لڑکی پڑھتی ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "مڈل پاس کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا"۔ اس پر آپ فرماتے کیا ہیں۔ "آپ نے پڑھنا کیوں چھڑوا دیا؟"

میں نے کہا۔ "ضرورت کے لئے اتنا کافی پڑھ چکی، اس لئے چھڑوا دیا۔ کچھ گھر کا کام دھندا تو سیکھے۔ وہ بولے۔ "یہ آپ نے غلطی کی۔ گھر کا کام دھندا سیکھنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ کم سے کم انٹرینس پاس کروا دیتے۔ گانا جانتی ہے؟ ستار، ہارمونیم بجا لیتی ہے؟"

یہ سُن کر مجھے بہت غصّہ آیا۔ لیکن خون پی کر اُن سے کہا۔ "گانا بجانا تو نہیں جانتی"۔

سر ہلاتے ہوئے منہ سکوڑ کر بولے "تب تو رشتہ ہونا مشکل ہے۔ رگھوبیر (اُن کے بیٹے کا نام) ایسی لڑکی سے ہرگز شادی نہ کرے گا۔ گانے بجانے اور ڈانس میں طاق ہونا تو لڑکی کے لئے نہائیت ضروری ہے"۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ سوچا، یہ تو رشتہ ہوتا نہیں، اس لئے کہنے سے کیوں چوکوں۔ میں نے کہا۔ "ہاں صاحب! آج کل کے نوجوانوں کو پڑھنے لکھنے کے بعد بھی بیکاری کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ پڑھی لکھی، خوبصورت، نیز گانے بجانے اور ناچنے کے فن میں طاق بیویاں تلاش کرتے ہیں تاکہ اگر اُن کی کہیں نوکری نہ لگے تو بیوی کو کسی فلم کمپنی میں بھرتی کرا کے پیٹ بھر سکیں۔ خیال تو بُرا نہیں ہے۔ کیونکہ پڑھے لکھے مرد چاہے برسوں بیکار پھرتے رہیں، لیکن گانے ناچنے میں طاق، پڑھی لکھی خوبصورت عورت جب چاہے کار سے لگ سکتی ہے۔ پہلے زمانے میں مرد چاہتے تھے کہ خود کما کر عورتوں کی ضرورتیں پوری کریں"۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ اُن کا چہرہ اُتر گیا، لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولے۔ یہ تو

آپ بڑی سخت بات کہہ گئے ۔

مَیں بولا "سخت ملائیم مَیں نے کچھ نہیں کہا۔ مَیں تو زمانے کی روش کی بات کہتا ہُوں۔ لڑکا تو خیر لڑکا ہی ہے۔ لیکن مجھے آپ کی عقل پر افسوس آتا ہے، جو آپ تجربہ کار ہوتے ہُوئے ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ معاف کیجئے، آپ لوگ گھر کی رانی اور رفیقۂ حیات نہیں چاہتے، آپ کو گھر کی لکشمی کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو ضرورت ہے، ویشیا کی۔ جو وقت بے وقت پڑنے پر روٹیاں چلا سکے" ۔

اِتنا کہہ کر مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا، اور چلا آیا۔ بھلا بتایئے تو سہی، لڑکی کے باپ سے پُوچھتے ہیں، کہ لڑکی کو گانا، ناچنا سکھایا یا نہیں۔ اور کچھ نہ پُوچھا۔ یہ نہ پُوچھا کہ گرہستی کے کام کیا کیا جانتی ہے؟ کھانا بنانا آتا ہے یا نہیں؟ سینا پرونا آتا ہے؟ گرہستی کے کاموں کی نسبت نہ پُوچھا۔ گانا بجانا پہلے پُوچھا" ۔ (البشمبر ناتھ)

انگریزی کیوں نہیں پڑھائی؟



ابھی حال ہی میں مجھے اپنے ایک دوست کی لڑکی کے لئے لڑکا دیکھنے کے لئے دوست کے ساتھ جانا پڑا۔ لڑکے والے اچھی حیثیت کے ہیں ۔

لڑکے والوں

نے پہلا سوال جو کیا وہ تھا ––– "لڑکی کی تعلیم کہاں تک ہے" ؟

مَیں نے کہا ––– "ہندی مِڈل تک پڑھی ہے، کچھ سنسکرت بھی جانتی ہے"

لڑکے کے چاچا صاحب بولے ––– "ہندی مڈل بس! انگریزی نہیں پڑھائی؟"

"انگریزی بھی کچھ جانتی ہے۔ نام وام لکھ پڑھ لیتی ہے۔ معمولی تار اور چِٹھی سمجھ لیتی ہے!"

لڑکے کا باپ طنزاً مُسکرا کر بولا ––– "واقعی! تب تو آپ نے بہت انگریزی پڑھا دی"

مَیں بول پڑا ––– "کافی ہے۔ اگر آپ کو کبھی ضرورت پڑی، تو وہ کسی دفتر میں ایڈریس وغیرہ لکھنے کی نوکری کرے گی"۔ اب تو وہ چکرائے۔ مجھے غور سے دیکھ کر بولے ––– "اِس کا کیا مطلب؟"

مَیں بولا ––– انگریزی تعلیم کا اِستعمال یہی ہو سکتا ہے کہ کبھی ضرورت پڑے تو کہیں نوکری کر کے روٹی کما سکے"۔

اِس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ لڑکے کا چاچا خُوب پیٹ بھر ہنسنے کے بعد بولا ––– "تعلیم مہذب بننے کے لئے ہے، نہ کہ نوکری کرنے کے لئے"۔

یہ آپ نے خُوب بتا دیا! مجھے آج تک پتہ نہیں تھا کہ تعلیم مہذب بننے کے لئے دی جاتی ہے۔ مَیں تو ابھی تک یہ سمجھتا تھا کہ پڑھنا لکھنا صرف روٹی کمانے کیلئے ضروری ہے"۔

اگر آپ کا ایسا خیال تھا تو غلط تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ پڑھے لکھے ہو کر ایسے خیال رکھتے ہیں"۔

"اپنے رام پڑھے لکھے واجبی ہی ہیں۔ اِسی لئے اَیسے خیالات ہیں"۔

لڑکے کا چاچا بولا ––– "بات یہ ہے کہ لڑکا بی اے میں پڑھ رہا ہے۔ اُس کی یہ خواہش ہے کہ کسی انگریزی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ کرے۔ لڑکی زیادہ پڑھی نہ ہو۔ تو بھی کم سے کم اِنٹرنس، ایف اے تک تو ضروری پڑھی ہونی چاہیئے"۔

"بے شک! چاہیئے بھی یہی۔ لڑکا انگریزی پڑھا ہو، اور لڑکی ہندی، تو بڑی مُشکل ہوتی ہے۔ شوہر انگریزی بولتا ہے، بیوی ہندی بولتی ہے۔ نہ شوہر کی بات بیوی

سمجھتی ہے۔ نہ بیوی کی بات شوہر۔ ایسی حالت میں نبھنا مشکل ہو جاتا ہے"!

لڑکے کا باپ ہنسکر بولا ــــ "خیر! یہ تو آپ مذاق کرتے ہیں"۔

"اچھا! یہ مذاق ہے؟ میں نے تو سچ بات سمجھ کر کہا"۔

لڑکی کا باپ (میرا دوست) بول اُٹھا ــــ "ویسے لڑکی کھانا پکانا، سلائی اور گھر کے کام کاج میں ہوشیار ہے"۔

لڑکے کا چاچا بولا ــــ "کھانا تو ہمارا لڑکا بھی بہت عمدہ پکا لیتا ہے۔ بینگن کا بھرتا تو ایسا بناتا ہے کہ واہ!

ایسی حالت میں تو لڑکی کو کھانا پکانے کی تعلیم دینا بیکار ہو گیا۔ کچھ سلائی وغیرہ بھی جانتا ہے؟ تھوڑی بچوں کی پرورش کی بھی تعلیم دلا دیجئے، تو بس پھر سب جھگڑا ہی مٹ جائے"۔

"جھگڑا کیا مٹ جائے"؟

"یہی کہ لڑکی صرف انگریزی پڑھی ہو اور چاہے کچھ جانتی ہو یا نہ جانتی ہو۔ باقی باتیں تو سب آپ کا لڑکا جانتا ہی ہے۔ کھانا خود پکا لے گا، سلائی کا کام کر لے گا۔ بچوں کی پرورش کر لے گا۔ بیوی تو صرف گٹ مٹ کر نیکو رہ جائے گی۔ کبھی موقعہ پڑے تو کما کر کھلا بھی سکے گی۔ شوہر گھر کا کام کرے گا۔ بیوی کمائے گی"۔

اس کے بعد پھر اُنہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔ ہم لوگ بھی مایوس ہو کر چلے آئے۔ اس لئے راقم سطور کی یہ رائے ہو گئی ہے کہ لوگ ہندی پڑھی لکھی لڑکی کو چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہندی جانتی ہو، پڑھی لکھی ہی نہیں سمجھتے۔ گھر کے کام کاج میں ماہر ہونا کوئی تعلیم ہی نہیں۔ مادری زبان میں بھلے ہی لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو، مگر انگریزی میں ہوشیار ہو، تب ہی وہ تعلیم یافتہ ہے۔ بینگن کا بھرتا بنانا نہ جانتی ہو، تب بھی کوئی حرج نہیں۔ پھٹا کپڑا نہ سی سکے، تب بھی کوئی فکر نہیں۔ گھر کا انتظام نہ جانتی ہو، تب بھی پرواہ نہیں۔ بچوں کی پرورش کرنے کی تمیز نہ ہو، تب بھی کام چل جائے گا۔ لیکن اگر اچھی طرح انگریزی نہ پڑھ لکھ سکتی ہو، تو کسی بھی حالت میں کام نہیں چل سکتا۔

اُوپر کی آمدنی



ایک بار کچھ لوگ مجھے دیکھنے آئے۔ جب ۲۰ سے ۲۵ برس تک کے لڑکے اور ۱۶ سے ۲۰ برس تک کی لڑکی کو دیکھنے کوئی آئے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ تو ایسی ہی کچھ بات میرے ساتھ بھی تھی۔ دیکھنے والوں کے بارے میں جو کچھ دیکھا سنا تھا، اُس سے یہ یقین تو ہو چکا تھا کہ وہاں دال نہیں گلے گی۔ میں نے سوچا، جب وہ زبردستی میرا انٹرویو لے رہے ہیں تو کچھ فیس ہی کیوں نہ لی جائے۔

اُنہوں نے پوچھا —— "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"رات دن ایک ہی کام تو کرتا نہیں۔ آپ جس وقت کے کام کے لئے پوچھیں بتلا دوں؟"

"ہمارا مطلب ہے کچھ نوکری وغیرہ ..."

"جی کالج میں لیکچرار ہوں۔"

"اچھا اچھا، بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر یہ نوکری اتنی اچھی نہیں جتنی اور نوکریاں ہوتی ہیں۔ اس میں اُوپر کی آمدنی ....."

"آپ جانتے ہی ہیں" —— میں نے کہا۔ "جو کچھ بھی ملتا ہے سب اُوپر بھگوان سے ہی ملا ہوا سمجھتا ہوں۔"

وہ کھکھلا کر بولے —— "یہ تو ٹھیک ہے۔ اُس کا دیا ہوا تو سب کچھ ہے ہی۔ پھر بندھے پیسے بندھے ہی ہوتے ہیں۔ آج کل کے زمانہ میں بندھی آمدنی سے کیسے کام چل سکتا ہے۔ بُرا نہ ماننا، بندھے پیسوں کی صاحبی سے تو کچہری یا تحصیل کی چپڑاسی گیری

کہیں، اچھی ......"

"جی ہاں، مگر وہ کمائی بے ایمانی کی کہلاتی ہے"۔

"کیا؟ اچھا ہنستے"۔ وہ کچہری میں کام کرتے تھے"۔

بات چیت کا لطف اٹھایا گھر کے سب لوگوں نے۔ مگر ذمّہ داری ڈال دی گئی مجھ پر۔ ان کی چٹھیوں اور تار کے جواب میں لکھ دیا گیا —— "لڑکا راضی نہیں ہے"۔

●

وہ صاحب ہی اس قسم کے خیالات رکھتے ہوں، ایسا نہیں ہے۔ میں نے جب کالج میں نوکری کر لی، تو ایک بزرگ اور بہی خواہ نہایت مایوسی کے عالم میں سر ہلا کر پتا جی سے بولے —— "تیرے لڑکے نے تو اتنا پڑھ لکھ کر پانی میں بہا دیا۔ آج کل ماسٹری اور پروفیسری میں کیا رکھا ہے۔ پولیس، کچہری یا جنگلات میں رہتا تو ساری عمر موج کرتا۔ اور کچھ نہیں تو فلاں ریاست میں ہی کام کر لیتا۔ میں لگوا دیتا اسے وہاں۔ اُس جگہ تو چپڑاسی بن کر گیا۔ چار ہی برس میں حویلی بنوا لی، حویلی۔ مگر بھائی، زمانہ خراب ہے۔ آجکل کے چھوکرے کسی کی سنتے تھوڑے ہی ہیں۔ ارے، اور کچھ نہیں تو کھانے پینے کو تو کم سے کم خوب ملتا ہی، لال ہو کر چتا رہتا۔ مگر بھائی سب نارائن! آج کل بوڑھے کچھ کہیں، تو بس ایک جواب ہے —— سٹھیا گئے ہیں"۔

بوڑھے کی باتوں میں کچھ جان تو ہے۔ میرے ایک ہی جماعتی بہت پہلے پڑھنا چھوڑ کر ریلوے میں کلرک ہو گئے تھے۔ چند سال پہلے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک اٹھے۔

وہ بولا —— "ارے بھنڈاری! تمہیں کیا ہوا ہے، سوکھے کی بیماری تو نہیں لگ گئی"

میں نے کہا —— "کیوں بھئی! یہ شیطان کی قبر جیسا کیا پھول رہا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟"

"سب بھگوان کی کرپا ہے" —— جواب ملا۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ بھگوان کی خاص یار میرے حصے میں ہی کیوں آئی

کہا — "تیرا تو حلیہ ہی بدل گیا۔ کہیں دبی ہوئی دولت مِل گئی کیا ؟"

"دبی دولت نہیں ملی، مگر ایک بات تو ہے۔ اِس بار قسمت نے خُوب زور مارا۔ کُنبھ کے موقعہ پر پتھری کے اسٹیشن پر ٹکٹ بیچنے کی ڈیوٹی لگ گئی۔ مہینہ بھر رہا۔ یہ دیکھ لے کہ تنخواہ سے الگ آٹھ ہزار روپے کمائے"۔

میرا نچلا جبڑا نیچے لٹک کر کانپنے لگا — تعجب!

وہ کہتا ہی رہا — "بھگوان سے یہی منت مناتا ہُوں کہ ہر روز کنبھ میلہ ہوا کرے۔ مگر وہ بھی بارہ برس میں ایک بار آتا ہے، کوئی بات نہیں۔ اس بار تو ناتجربہ کار تھا، اگر کہیں اگلی بار ہردوار یا پریاگ کنبھ پر ڈیوٹی لگ گئی تو وارے نیارے کر دُوں گا"۔

"رشوت لیتے شرم نہیں آتی ؟" وہ تو جیسے آسمان سے گِرا — "لاکھوں مُسافر بچارے گھر سے دُور پردیس میں پڑے ہوتے ہیں۔ وہاں پڑے پڑے بھوک، پیاس، بیماری — سب طرح کا ڈر رہتا ہے۔ سرکار سیدھے سیدھے تو اُنہیں جلانے نہیں دیتی۔ ہم اُنہیں کئی دن کے اُن بچھڑے ہُوئے بیوی بچوں تک پہونچانے میں مدد کرتے ہیں۔ بھائی، بیوی، بچے جیسے اپنے، ویسے دُوسرے کے۔ ہاں، اس نیک کام میں تھوڑا بہت اپنے بال بچوں کا بھلا ہو جاتا ہے، تو کیا ہرج ہے ؟"

اُوپر کی آمدنی کھانے والے سب اپنی صفائی میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ ایک پولیس والا، جو ایک سائیکل پر دو آدمی بٹھانے یا رات کو بغیر بتی چلانے پر پکڑ کر چالان کرنے کے بدلے ایک یا دو روپیہ لے کر چھوڑ دیتا ہے، پوچھنے پر کہتا ہے — "جناب! اگر چالان ہو جائے تو پانچ سے پچیس روپے تک جُرمانہ ٹھک جائے گا۔ لیکن میری وجہ سے وہ دو ہی روپے میں بچ گئے اور اِدھر مجھ غریب کا بھی کچھ فائدہ ہو گیا۔ ہمیں تنخواہ ہی کیا ملتی ہے! پھر جناب، یہ تو ہمارا آپس کا سمجھوتہ ہے، آپ کو کیا اعتراض ہے ؟ آپ کیوں چیں چیں کرتے ہیں ؟"

پولیس کی جیب میں تو دو روپے پڑے۔ مُجرم دو ہی روپے میں چھوٹ گیا۔ مگر دو آدمیوں کے چڑھنے سے سائیکل بیلنس بگڑ گیا یا اندھیرے میں دکھائی نہ دینے کے باعث ٹکر مار کر کسی

بھلے آدمی کو ساری عمر کے لئے اپاہج کر دیا یا کپڑے ہی بگاڑ دیئے ——— اِسے کون بھگتے گا؟
مگر ان سوالوں کا جواب نہ آج تک کسی نے دیا ہے اور نہ دے گا۔

ریلوے کے چوہے

کل ہی تو میرا ایک ریلوے پارسل آیا۔ بھائی نے بمبئی سے کچھ میوہ مٹھائی بھیجی تھی۔ پارسل دیکھتے ہی کچھ ایسا معلوم ہُوا کہ راستے میں اُس پر شاید ہاتھ صاف کیا گیا ہے۔ کھول کر دیکھا تو کوئی گڑبڑ دِکھائی نہ دی۔ لیکن جب بھائی کے خط کے ساتھ سامان کی فہرست کا میلان کیا تو پتہ چلا کہ میوہ اور مٹھائی کی سب سے اعلےٰ قسمیں تو غائب ہی ہیں۔ بہت بُرا محسُوس ہُوا۔ غصہ بھی آیا لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔ پارسل کھول لینے کے بعد شکایت کرنا بالکل بے کار تھا۔

اور ویسے بھی ریلوے والوں کی کارستانیوں پر اعلےٰ افسر توجہ ہی کب دیتے ہیں۔



کچھ دن پیشتر مَیں نے اپنے چچا جی کو پھلوں کا ایک پارسل بھیجا تھا۔ اُس میں زیادہ تر تو سنگترے اور موسمیاں ہی تھیں۔ کچھ تازہ انجیر اور چیکو بھی رکھ دیئے تھے۔ بس ریلوے کے بابُوؤں نے اُن ہی کے اُوپر اپنے دانت چلا دیئے تھے اور سبھی عدہ کھا کر ہضم کر گئے۔

میرے ایک مذاقیہ دوست نے ریلوے کے ان بدتمیز اور بے شرم کارکنوں کا نام "ریلوے

کے چوہے" رکھا ہے۔ نام ہے دِل چسپ۔ لیکن یہ چوہے سچ مچ گنیش جی کی سواری بننے کے قابل ہیں۔ ڈیل ڈول تو پورا رہتا ہی ہے۔ چست اور چالاک بھی ہوتے ہیں۔ اچھی، ذائقہ دار قیمتی چیزوں پر ہی اپنی نظر ڈالتے ہیں۔ معمولی مال کو تو وہ کوڑی مول گنتے ہیں۔ اپنی دُنیا کے وہ مکمل بادشاہ ہیں اُن سے جواب طلب کرنے والا کوئی نہیں۔ کیونکہ اُوپر سے نیچے تک سبھی کھاؤ کھتے جو ہیں "چور چور موسیرے بھائی"۔

گھر سے میں نے کچھ پُرانی کتابیں اور کالج کے زمانہ کی نوٹ بُک منگائی تھیں۔ ایک بکس میں بھر کر پارسل کیا گیا۔ مضبوط تالا بھی لگا دِیا گیا تھا۔ ان چوہوں سے وہ تالا تو نہ ٹوٹا۔ لیکن صندوق کا کنڈا اُنھوں نے توڑ ہی ڈالا۔ اِتفاق سے بکس کے چاروں طرف رسّی بھی بندھی ہوئی تھی۔ اِس لئے کتابیں راستے میں گری نہیں۔ چوہوں نے بکس کو کھولا تو ہوگا، بڑی بڑی اُمیدوں سے۔ سوچا ہوگا کہ کچھ مال ہے۔ لیکن صرف کتابیں دیکھ بے چاروں کا دِل ٹھنڈا پڑ گیا ہوگا۔ ریلوے کے یہ چوہے تو بڑے ہوشیار اور چلتے پُرزے ہوتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سُونگھنے کی قوّت اِتنی تیز نہیں ہوتی۔ ورنہ شروع سے ہی اِس بکس کی طرف بھولی آنکھوں بھی نہ دیکھتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ریلوے کے یہ کارکن چوہے کیا، پُورے ہی غُنڈے ہوتے ہیں۔ پارسل کرانے جائیے تو اُن کی دکشنا چاہیئے ورنہ آپ کا پارسل کئی دِنوں تک بُک ہی نہ کیا جائے گا۔ یا بُک ہونے کے بعد بھی کچھ دِنوں تک پڑا رہے گا۔ پارسل چھڑانے والوں کو اِن چوہوں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو "پارسل ابھی نہیں آئی ہے"۔ اور پھر ہمیں ڈیمرج (جرمانہ) بھرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ لوگ کئی دِن پارسل پڑا رکھ کر اُسے سستے داموں اپنے یار دوستوں میں نیلام کر ڈالتے ہیں۔ اور شکایت کیجئے تو سُننے والا کون ہے؟ تین مہینے بعد تو آپ کی شکایت ملنے کا کارڈ آتا ہے۔ لکھا ہوتا ہے کہ آپ کی شکایت پر غور کیا جا رہا ہے۔ آپ فیصلہ کی راہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ پھر تقاضا کیجئے تو بھی اُس کا جواب کئی مہینوں بعد ملتا ہے۔ اور وہ جواب اِتنا ناکافی ہوتا ہے کہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قانوناً آپ ریلوے کے خلاف اپنا مقدمہ ۶ مہینہ کی میعاد کے اندر عدالت میں دائر کر سکتے ہیں۔ لیکن ریلوے کے ملازمین تو اِتنا وقت خط و کتابت میں ہی کھپا دیتے ہیں۔ وقت گذر جانے کے بعد آپ چاہیں

بھی تو دیوانی عدالت میں دعوے نہیں کر سکتے۔ اگر اُن پر مقدمہ چلایا بھی گیا تو اُن کی شیطانیوں کا ثبوت ملنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اِس حکمت میں تو وہ پکے ہوتے ہیں۔ کہیں گرفت میں نہ آ جائیں۔ اس کا پُورا پُورا انتظام وُہ پہلے ہی کر لیتے ہیں۔ اَور ریلوے کے قانون میں اُن کے نِکل بھاگنے کے لیئے گنجائش بھی کافی رکھ دی گئی ہے ؛

کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک سیٹھ جی کے یہاں شادی بیاہ کے مَوقع پر بہت بڑی دعوت ہُوئی۔ پتلیں بھر بھر کر مِٹھائی پروسی گئی۔ مہتروں کی خُوب بن آئی۔ ہیروں مٹھائی جُوٹھن میں ملی۔ ایک مہتر نے مِٹھائی کا پارسل بنا کر اپنے دُوسرے رِشتہ دار کے ہاں بھجوا دی۔ اُس کا رِشتہ دار جب پارسل چھڑوانے آیا تو ریلوے کے چُوہے مٹھائی پر خوب دانت چلا رہے تھے۔ بھنگی کو دیکھ کر اُنہوں نے پُوچھا :-

"کیا ہے رے ؟"

"حضور ایک پارسل چُھڑوانا ہے"۔ بھنگی نے جواب دیا ؛

"تیرا پارسل ؟"

"جی ہاں، یہ دیکھیئے رسید" ؛

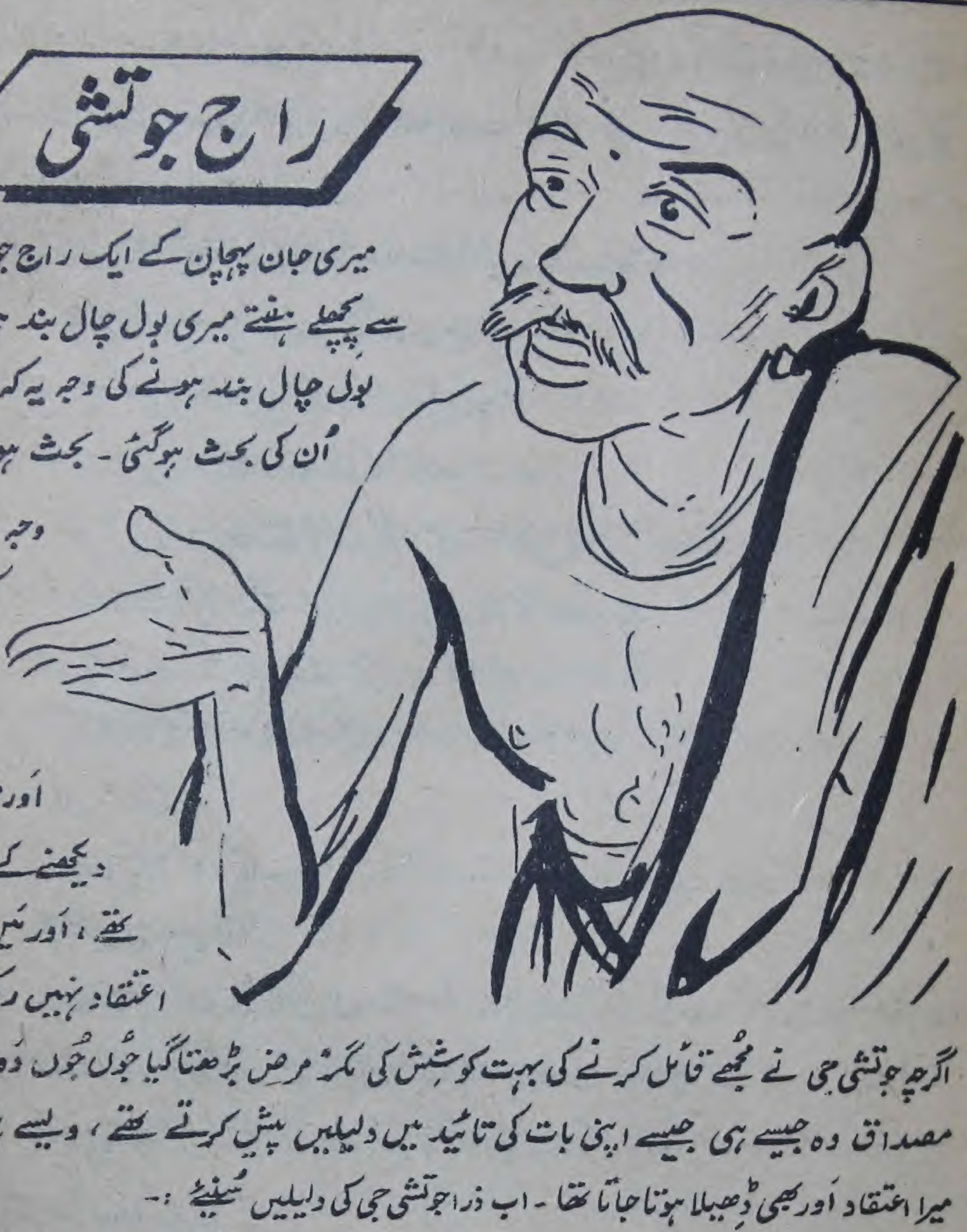
"ہیں! تیرے پاس اِتنی مٹھائی کس نے بھیجی ؟"

"صاحب، کِسی سیٹھ کے ہاں دعوت ہُوئی تھی۔ میرے ایک رِشتہ دار نے بھجوائی ہے۔ سُنا ہے جُوٹھن بہت زیادہ بچی ؛

بے چارے چُوہے "تھُو تھُو" "رام رام" کرنے لگے۔ توبہ کی۔ لیکن وہ توبہ کتنے دِن قایم رہی۔ یہ کون جانے ؟ (شری نارائن اگروال)

عُمر بڑھانے کے قُدرتی طریقے :- جلدی مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اسکی عُمر لمبی ہو۔ لیکن افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ آج ہندوستانیوں کی اَوسط عُمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ عُمر بڑھانے کی خواہش رکھتے ہیں تو "رہنمائے صحت" کا مُطالعہ کریں جس میں دُنیا کے تین سو سالہ چینی اٹلی کے سَو سالہ لوئی کارنرو، ٹرکی کے ۱۶۱ سالہ زارو آغا، مہاراجہ رنجیت کے زمانہ کے یوگی ہری داس وغیرہ کی آپ بیتیاں اَور اِن کے علاوہ زرّیں اصول دیئے گئے ہیں۔ جن پر کار بند کر دہ اِتنی لمبی عُمر جی سکے ؛

راج جوتشی



میری جان پہچان کے ایک راج جوتشی سے پچھلے ہفتے میری بول چال بند ہوگئی۔ بول چال بند ہونے کی وجہ یہ کہ میری اُن کی بحث ہوگئی۔ بحث ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جوتشی جی جنم پتری اور مہورت دیکھنے کے حق میں تھے، اور مَیں اِس پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔

اگرچہ جوتشی جی نے مجھے قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق وہ جیسے ہی جیسے اپنی بات کی تائید میں دلیلیں پیش کرتے تھے، ویسے ہی ویسے میرا اعتقاد اور بھی ڈھیلا ہوتا جاتا تھا۔ اب ذرا جوتشی جی کی دلیلیں سُنیئے:-

مَیں نے پُوچھا — "کیوں بھئی، جنم پتری اور مہورت دیکھنا کیوں ضروری ہے"؟

جوتشی جی بولے — "ضروری اِس لئے ہے کہ بُرے مہورت میں کام شروع کرکے آدمی خواہ مخواہ نقصان نہ اُٹھائے"۔

"بے شک"۔

"یقیناً! تب تو آپ کو ہمیشہ فائدہ ہی ہوتا ہوگا۔ نقصان کبھی نہیں ہوتا ہوگا؟"

اِس سوال پر جوتشی جی کچھ سٹپٹائے، مگر فوراً سنبھل کر بولے۔ نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ اور جب کبھی ہوتا ہے تو وہ سُستی کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی سُستی میں آ کر جب کبھی بغیر مہورت دیکھے کام کر بیٹھتے ہیں تو نقصان ہی ہوتا ہے"۔

"اور اچھے مہورت میں کام کرنے سے فائدہ ہوتا ہے"۔

"تو آپ سُستی کو پاس کیوں پھٹکنے دیتے ہیں؟"

"اجی سُستی تو اِنسان کی ایک عادت ہی ہے"۔

"اور جنم پتری دیکھنے دکھانے سے کیا ہوتا ہے؟"

"جنم پتری دِکھلانے سے اِنسان کو اپنے مستقبل کا علم ہو جاتا ہے"۔

"بیاہ سے پہلے جو لڑکے لڑکی کی جنم پتری ملائی جاتی ہے، اِس کی وجہ کیا ہے"؟

"جنم پتری ملانے سے لڑکے لڑکی میں باہم پیار رہتا ہے"۔

"جنم پتریاں ملا کر جتنی شادیاں ہوتی ہیں وہ سب جوڑے باہم پیار و محبت سے ہی رہتے ہیں؟"

"ہاں، اور کیا"۔

"معاف کیجئے گا، ایک سوال کرتا ہوں ——— آپ کا بیاہ جنم پتری ملا کر ہُوا تھا یا نہیں؟"

"ہُوا کیوں نہیں تھا"۔

"تب آپ میں اور پنڈتانی میں اکثر جو جُوت پیزار ہُوا کرتی ہے۔ اُس کا کیا سبب ہے؟"

"ارے بھئی، یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایسا لڑائی جھگڑا کچھ اہمیت نہیں رکھتا"۔

"تو شائد لڑائی جھگڑے سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کا خون کر ڈالے یا گھر چھوڑ کر بھاگ جائے"؟

"ہاں، پُورا لڑائی جھگڑا تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"تب تو آپ کی جنم پتری ملانا سپھل ہے۔ اگر جنم پتری ملا کر آپ کا بیاہ نہ ہُوا ہوتا تو اب تک یا تو پنڈتانی آپ کا خون کر ڈالتی یا آپ گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے"؟

"پنڈتانی میرا خون کیوں کر دیتی اور گھر چھوڑ کر میں کیوں بھاگ جاتا؟"

"اِس لئے کہ ابھی جو آپ دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے تو اُس میں اکثر جیت پنڈتانی کی ہی

ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنڈتانی آپ سے زبردست ہیں۔ ایسی حالت میں اگر جنم پتری ملائی گئی ہوتی تو یا تو آپ گھر یلو لڑائی میں کام آجاتے اور یا بھاگ کھڑے ہوتے۔ کیونکہ کمزور آپ ہی ہیں ——" ؛

"ہم کمزور کس بات میں ہیں ؟ بات صرف یہ ہے کہ ہم مردوں کو عورتوں کے منہ لگنا زیب نہیں دیتا۔ اس لئے غم کھاتے ہیں" ؛

"تو آپ کی جنم پتری میں یہ لکھا ہوگا کہ آپ ہمیشہ غم ہی کھاتے رہیں گے —— چاہے جتنی بے بھاؤ کی پڑیں" ؛

"آپ سے بات کرنا بیکار ہے، آپ کی زبان میں لگام نہیں" ؛

"اچھا جانے دیجئے، میں اس موضوع پر اب کچھ نہ کہوں گا۔ اتنا بتا دیجئے کہ جنم پتری ملانے سے لڑکے لڑکی کو اور کیا فائدہ ہوتا ہے ؟

"جنم پتری ملانے سے لڑکی کے بے وقت بیوہ یا لڑکے کے رنڈوا ہونے کا خدشہ نہیں رہتا" ؛

"اچھا کیا یہ بات بھی ہے" ؟

"ہاں اور کیا۔ یہی تو سب سے بڑی بات ہے" ؛

پنڈت جی کی ایک بیس سالہ ودھوا لڑکی تھی۔ میں نے سوچا اس کے متعلق کچھ کہوں، کیونکہ اب جوتشی جی مار بیٹھیں گے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ذرا دور ہٹ کر، تاکہ جوتشی جی حملہ کریں تو میں بھاگ سکوں۔ پوچھا —— "پنڈت جی ! آپ نے مالتی کی جنم پتری ملائی تھی یا نہیں" ؟

پنڈت جی بڑے دکھی ہو کر بولے —— "ملائی کیوں نہیں تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کی جنم پتری ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے یہ گڑبڑ ہو گئی" ؛

"لیکن ودھوا ہونے کی بات تو لڑکی کی جنم پتری میں ہوگی، لڑکے سے اس کا کیا تعلق ہے" ؟

"لڑکے کی عمر کم ہونے سے لڑکی ودھوا ہو سکتی ہے" ؛

"تو مالتی کی جنم پتری میں ودھوا ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے" ؟

"جب میں نے جنم پتری ملائی تھی تب تو نہیں تھی" ؛

"تو ممکن ہے، اُس کے بعد پیدا ہوگئی، ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟"

"بھئی، آج تو آپ بے طرح میرے پیچھے پڑے ہیں ـــ مَیں نے کونسا قصور کیا ہے؟"

"پیچھے تو نہیں پڑا ہُوں، اپنا شُبہ دُور کر رہا ہُوں"۔

"آپ کا شُبہ کبھی دُور نہیں ہو سکتا۔" جوتشی جی مُنہ پُھلا کر چل دیئے۔ اُس دِن سے مجھ سے بولنا بند کر دیا۔

سوچتا ہُوں جنم پتری مِلانے کا مطلب کیا ہے؟ فائدہ تو اِس میں رتّی بھر نہیں ہے۔ روز ہزاروں لڑکیاں بیوہ ہوتی ہیں، آئے دِن گھروں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ البتہ نقصان اِس سے بہت ہو رہا ہے۔ اکثر اچھے اچھے رِشتے جنم پتری نہ مِلنے کے باعث رُک جاتے ہیں اور جنم پتری مِل جانے سے بُرے بُرے رِشتے ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی لوگ بیاہ کرنے کے لئے نقلی جنم پتری بنا لیتے ہیں۔ جب دیکھا کہ اصلی جنم پتری نہیں مِلتی تو ایسی جنم پتری بنوا لیتے ہیں جو مِل جاتی ہے۔ بھلا اِس سے کیا فائدہ؟ اگر جنم پتری کا جھگڑا ہی دُور کر دیں تو کیا حرج ہے ـــ؟

سُورگ کی ہُنڈی دینے والے



ہم تریبینی کے اشنان کو گئے۔ "دُودھ چڑھایئے گنگا مائی پہ۔ پھُول بتاشے چڑھایئے یجمان"۔ ایک دُودھ والا گنگا میں گھُس کر ہمارے پاس ہی آگیا۔ اور اشنان میں رُکاوٹ ڈال کر بولا ـــ دُودھ چڑھایئے مہاراج۔

ہم نے غُصّہ پی کر کہا ـــ "اِس سے کیا ہوگا؟"

"پُن ہو گا" ـــــ "گنگا میں دُودھ چڑھانا ہندو دھرم ہے"۔

ہم نے کہا ـــــ "چڑھا دو"۔

اُس نے ذرا سی لُٹیا میں دُودھ اُلٹ کر کہا ـــــ "کتنا یجمان"؟

ہم نے کہا ـــــ "اُس میں ہے ہی کتنا سب چڑھا دو"۔

"دو سیر ہے بابُو"۔

"سب اُلٹ دو"۔

"بد نصیب نے سب دُودھ گنگا میں بہا دیا۔ اور بے فکر ہو کر گھاٹ پر بیٹھ، ہمارے نہانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب ہم فارغ ہو کر چلنے لگے تو بولا ـــــ "پیسے دیجئے یجمان"؟

"دُودھ چڑھایا تھا نا"؟

"پھر بُرا کیا کیا تھا"؟

"تب پیسے دیجئے"۔

"پیسے کیوں دیں"؟

"آپ کے کہنے سے دُودھ چڑھایا تھا"۔

"ہمارے کہنے سے پُن ہی تو کیا؟ پھر ہرج ہی کیا ہے"؟

"لیکن آپ کے نام کا چڑھایا گیا"۔

"اپنے نام کا تم نے کیوں نہیں چڑھایا؟ کیا تم ہندو نہیں ہو"؟

"میں براہمن ہُوں"۔

"اگر تم چڑھاؤ تو پُن نہیں ہو گا"؟

"ہو گا کیوں نہیں"۔

"پھر پُن لُوٹو۔ پیسے کیا کرو گے؟ کیا پیسے پُن سے بھی بڑھ کر ہیں"؟

ہم چل دیئے اور وہ گھبرا کر پیچھے دوڑا، بولا ـــــ "مہاراج پُن آپ لیجئے، مجھے تو پیسے دیجئے"۔

"کیوں پُن سے تمہارا پیٹ بھر گیا"؟

ہم اور آگے بڑھ گئے تو اُس نے راستہ روکا - بالآخر ایک سپاہی کو بُلا کر ہم نے اُس کی مخالفت کی - آپ کہیں گے چار پیسے کے لئے غریب کو ٹھگ لیا - لیکن یہ پُشت ہا پُشت سے چار چار پیسے ٹھگتے چلے آ رہے ہیں - اس کا کیا جواب ہے ؟

پریاگ میں جایئے، کاشی، اُجدھیا ــــ چاہے جس تیرتھ میں جایئے - دھرم کے اِن بیوپاریوں کی ہر جگہ بھرمار ہے - دُوسروں کو پُھول اور دُودھ چڑھا کر پُنیہ لُوٹنے کو کہتے ہیں، مگر یہ لوگ خود نہ ایک پُھول، نہ ایک بُوند دُودھ ہی چڑھاتے ہیں - یا تو اُنھیں پُنیہ لُوٹنے کے بجائے پیسہ لُوٹنا زیادہ پیارا ہے - اور یا یہ جانتے ہیں کہ اس میں پُنیہ وغیرہ کُچھ نہیں، محض ڈھکوسلہ ہے ؂

زبان کا رس



بیکاری سے تنگ آکر دو نوجوان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے - دونوں نے مشورہ کیا - زادِ سفر باندھا اور چل دیئے ؂

ایک شہر میں پہنچے - دن تو تلاشِ معاش میں گزر گیا - رات ٹھہرنے کی فکر ہوئی - پرایا دیس نہ کوئی واقف نہ کہیں جان پہچان - مکان کرایہ پر لینے کی توفیق نہ تھی - سرائے میں سردی کا ڈر تھا، غریب تھے، کپڑے کافی نہ تھے - آخر ایک گلی میں گھٹڑ اکڑ کر بیٹھ گئے اور کہیں سے آگ کی چنگاری لا کر اس میں رکھ دی - آگ جلی - دونوں نے سینکا - اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں -

نیند آئی۔ آنکھیں مندی جاتی تھیں۔ سونے کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نیند کے خلاف زبان اور کانوں کو استعمال کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ یا رب کیا کریں، نیند چھا رہی ہے۔ دوسرا بولا۔ یار کچھ سنا، تم تو ہیر رانجھا خوب گاتے ہو۔ ذرا وقت کٹے گا۔ دوسرے نے نیم وا آنکھیں اوپر اٹھائیں، اور گنگنانے لگا:

گاتے گاتے ذرا اونچا سُر جو کیا، تو دو منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا رضائی میں لپٹی ہوئی آ رہی ہے:

"کون ہو تم؟"

"پردیسی، بیکار":

"دنیا سو رہی ہے، تم گا رہے ہو":

"نیند تو ہمیں بھی آ رہی ہے۔ مگر سونے کا ٹھکانا نہیں۔ اسی لئے گنگنا رہے تھے کہ نیند نہ آئے":

"یہ حالت ہے بیٹا تو آؤ میرے گھر":

بڑھیا دونوں کو لے چلی تھی۔ بیچاری یہ بھی بے کس اور بالکل غریب! ایک چارپائی پر دونوں کو لٹا دیا۔ ایک پرانی گدڑی اوڑھنے کو دے دی:

کچھ آرام پایا تو دونوں کو خیال آیا کہ شام کا کھانا نہیں کھایا۔ بڑھیا سے کہا۔ مائی تکلیف تو ہوگی۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔ آٹا دال ہمارے پاس ہے۔ روٹی پکا دو:

بڑھیا اٹھی، آگ سلگائی، ہانڈی چولھے پر چڑھا کر آٹا گوندھنے بیٹھ گئی:

گھر کا دروازہ تھا چھوٹا۔ دو میں سے ایک نے پوچھا۔ "مائی یہ دروازہ تو بہت تنگ ہے۔ کس طرح چارپائی نکلتی ہوگی":

"بیٹا کیا کروں۔ آڑی ترچھی کر کے نکال لیتی ہوں":

"اور جب مرو گی تو جنازہ کیسے نکلے گا؟"

"بری فال نہ نکالو بیٹا! وہ دن آئے گا تو دیکھا جائے گا":

"یہاں گھر میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں بیٹا - صرف ایک لڑکی ہے، دُوسرے محلّے میں بیاہی ہے - بس وُہی اِس بڑھاپے کا سہارا ہے - اُسی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہُوں - خُدا اُسے زندہ رکھے" ۔

"اچھا مائی اگر وہ مر جائے تو کیا کرو؟"

"کالا مُنہ تمہارا - دفع ہو یہاں سے - اِسی لئے تمہیں جگہ دی تھی؟ یہ کہا اور اُن کا گُندھا ہُوا آٹا اور پکتی دال اِن کی چادر میں ڈال گھر سے باہر کر دیا" ۔

سرد ہوا چل رہی تھی، چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی - یہ دونوں گلی میں چلے جا رہے تھے - ایک آدمی نے پیچھے سے آواز دی - میاں جانے والو! یہ تمہاری کوئی چیز ٹپکتی جا رہی ہے ۔

اِن میں سے ایک بولا "یہ ہمارے بھائی صاحب کی زبان کا رس ٹپک رہا ہے"!

مَوقعہ شناسی ایک ہُنر

ہمارے ایک اخبار نویس دوست غریبوں کے محلّہ میں رہتے تھے، جہاں اکثر گھروں میں نل نہیں تھا - گلی میں میونسپلٹی کے نل پہ دِن بھر بھیڑ لگی رہتی - جو ہٹا کٹا اور اکڑ باز ہوتا وہ دُوسروں کی سہولت کا خیال کئے بغیر ہی نل پر قبضہ جما لیتا - ہمارے دوست دُبلے پتلے اور کمزور تھے - گھنٹوں اُنہیں انتظار کرنا پڑتا ۔

پانی بھرنے والوں میں ایک بُڑھیا بھی ہر روز آتی تھی جو زبان کی نہایت تیز اور سخت تھی - دس منٹ بھی انتظار کرنا اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا - فوراً گالیاں دینا اور کوسنا شروع کر دیتی - لیکن کوئی بھی اُس کی گالی کی پرواہ نہ کرتا، اور اپنا کام ختم کر کے ہی نل پر سے ہٹتا تھا - کبھی کبھی گالیوں کا تبادلہ جھگڑے کی صُورت بھی اختیار کر لیتا تھا ۔

ایک دِن ہمارے دوست صاحب نہا رہے تھے کہ اُسی وقت بُڑھیا آ پہنچی - بُڑھیا کے مزاج سے وہ بخوبی واقف تھے - کچھ اپنی کمزوری محسوس کر کے اور کچھ اور سوچ کر بغیر نہائے

ہی وہ نل پر سے ہٹ گئے اور بڑھیا سے کہا - "پانی لے لو"۔

یہ برتاؤ بڑھیا کے تصوّر سے بھی بعید تر تھا۔ لڑکھڑاتے اور حیران لہجہ میں اُس کی زبان سے نکلا - "بیٹا...."

"تم پانی لے لو"۔

"تم لو بیٹا"۔

لیکن اُنہوں نے اصرار کیا۔ اور بڑھیا پانی لے کر چلی گئی۔

اُس دن سے بڑھیا کے مزاج میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اُس کا گالی دینا اور بڑبڑانا چھوٹ گیا۔ وہ امکان بھر انتظار کرتی رہتی۔

(۲)

دس بارہ روز سے مَیں بیمار تھا۔ متواتر فاقوں سے نہایت ہی لاغر اور کمزور پڑ گیا تھا۔ اِسی حالت میں ریل کے تیسرے درجہ سے سفر کرنا تھا۔ الہ آباد سے بنارس تک۔ سیٹ پر چادر ڈال کر مَیں لیٹ رہا۔

ڈبے میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جگہ کی تنگی سے کچھ لوگ کھڑے ہونے لگے تھے۔ کچھ لوگوں کی تیز اور بامقصد نظر میرے اُوپر پڑ رہی تھی۔ مَیں نے صاف سمجھ لیا۔ کہ اُن کی غصّہ بھری نظریں مجھ سے پوچھ رہی تھیں - کیوں جناب، ہمیں کھڑے ہونے کے لئے جگہ نہیں اور آپ لیٹے ہیں۔ آپ بیمار ہیں تو ہم کیا کریں"۔

اُن کا مطلب مَیں اچھی طرح سمجھ گیا۔ اُن کی بات معقول تھی۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ کہ اتنے آدمیوں کے کھڑے رہتے مَیں آرام سے لیٹا رہوں۔ ہاں، مَیں بیمار تھا، لیکن یہ مسافروں کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے سہولت دیں۔ مَیں نے اپنے فرض کا احساس کیا۔

بغیر کچھ کہے اور مخالفت کئے ہی مَیں اپنے کمزور اور کانپتے ہاتھوں سے سنبھل کر بیٹھنے لگا۔

اُس وقت مَیں نے دیکھا کہ مسافروں کی تشدّدانہ اور سخت نگاہ ہمدردی سے

معمور ہو چکی ہے ۔ اُن لوگوں نے اِصرار کیا ۔ آپ بیمار ہیں ۔ آرام سے لیٹے رہئیے ۔ ہم مزے میں ہیں ۔ اور اُن میں سے ایک نے مجھے لٹا دیا ۔

جب تک اُن آدمیوں میں سے ایک بھی آدمی ڈبے میں رہا ۔ میری حفاظت کرتا رہا ۔ اور دوسرے کسی کو میرے پاس بیٹھنے نہیں دیا ۔



ہمدردی کا مرہم

ایک بار میں امرتسر جا رہا تھا ٹکٹ لینے والے ایک دوسرے کو خوب دھکے دے رہے تھے ۔ کھڑکی کے پاس ٹھسا ٹھس بھیڑ لگی ہوئی تھی ۔ ٹکٹ بابو بچارے پریشان ہو اُٹھے تھے لیکن اُس چھوٹی سی کھڑکی میں نا معلوم کتنے ہاتھ گھس رہے تھے اور نہ جانے کتنی آوازیں آ رہی تھیں —— "دو ٹکٹ میرٹھ" ۔ بابو ساڑھے تین ٹکٹ لدھیانہ ، جلدی دینا —— "ارے ، گاڑی تو چھوٹ گئی بابو ، سہارن پور کا ایک ٹکٹ" ۔

"ٹھہرو ، ٹھہرو" ۔ ٹکٹ بابو کہتے جا رہے تھے ۔ اور پسینہ پونچھتے پونچھتے ایک ایک آدمی کو نپٹاتے جا رہے تھے ۔

گاڑی آنے کا وقت ہو رہا تھا ۔ لوگوں کے صبر کا پیالہ چھلکنے لگا ۔ طعنہ زنی شروع ہوئی —— ارے بھائی ، دکشنا چڑھاؤ ، تب جلدی ٹکٹ ملے گا" ۔ —— "اجی ، بد انتظامی کی انتہا ہے" ۔ —— ہم سٹیشن ماسٹر سے شکایت کریں گے —— ایک سوٹ پہنے صاحب نے فرمایا ۔

لیکن ٹکٹ بابو ان باتوں کو سنا ان سنا کر کے اپنا کام کرتے رہے۔ کبھی کبھی ناراض ہو جاتے تو طعنہ کسنے والوں کو دیر سے ٹکٹ دے کر اپنی ناراضگی اُن پر اُتارتے ÷

مَیں پاس ہی کھڑا تھا۔ مَیں نے اپنے قریب کے مُسافروں سے دِھیرے سے کہا۔ "ذرا ٹھہریئے بھائی صاحب۔ دیکھیئے بچارا بابُو کتنا پِس رہا ہے۔ جہاں تین آدمی ہونے چاہیں وہاں ریلوے نے صرف ایک پر بوجھ ڈال رکھا ہے ÷

"ہاں، ہاں، ٹھیک تو ہے۔ ذرا صبر سے کام لو بھائی، سب کو ٹکٹ مِل جائے گا۔" ایک اور صاحب بول اُٹھے ÷

ٹکٹ بابُو پر اِن اِلفاظ کا بہت اثر پڑا ——— "کچھ نہ پُوچھیئے بابُو صاحب" اُس نے سر سے ٹوپی اُتارتے ہُوئے کہا ——— "ایسا پِس رہا کہ حساب نہیں۔ ہیڈ آفس سے سٹاف بڑھانے کے لیئے کہا گیا، مگر جواب نفی میں مِلا۔ بڑی مُصیبت ہے۔ خیر، آپ کو کہاں جانا ہے، بابُو صاحب؟"

اُس نے مجھے فوراً ٹکٹ دے دِیا، اور اُسی شور وغل میں پُوچھا ——— "آپ یہیں رہتے ہیں؟" میرے ہاں کہنے پر اُس نے کہا ——— "واپسی پر ضرور درشن دیجیئے گا۔" اور نئے جوش و خروش سے کھٹا کھٹ ٹکٹ کاٹ کر بیبڑ چھاپنا شروع کر دِیا ÷

چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن ایک سبق سِکھاتا ہے۔ بات تو سچ تھی کہ ٹکٹ بابُو کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ جنہوں نے طعنے کسے، اُن کے خلاف اُس کا دِل سخت ہو گیا۔ مَیں نے ہمدردی دِکھائی، تو اُس کا دِل موم سا ہو گیا۔ اور اُس نے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ اوروں کو بھی جلدی جلدی ٹکٹ دینے شروع کر دِیئے۔ ہمدردی کے اُن تھوڑے سے لفظوں نے اُس میں نیا جوش بھر دیا ÷

میرے اِلفاظ محض اُسے خوش کرنے کے لِئے نہیں کہے گئے تھے۔ وہ سچے دِل سے نِکلے تھے۔ مجھے خوشی ہُوئی کہ مَیں نے اُن تھوڑے سے لفظوں سے اُس بابُو کی زِندگی میں کُچھ رس بھر دِیا ÷

ایسے موقعے ہمیں روز، ہر گھڑی مِل سکتے ہیں ÷



بگڑتا کام سُدھرتا ہے

ہم سرینگر جا رہے تھے۔ راستے میں سڑک سے ہٹ کر ویری ناگ چشمہ آتا ہے۔ اگر ڈرائیور چار میل کا چکر کاٹنا منظور کر لے تو وہ اپنی سواریوں کو ویری ناگ چشمہ دِکھا سکتا ہے۔ ہمارا ڈرائیور ہمارے ساتھ نہایت اچھی طرح چلا آ رہا تھا۔ آپس میں ہمارا بہت اچھا سمجھوتہ تھا۔ ہم میں سے کام کاج کے انچارج ممبر کا خیال تھا کہ انہوں نے کرایہ طے کرتے وقت یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ڈرائیور ہمیں ویری ناگ بھی لے چلے گا۔ بات چیت کرتے ہُوئے کہیں آپس میں اَن بَن ہو گئی۔ بلکہ معاملہ جھگڑے کی صُورت اختیار کر گیا۔ ویری ناگ سے دو میل اِدھر ہی آپس میں بُرا بھلا کہنے تک نوبت پہنچ گئی۔ ہمارے انچارج نے غُصّے میں کہہ دِیا۔ "اگر تم ہمیں ویری ناگ لے جانا نہیں چاہتے تو جو مرضی ہے کرو۔ ہم ویری ناگ دیکھ کے آئیں گے۔ تم جانا چاہو تو ہمارے بغیر ہی چلے جاؤ، اور جہاں تمہارا دِل چاہے ہمارا سامان اُتار کے رکھ دو۔" اس نے جواب دِیا کہ وہ ہمارا اسباب اگلے پولیس سٹیشن پر جمع کرا دے گا۔ لیکن ویری ناگ ہر گز نہیں جائے گا۔ کیونکہ وہاں جانا اس نے اُس کرائے میں طے نہیں کیا تھا۔ اور آج کل پٹرول بھی نہائیت مُشکل سے مِلتا ہے؛

انچارج کے کہنے پر ہم لاری سے اُتر آئے۔ لیکن مجھے بڑی شرم محسوس ہو

رہی تھی۔ میں اپنے ساتھی کی عزت میں فرق آتا تو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہ حالت تو میرے بیٹے نہایت تکلیف دہ تھی۔ ہم سب شرمندہ سے ہو کر پیدل ہی چل دیئے۔ اتنے میں ہمارے ایک دو ساتھی اور ڈرائیور آپس میں تلخ کلامی پر اُتر آئے۔

آخر میں نے ڈرائیور سے کہا۔۔۔۔ "بھئی! ہم آپس میں نہایت اچھا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ کتنا لطف آ رہا تھا"۔۔۔۔ "یہ بے لطفی آپ لوگوں نے کتنی ناکارہ سی بات سے پیدا کرلی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔۔۔۔ "میرے ساتھ طے نہیں ہوا تھا۔ اگر فیصلے کے علاوہ کوئی بات کہنی تھی تو اس طرح زور دے کر نہ کہی ہوتی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہماری غلطی تھی۔ لیکن اب ہم ویری ناگ جانے کا خیال ہی ترک کر دیں تو کیا آپ اس تمام واقعہ کو بھول کے پھر اُسی طرح ہنستے کھیلتے ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں؟ ویری ناگ دیکھنے سے ہمیں اتنا مزہ نہیں آئے گا۔ جتنی بے مزگی روٹھے ہوئے ڈرائیور کی گاڑی میں بیٹھنے سے ہوگی"۔

"اگر آپ اس طرح کہیں تو میں ویری ناگ بھی لے جا سکتا ہوں"۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔

"نہیں بھئی! اب ہم ویری ناگ ہرگز نہیں جائیں گے۔ میں اتنی سزا اپنے آپ کو ضرور دینا چاہتا ہوں"۔ میں نے ڈرائیور سے کہا اور انچارج کو سمجھا کر پارٹی کو لاری میں سوار ہو جانے کو کہا۔

لاری چل پڑی۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا۔ "چار میل کی بات ہی کیا تھی۔ غصہ تو مجھے لہجے کا تھا"۔

"یہ ہماری غلطی تھی۔ اب ہم ویری ناگ بالکل نہیں جائیں گے"۔ میں بھی دُہراتا جا رہا تھا۔

اتنے میں ویری ناگ والا موڑ آ گیا۔ ڈرائیور نے میرے بار بار منع کرنے کے باوجود گاڑی اِدھر گھما دی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور کہا۔۔۔۔ "ہم ویری ناگ جانا بالکل نہیں چاہتے" لیکن ڈرائیور کہتا تھا کہ وہ ہمیں ضرور ویری ناگ دکھا کے ہی آئے گا"۔

ہم وِیری ناگ دیکھ آئے۔ وہاں پَون گھنٹے کے قریب وقت بھی لگ گیا۔ مَیں ساتھیوں کو جلدی کرنے کے لئے بھی کہتا رہا۔ لیکن ڈرائیور نے کِسی قسم کی عجلت کا اِظہار نہ کیا۔ آخر منزل پر پہنچ کے جب مَیں نے اُس فالتُو وقت کی اُجرت کے طور پر فالتُو پَیسے دینے چاہئے تو ڈرائیور میرے ساتھ ہاتھ مِلا کر چلا گیا، اور پَیسے لینے سے اِنکار کر دِیا ۔ (اگور بخش سنگھ)

غیر بھی اُپنے بن جاتے ہیں

سوامی رام تیرتھ جاپان سے امریکہ جا رہے تھے، اُس وقت اُن کے پاس اُپنے جسم اور آتما کے سِوا اور کچھ نہیں تھا۔ جہاز جب سان فرانسِسکو کے قریب پہنچا، اُس وقت جہاز پر ہل چل مچ گئی۔ اُترنے والے سب کے سب مُسافر اُپنا اُپنا اسباب سمیٹ رہے تھے، ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے بھائی، بہن یا دوست کوئی آیا ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے بندرگاہ کی طرف سب گردن اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ لیکن سوامی جی چُپ چاپ اُپنی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جو دیکھتا وہ یہی سمجھتا کہ آپ کو یہاں نہیں اُترنا ہے۔ ایک امریکن مُسافر کی نِگاہ سوامی جی پر پڑی، وُہ فوراً آپ کے پاس گیا۔ پُوچھا۔ "آپ کا اسباب کہاں ہے؟" سوامی جی نے جواب دِیا۔ رام اُپنے ساتھ اُتنا ہی اسباب رکھتا ہے، جِتنا وہ خود جہاں چاہے جہاں اُٹھا کر لے جا سکتا ہے"۔

"کیا آپ یہیں اُتریں گے"؟

"ہاں"

"آپ کو خوش آمدید کہنے والے آپ کے دوست یہاں ہوں گے"؟

"ہاں، ہاں"

"وہ کون ہیں"؟

سوال کُنندہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوامی جی نے جواب دیا۔ "آپ"۔ اِس لفظ کا اُس امریکن پر اِتنا اثر پڑا، کہ جب تک سوامی جی امریکہ میں ٹھہرے۔

تب تک اُن کے کھانے پینے اور رہائش وغیرہ کا سب اِنتظام وُہی کرتا رہا ؛

زبان سب کو ملی ہے، لیکن بولنا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اُن مُبارک ہستیوں کی تعداد اُنگلیوں پر ہی شمار کی جا سکتی ہے، جن کی زبان میں اُمرت کی سی مٹھاس اور برف کی سی ٹھنڈک رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کی زبان سے نکلے ہُوئے ایک ایک لفظ سے ٹوٹے دِل جُڑ جاتے ہیں اور بگڑے کام بن جاتے ہیں ؛

غُصّہ چنڈال

چند سال قبل آگرہ میں ایک سادھُو آئے۔ سادھُو کی متحمل مزاجی، خود ضبطی، بُردباری وغیرہ اوصاف کی چرچا سُنی تو کوّی جی بنارسی داس بھی درشن کے لئے پہنچے۔ دورانِ گُفتگو میں کوّی جی بولے — "مہاراج! کیا مَیں آپ کا شُبھ نام معلوم کرنے کی جُرأت کر سکتا ہُوں؟"

"مُجھے شیتل پرشاد کہتے ہیں" ؛

کوّی جی نام سُن کر وہاں ہو رہی بات چیت میں لگ گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنی بھُول جانے کی عادت بتاتے ہُوئے سادھُو سے نام پُوچھ بیٹھے۔ سادھُو نے بے دِلی سے نام دُہرا دِیا۔ کوّی جی کو اِس پر بھی چین نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر نام پُوچھا تو سادھو مہاراج آگ بگولا ہو گئے اور جھُنجھلا کر بولے — "تُو بھی عجیب آدمی ہے۔ اب تک، دس بار کہہ دِیا۔ ہمارا نام ہے شیتل پرشاد! شیتل پرشاد!! شیتل پرشاد!!! پھر کیوں دماغ چاٹتا ہے؟"

کوّی جی نے سادھُو کی یہ خوفناک صُورت دیکھی تو اُٹھ کر چل دیئے اور جاتے ہُوئے بولے — "مہاراج، آپ کا نام شیتل پرشاد نہیں، جوالا پرساد معلُوم ہوتا ہے" ؛

(۲)

گنگا کنارے ایک سادھُو آشرم بنا کر رہتے تھے ؛

لوگوں کے نہانے دھونے کے لئے کسی بھگت نے ذرا نیچے ایک پُختہ گھاٹ بنوا دیا

تھا۔ ایک دِن سادھو نہا دھو کر گھاٹ پر بیٹھے جپ کر رہے تھے۔ اُسی وقت قریب کے گاؤں کا چمار گھاٹ پر نہانے پہنچ گیا۔ نہانے کے بعد وہ سادھو سے کافی دُور بیٹھ کر کپڑے دھونے لگا۔ اِتفاق سے ایک چھینٹا سادھو کو لگ گیا، پھر کیا تھا، سادھو کا پارہ گرم ہو گیا۔ جپ کو وہیں چھوڑا، اور اُس چمار کے پاس جا کر اُسے زور کے دو تھپڑ ثبت کر دیئے۔ بولے ــــ "دیکھ کر کپڑے نہیں دھوتا، حرامی!"

چمار بولا ــــ "مہاراج! مُعاف کیجئے، احتیاطاً مَیں آپ سے بہت دُور بیٹھا تھا، مگر غلطی سے کوئی چھینٹا چلا گیا ہو گا"۔

اِن ٹھنڈے چھینٹوں سے سادھو کے غُصّے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ بولے ــــ "پہلے تو مجھ نہائے ہوئے کو بھرشٹ کیا، اُوپر سے باتیں بناتا ہے"۔ یہ کہہ کر دو تھپڑ اور لگا دیئے۔ چمار کا جسم سادھو سے کمزور نہیں تھا، لیکن اُس نے بدلے میں غُصّہ نہیں کیا۔ ہاتھ جوڑ کر چُپ رہا۔ اُس نے سوچا کہ جب کُچھ بھی نہ بولنے سے بابا کا غُصّہ بڑھتا ہی ہے۔ تب چُپ رہنا ہی اچھا ہے۔

سادھو ایک تو چھینٹے سے ہی بھرشٹ ہو گیا تھا، دُوسرے چمار کو چھُونے سے بالکل ہی ناپاک ہو گیا۔ دوبارہ نہانا ضروری ہو گیا اِدھر سادھو نہانے بیٹھا، اُدھر چمار بھی اپنی جگہ سے پانی میں اُترا۔ سادھو کو اچنبا ہُوا کہ یہ پہلے نہا چکا تھا، اب پھر نہانے کیوں اُترا ہے۔ پُوچھا ــــ "ارے پاجی! مَیں تو تجھ سے چھُو جانے کی وجہ سے پھر نہاتا ہُوں، مگر تُو کیوں نہاتا ہے"۔

چمار بولا۔ "مَیں بھی چھُو گیا ہُوں"۔

"تُو کس سے چھُو گیا ہے؟"

"چنڈال سے"۔

اب تو سادھو کا غُصّہ اور بھڑک اُٹھا۔ اُس نے ہوش و حواس کھو دیئے۔ اور چمار کی طرف یہ کہتے ہُوئے لپکا ــــ "حرامی! تُو مجھے چنڈال کہتا ہے؟"

چمار نے کہا ــــ نہیں مہاراج! آپ کو تو مَیں مہاتما جانتا ہُوں۔ سپنے میں بھی آپ

کے لئے میری زبان پر یہ لفظ نہیں آ سکتا۔ چنڈال تو آپ کا غصّہ ہے، جس کو چھو لینے پر میں دوبارہ نہا رہا ہوں"۔

اب کہیں سادھو کا دماغ ٹھکانے آیا۔

اپنا اپنا مزاج



ایک بار میرا نوکر بازار سے خراب سودا لایا۔ میں اس پر خفا ہوا، اور غصّے میں بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ میری بیوی چُپ رہی، مگر جب میرا غصّہ ٹھنڈا ہوا، تب انہوں نے کہا — "نوکر نے تو چند پیسے ہی خراب کئے تھے۔ لیکن مالک نے اپنی قیمتی زبان خراب کر ڈالی" — یہ سُن کر میں شرمندہ ہو گیا۔ وہ مُسکرا کر قدرے سنجیدہ ہو گئی۔ سچ مچ پیسوں کے بیجا صرف سے سوسائٹی کو اتنا نقصان نہیں پہنچا، جتنا زبان کے ناجائز استعمال سے۔ انسان ابھی نہیں سنبھلا، نہیں سمجھا۔

(۲)

کل ہی کی بات ہے۔ دن بھر میں بے حد پریشان رہا۔ پرسوں رات کو بڑی محنت سے ایک مضمون لکھا تھا۔ کاغذ کی مہنگائی کے خیال سے میں نے کچھ پُرانے خطوں کی پُشت کو ہی استعمال کر لیا تھا۔ مضمون ایک ماہوار رسالہ کے لئے لکھا تھا۔ کیونکہ اُس کے لئے کئی تقاضے آ چکے تھے۔ کل صبح جب میں اِس مضمون کو بھیجنے کے لئے ایک بڑے لفافہ پر پتہ لکھ چکا تو وہ ڈسک پر دکھائی نہ دیا۔ اِدھر اُدھر تمام دفتر بھر میں ڈھونڈنے لگا۔ شاید کسی کتاب یا فائل کے نیچے دب گیا ہو۔ اِس لئے تمام سامان ہی اُلٹ پلٹ کر ڈالا۔ خیال تو پکا ہی تھا کہ مضمون اُسی ڈیسک کے ایک کنارے رکھ دیا تھا، لیکن ممکن ہے اور کہیں رکھ دیا ہو۔ سب الماریوں کو بھی کھول



کھول کر دیکھ ڈالا۔ میز کے دراز بھی چھان ڈالے لیکن اُس کا کہیں بھی پتہ نہ چلا۔ پھر اندر جا کر گھر والوں سے پُوچھا کہ کسی نے اُس کے پڑھنے کے لئے تو نہیں لیا۔ لیکن رات ہی کو تو لکھا تھا۔ کسی کو اُس کے متعلق معلوم ہی نہ تھا۔ بڑی پریشانی ہُوئی۔ غُصّہ بھی آیا لیکن کس پر غُصّہ کرتا؟ آخر جب کھانے کے لئے رسوئی گھر میں گیا اور نوکر تھالی پروسنے لگا تو اچانک چُولہے کے نزدیک پڑے ہُوئے نیم سوختہ کاغذ پر نظر پڑی۔ ارے یہ تو وُہی خط کا ایک ورق تھا جس کے پیچھے مَیں نے کل رات اپنا مضمون لکھا تھا۔ بس میرے غُصّہ کی حد نہ رہی۔ نوکر پر برس پڑا۔ وہ بے چارہ گھبرا گیا۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بولا ——

"بابُوجی! صُبح آگ سُلگانے کے لئے کچھ ردّی کاغذ ہی سمجھ کر مَیں اُن ورقوں کو اُٹھا لایا تھا۔ روز آپ پُرانی چٹھیاں ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ مَیں سمجھا کل آپ بُھول گئے ہوں گے۔ اور وہ ردّی آپ کے ڈیسک پر ہی رہ گئی ہوگی۔ قصُور مُعاف ہو۔ اب آپ کے دفتر سے کبھی ایک بھی کاغذ نہ اُٹھاؤں گا"۔

لیکن مَیں اُسے اُلٹی سیدھی سُناتا ہی گیا۔ اُس کی کُچھ تنخواہ کاٹ لینے کی دھمکی بھی دی۔ غُصّہ کے مارے کھانا بھی ٹھیک طور سے نہ کھا سکا۔ آدھے پیٹ ہی اُٹھ گیا۔ دن بھر دل میں بے چینی اور غُصّہ رہا۔

(۳)

اُسی رات مَیں نے نیوٹن کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا۔ اُس نیوٹن کا جس نے کشش

زمین کی دریافت کی اور دنیا کو ایک نئی نظر دی تھی۔ اُس کے گھر میں ایک کمرہ تھا جس میں اُس کے تجربات جاری رہتے تھے۔ برسوں سے وہ ایک آلہ کے کچھ اعداد کا ریکارڈ رکھ رہا تھا اور ایک گراف بنا رہا تھا۔ وہ گراف کا کاغذ کئی سال تک حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ اِس لیئے وہ کافی پُرانا سا نظر آتا تھا اور اُس پر کئی دھبے بھی پڑ گئے تھے۔ وہ گراف کا غذ اُس آلہ کے پاس ہی ایک پن سے لگا رہتا تھا۔ اُس کا پُرانا نوکر چلا گیا تھا۔ اُس کی جگہ ایک نیا نوکر رکھنا پڑا۔ وہ بیچارہ اپنے مالک کی خدمت بڑی لگن سے کرتا۔ گھر کی خُوب صفائی رکھتا۔ اُس نے ایک پُرانے کاغذ پر دھبے لگے دیکھے۔ سوچا مالک کو نیا کاغذ نکال کر استعمال کرنے کی شائد فرصت ہی نہیں ملتی۔ اُس نے اُس کاغذ کو ہٹا کر ایک دُوسرا نیا کاغذ پن سے لگا دیا اور پُرانے کاغذ کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

جب نیوٹن نے اُس آلہ کے قریب ایک نیا کاغذ دیکھا تو اُس کے دِل کو بھاری صدمہ پہنچا۔

"یہاں کا کاغذ کہاں گیا؟" نیوٹن نے نوکر سے پُوچھا۔

"حضور وُہ پُرانا ہو گیا تھا نا؟ اس لئے میں نے اُسے بدل دیا"۔

"وہ پُرانا کاغذ کہاں رکھ دیا؟"

"پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا صاحب!" نوکر نے آہستہ سے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

نیوٹن کی پاؤں تلے زمین گویا کھسکنے لگی۔ وہ بدحواس ہو گیا اور مایوس ہو کر اپنی پیشانی کا پسینہ رومال سے پُونچھتے ہُوئے بیٹھ گیا۔ اُس نے سامنے کھڑے نوکر سے صرف اتنا ہی کہا ـــــ "بھائی میرا بھاری نقصان ہو گیا۔ برسوں کی محنت خاک میں مل گئی لیکن خیر خُدا کی مرضی"۔

اور پھر اُسی دِن سے اُس نے اپنے اعداد کا دُوسرا گراف دوبارہ بنانا شروع کر دیا۔

(۴)

مشہور و معروف ادیب کارلائیل کا بھی کچھ اِسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ انقلاب فرانس پر اُس کی تصنیف مشہور ہے۔ جب وہ اُس ضخیم کتاب کو لکھ چکا تو اُس کا مسودہ اپنے ایک

دوست کے پاس دیکھنے کے لئے بھیجا۔ کتاب کی دوسری کاپی اُس کے پاس نہ تھی اور اس کا دوست کافی ذمہ دار شخص تھا۔ اِس لِئے اُسے تشویش کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی ؛

کئی دن بعد کارلائل اپنے دوست کے گھر گیا۔ دوست نے کہا ——"ارے مَیں آپ کی کتاب کے بارہ میں بالکل بھول ہی گیا ابھی مَیں اُسے نہیں پڑھ سکا ہُوں" ؛

"خیر کوئی بات نہیں"۔ کارلائل نے قدرے مایُوس ہوکر کہا ؛

دوست نے اپنے نوکر سے قلمی مسّودہ لانے کو کہا۔ بیچارے نے کمرے میں اِدھر اُدھر کافی دیر تک تلاش کِیا لیکن وہ ہاتھ نہ لگا ؛

"حضور وہ آپ نے کہاں رکھ دِیا ؟ وہاں نظر نہیں آتا" ؛

"کیا ؟ ارے اُسی درمیان کی میز پر تو رکھا تھا" ؛

"میز پر تو نہیں ہے صاحب !"

"اچھّا میم صاحب سے پُوچھو۔ اُنہوں نے شاید پڑھنے کو لیا ہو" ؛

میم صاحب سے بھی پُوچھا گیا۔ لیکن اُنہیں بھی کچُھ پتہ نہ تھا ؛

کافی دیر تک پُوچھ تاچھ کرنے پر معلوم ہُوا کہ ایک نوکرانی نے اُسے میز کے نیچے پڑا دیکھا تھا۔ وہ سمجھی کہ وہ ردّی کاغذوں کا گٹھا ہوگا۔ کیونکہ نیچے تین دِن سے پڑا تھا۔ اِس لئے اُس نے میرے نوکر کی ہی طرح بہتر سمجھا کہ اُس گٹھے کا اچھّے سے اچھا اِستعمال رسوئی گھر کے چُولہے میں ہی کیا جائے ؛

یہ قِصّہ سُن کر کارلائل کے افسوس کی کیا حد رہی ہوگی۔ اُسکی نامعلوم کِتنے سالوں کی محنت آگ پر نثار ہوگئی۔ لیکن اُس نے کچُھ نہیں کہا۔ پُرانی یادداشت کی بنا پر اُس کتاب کو دوبارہ لکھنا شروع کر دیا ؛

مَیں ایک چھوٹے سے مضمُون کے بھسم ہوجانے سے ہی اِتنا لال پیلا ہوگیا اور اپنا توازن کھو بیٹھا ؛ سچ پُوچھئے تو پریشان ہونا اور نہ ہونا اپنے دِل کا کھیل ہے۔ ہمارا لُطف بیرُونی واقعات پر اِتنا منحصر نہیں جِتنا خود اپنے مزاج پر ہے۔ ہمارا دِل ایک مکمّل سلطنت ہے۔ اُس میں ہم چاہیں تو ہمیشہ خوش رہ سکتے ہیں۔ اور نہیں تو ہمیشہ آنسو بہاتے رہ سکتے ہیں۔ سورگ اور نرک جنّت اور دوزخ ہمارے اندر ہی ہے، اُوپر آسمان پر نہیں ہے ؛

ہیئر کٹنگ سیلون میں



اُس دن بدن تھکا سا تھا، اور کسی کام میں دِل نہیں لگ رہا تھا۔ مَیں اُٹھا اور بال کٹوانے کے لئے ظفر میاں کے چھوٹے سے ہیئر کٹنگ سیلون میں پہنچ گیا۔

ظفر میاں ایک دِلچسپ آدمی ہے، میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔ جب مَیں پہنچا وہ ایک آدمی کی حجامت بنا رہا تھا اور دو مزدور اِنتظار میں بیٹھے تھے۔

میرے دُکان میں پہنچتے ہی ظفر نے اُسترا رکھ دِیا۔ میرے لئے اُس نے کرسی بچھائی، اور باہر کی دُکان سے چائے کا ایک پیالہ لاکر مجھے دِیا۔ مَیں چائے پینے لگا اور ظفر پھر حجامت بنانے لگا۔

● اَب مَیں بیٹھا ہُوں کرسی پر اور دیکھ رہا ہُوں کہ میاں ظفر اُس مزدور کے بال کاٹ رہے ہیں۔ مَیں مزدور کو دیکھتا ہُوں اور سوچتا ہُوں —— یہ شاید پانچ سات دِن سے نہیں نہایا۔ بالوں میں اُس کی ریت بھری ہے۔ مگر ظفر صاحب بڑی لگن سے اُس کے بال کاٹ رہے ہیں، جیسے یہ مزدور نُورجہان کا سگا بھائی ہو۔

کبھی کندھے سے ناپتے ہیں، کبھی قینچی سے اور پھر پھُرک پھُرک دو چار قینچی مارتے ہیں۔ مَیں دیکھ رہا ہُوں کہ ظفر بالوں میں اِس قدر غلطاں ہے کہ اُسے یہ یاد ہی نہیں کہ مَیں بھی یہاں بیٹھا ہُوں، اور اُسے میرے بھی بال کاٹنے ہیں۔ وہ بالوں کی کٹائی کو اپنی

کاریگری کی آخری حد تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اُس کا دھیان اس پر نہیں ہے کہ یہ مزدور اس کاریگری کو نہیں سمجھ سکتا ؛

وُہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس مزدور کی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ وُہ ان بالوں کو ٹھیک رکھ سکے ؛

مَیں سوچ رہا ہُوں۔ غالباً یہ مزدور حجامت کے بعد آج نہائے گا اور بالوں میں تیل ڈال کر کنگھا کرے گا۔ مگر کل ان میں پھر بھی مٹی اور ریت بھر جائے گی، اور یہ ایسے ہی اُلجھ جائینگے، جیسے آج اُلجھے ہوئے ہیں ؛

مَیں یہ سب سوچ رہا ہُوں، لیکن ظفر ان میں سے کوئی بھی بات نہیں سوچ رہا۔ وہ اپنی دُھن میں ہے۔ وہ کنگھا چلاتا ہے، مگر نہیں چلتا، اُلجھے بالوں میں اٹک جاتا ہے۔ ظفر بال سُلجھاتا ہے اور کنگھا بڑھاتا ہے ؛

کبھی وُہ جُھک کر بالوں کا میلان دیکھتا ہے کبھی اُبھر کر، کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر۔ ایک ایک بال پر، ایک ایک میلان پر ظفر کی نگاہ ہے، جیسے کوئی انجینئر کسی پُل کے کھمبوں کا میلان دیکھ رہا ہو ؛

یُوں کٹنگ پُوری ہوئی اور تب قینچی کو چار بار تال کے ساتھ خالی ہی چکر چلا کر ظفر نے کہا ـــــ "لو سرکار، کٹ گئے آپ کے بال" ؛

● اب اُس نے اُٹھایا بُرش اور وُہ لگا حجامت بنانے۔ حجامت میں بھی اُسی طرح بیحد مشغول۔ ایک ہاتھ سیدھا تو ایک اُلٹا، اور ساتھ ہی یہ دیکھ بھال کر کہ کہیں کوئی کیل تو نہیں رہ گئی۔ قلم سے لے کر مُونچھوں تک سب کام اُس نے بڑی خوبصُورتی سے کئے؛

۲۰ منٹ سے زیادہ مَیں ظفر کی انتہائی دلچسپی کو دیکھتا رہا۔ سچ یہ ہے کہ ظفر اُس مزدور کے بالوں میں غلطاں تھا اور مَیں ظفر میں۔ پیسے دے کر جب وُہ مزدور چلا گیا تو مَیں نے کہا ـــ "ظفر میاں! تم تو اُس مزدور کو ایسے پلٹے کہ جیسے ضلع کا کلکٹر ہی تمہاری دُکان پر آ بیٹھا ہو" ؛

ظفر نے جواب دیا، اُس سے آگرہ کا پیٹھا اور دِلّی کا سوہن حلوا دونوں پھیکے

پڑ گئے ——— باؤجی! میرے لئے تو جو اس کرسی پر بیٹھتا ہے، وہی کلکٹر ہے"۔ دل نے کہا ——— "ہر ایک شہری اپنا کام ایسی ہی لگن، ایسی ہی محنت اور ایسی ہی ایمانداری سے کرے تو دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں نئی جان آجائے"۔

مہذب عورتیں



ڈپو مسوری کی سب سے اونچی چوٹی پر ہے۔ وہاں دیکھنے کے قابل تو کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن وہ قابلِ رہائش ضرور ہے۔ شہر کی گلیوں میں وہ فرحت بخش تازہ ہوا کہاں؟

آج میں اس طرف چڑھنے لگا۔ چڑھائی تھکا دینے والی تھی۔ میں تھک گیا۔ لیکن اگر پہاڑ پر تھکاوٹ جلدی ہوتی ہے، تو اُتر بھی جلدی ہی جاتی ہے۔ دل میں آیا آؤ کچھ دیر سستا لیں۔ لیکن کہاں بیٹھوں۔ میونسپلٹی نے جگہ جگہ پر سیمنٹ کے بنچ بنوا کر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک راہگیر نے بتایا اگلے موڑ پر بنچ ہیں، اور وہاں کا نظارہ بھی بڑا دلکش ہے۔ اُمید میں بڑی طاقت ہے۔ بنچ کی دھن میں آگے بڑھا موڑ کے عین سامنے غروب آفتاب کی سنہری کرنیں چتکبرے بادلوں پر بوقلمونیاں کر رہی تھیں۔

چلو بنچ پر بیٹھ کر یہ نظارہ دیکھیں گے اور تازہ ہوا کھائیں گے۔ خیال نے ایک پرواز کی پگڈنڈی پر لمبے لمبے قدم بڑھے۔ وہ نظر آ رہا ہے بنچ۔ پگڈنڈی

سے ایک طرف بڑھا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا، اس پر پڑا وہ بنچ! اس کے سامنے تھوڑے فاصلہ پر دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کی قطاریں اور عین نیچے ہزاروں فٹ کا گہرا کھڈ۔ سوچنے لگا، مسوری کا انجینئر بھی غالباً شاعرانہ طبیعت کا ہوگا۔ کیسی اچھی جگہ چنی ہے۔ بنچ رکھنے کے لئے۔ دو لمبے ڈگ مارے اور بنچ کے پاس پہنچ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ بنچ پر ٹِک گئے، اور کھلی آنکھوں میں بادلوں کے بنتے بگڑتے نظارے! میں بے سُدھ اور بیخود سا خیالات کی رَو میں بہنے لگا۔ معاً ہوا کا ایک ہلکا سا بدبُو سے بھرا ہوا جھونکا آیا، پتہ چلا کہ ہمیں جو عورتوں نے بنچ کی آڑ کا فائدہ اُٹھا کر پیشاب کیا تھا۔ کُتے بھی جگہ دیکھ کر پیشاب کرتے ہیں۔ اور ان مہذب عورتوں نے بھی جگہ دیکھ کر ہی اپنی حاجت رفع کی تھی!

سرکاری پیشاب گھر

حاجت زوروں پر تھی کہ سامنے آگیا سرکاری پیشاب گھر، اور میں اُدھر لپکا۔ دروازے تک پہونچا ہی تھا کہ تیز بدبُو کا ایک جھونکا اندر سے آیا۔ منصوری کے میونسپل بورڈ کی میں تعریف کروں گا کہ صفائی کا اعلےٰ انتظام ہے، مگر یہ بدبُو کیسی؟ دماغ نے کہا ___ "جانے کب سے اس پیشاب گھر میں پانی کی بُوند نہیں پڑی۔ لُطف آ جائے اگر ایک رات کے لئے ایڈ منسٹریٹر صاحب کو اس میں بند کر دیا جائے"!

اندر جھانکتا ہوں کہ پانچ آدمیوں کے لئے جگہ ہے۔ اور پانچوں میں پانچ تعلیم یافتہ بھائی کھڑے ہیں!

اب باہر کی طرف مڑنا چاہتا ہوں تو میری آنکھیں دیکھتی ہیں ___ پیشاب گھر فلش سسٹم کا ہے۔ اور تیسری جگہ کے اُوپر لگی ہے پانی کی ٹنکی، جس میں لٹک رہی ہے زنجیر۔ اس زنجیر میں ایک گول کڑا جھول رہا ہے، جس میں دو اُنگلی ڈال کر ذرا جھٹکا دیں کہ بس بچاسوں شور اخول سے بہہ نکلے پانی ہی پانی ___ اور بدبُو اس طرح سے بھاگے جیسے ہندوستان سے انگریز!

اُب میرے پاؤں رُک گئے۔ اُن پانچوں پائپوں کو مَیں دیکھ رہا ہوں۔ پانچ کے پانچ اپنی ناک رومال سے دبائے کھڑے ہیں:

"کیا ٹنکی خراب ہے؟" میرے دِل میں سوال پیدا ہُوا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر زنجیر کو ایک زور کا جھٹکا دِیا۔ پانچوں جگہوں میں بادل کی طرح پانی برس پڑا:

پانی برسا کہ مَیں وہاں سے کھسکا اور پیشاب گھر سے کہ باہر آگیا۔ میرے پیچھے ہی پیچھے آئے ایک سردار جی۔ اُن کی پتلون کے پائنچے نیچے سے بھیگ گئے تھے، بوٹ میں پانی بھر گیا تھا۔ مجھے اُنہوں نے گھُورا کہ اِتنے میں وہ چاروں بھی اندر سے چلے آرہے ہیں۔ چھینٹے تو سب پر پڑے تھے، مگر معلوم ہوتا تھا سردار جی دیوار سے بالکل لگ کر کھڑے تھے، تبھی اُن کی پتلون پوری طرح بھیگ رہی تھی۔ گرج کر بولے —— کیوں جی! آپ نے یہ کیا حماقت کی؟ مَیں اِس وقت لڑنے کے نہیں، ہنسنے کے موڈ میں تھا۔ مُسکرا کر مَیں نے کہا —— "یہ حماقت آپ کی جان بچانے کے لئے کی تھی جناب!"

غرّا کر بولے —— "جان بچانے کے لئے؟"

مَیں نے ایک اور سُوئی چبھوئی —— "آپ رومال سے ناک اِتنے زور سے دبائے ہوئے تھے کہ مجھے آپ کا دم گھٹنے کا خطرہ نظر آنے لگا۔ دم گھٹنے سے جان چلی جاتی ہے!"



ایک دوسرے صاحب درمیان میں ٹپک پڑے۔ پھر آپ کو زنجیر کھینچنا ہی تھا تو آہستہ سے کھینچتے۔ آپ نے تو ایسا جھٹکا مارا کہ جیسے کوئی بڑی مصیبت آگئی ہو!

بزرگانہ لہجے میں مَیں

نے کہا — "ہاں بھائی! مَیں نے بھی سمجھا کہ آپ بڑی مُصیبت میں ہیں" ٭

وُہ سب سمجھ گئے کہ اِس پتھر پہ چونک نہیں لگ سکتی، اور کھسکے۔ اپنی بھیگی پتلون کی طرف دیکھ کر چلتے چلتے سردار جی اپنے ساتھیوں سے بولے — "ایسے جاہل بھی منصُوری آجاتے ہیں" ٭

مَیں نے کہا — "جی ہاں، ایسے ایسے جاہل بھی آجاتے ہیں کہ بدبُو میں مرتے رہتے ہیں، مگر زنجیر نہیں کھینچ سکتے!"

آنکھوں سے کمربان کا کام لیتے ہُوئے سردار جی چلے گئے۔ تو مَیں اندر گھُسا۔ کہیں بدبُو کا نام نہیں تھا۔ پانی کی ہلکی ہلکی بُوندیں اب بھی ٹپک رہی تھیں ٭

سڑک پر چلتے چلتے مَیں سوچنے لگا، اُن سردار صاحب یا دُوسرے آدمیوں کا ہی کیا قصُور تھا؟ اُن سے پہلے نا معلوم کتنے آدمی آچکے تھے۔ وُہ سب اِس بدبُو کے لئے ذمّہ دار تھے، مگر سب اِس کے شکار بھی تھے۔ پیشاب گھر کو سب استعمال کر رہے تھے، مگر اُس کے متعلق کوئی بھی اپنی ذمّہ داری کو محسُوس نہیں کرتا تھا۔ ہماری پست ذہنیت کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب ہم کسی مکان میں اکیلے رہتے ہیں تو اُس کا صحن روز صاف کرتے ہیں، مگر جونہی اُس مکان کے ایک حصّے میں دُوسرا فیملی آجاتا ہے تو وُہی صحن گندا رہنے لگتا ہے، کیونکہ پھر وُہ کسی کا نہیں رہتا!



مُفت خورے

"آپ کے پڑھنے لائق ایک نئی کتاب آئی ہے — لیجئے!" دِلّی کے ایک بُک سیلر نے کتاب پیش کی، تو مَیں نے اپنی جیب دیکھی، مگر پیسے اب کرایہ کے ہی باقی تھے ٭

بُک سیلر سے واقفیت کا فائدہ اُٹھاکر کتاب مَیں نے اُدھار خرید لی اور اسٹیشن چلا آیا۔ اب گاڑی میں بیٹھتے ہی کتاب تھیلے سے باہر۔ لیکن مَیں نے دیباچہ ہی ابھی ختم کیا تھا کہ آ گئے ایک پُرانے دوست اُسی کمرے میں۔ تھوڑی بہت باتیں ہُوئیں کہ دو تین سٹیشن نکل گئے۔ اب مجھے جانا پڑا پیشاب خانے میں!

واپس آکر دیکھتا ہُوں تو وہ دوست کتاب کو بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں۔ مَیں کہتا ہی کیا؟ اور کرتا ہی کیا؟ بس اُنہیں دیکھتا رہا۔ مگر یہ لو، آ گیا اُن کا شہر میرٹھ۔ وہ جلدی سے اُٹھے اور کتاب کو اپنے تھیلے میں رکھ کھڑے ہو گئے۔ مَیں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اُس سے پہلے ہی کہہ رہے تھے ــــ "کتاب واقعی بہت اچھی ہے۔ چار صفحے کیا پڑھے کہ دِل کھب گیا۔ اب آج رات کو پُوری پڑھ کر ہی سوؤں گا"...... "کسی آتے جاتے کے ہاتھ آپ کی کتاب بھیج دُوں گا، یا کسی دن آپ اِدھر آئیں تو لے لیجئے گا"..... پھر اُترتے اُترتے بولے ــــ "واقعی بہت اچھی کتاب ہے بھائی صاحب"!

مَیں کہتا ہی کیوں اور کرتا ہی کیا؟ وہ چلے گئے، تو دِل کو سمجھا کر بیٹھ گیا کہ چلو کوئی بات نہیں، میرا دوست مجھ سے بھی زیادہ شوقین ہے۔ مَیں نے اُدھار لینے میں جھجک محسُوس نہیں کی۔ اُنہوں نے ایک ہی جھپٹ میں اُڑا لے جانے میں جھجک محسُوس نہیں کی ÷

دو ہفتے بعد ایک دوست میرٹھ جا رہے تھے، اُنہیں کتاب لے آنے کو کہا۔ وہ اُن کے گھر گئے، مگر وہ نہ ملے۔ پھر چند روز بعد دُوسرے دوست گئے۔ وہ ملے بھی، مگر کتاب نہ دی۔ مُسکرا کر بولے ــــ "بھائی کتاب تو اُنہیں ہی ملے گی، جب وہ آئیں گے"۔ چلے آئے بچارے ــــ کہتے بھی کیا، اور کرتے بھی کیا؟

کوئی تین مہینے بعد مَیں خود گیا اور قسمت کی بلندی دیکھئے کہ وہ مِل بھی گئے اور دیکھ کر بڑے خوش ہُوئے۔ بات چیت کے بعد مَیں نے کتاب مانگی، تو کھسیا کر بولے ــــ "ارے وہ کتاب تمہیں ابھی تک یاد ہے؟ اور دِل کو سمجھا کر سامنے کی الماری سے کتاب نکال لائے ÷

● مانگی ہُوئی کتاب اکثر واپس نہیں آتی، اور آتی بھی ہے تو خراب ہو کر!

اِس کا علاج؟ اِس کا علاج مہاتما تلک نے بتایا ہے۔ وہ بمبئی سے پُونہ کو چلے تو

اُنہوں نے روزانہ اخبار خریدا۔ وُہ اُس کی مُوٹی سُرخی ابھی دیکھ نہ پائے تھے کہ ایک حضرت بولے ——"ذرا اندر کا وَرق دیجئے گا؟"

تِلک مہاراج نے اپنی جیب سے نکال کر اُن کی طرف بڑھائی —— "لیجئے، آپ دوسرا خرید لیجئے اور مجھے آرام سے پڑھنے دیجئے"۔

جاگو اور جگاؤ (۲)

ایک بار کی بات ہے۔ دِلّی سے الہ آباد جا رہا تھا۔ گاڑی میں سامان رکھوا کر بیٹھ گیا اور راستے میں پڑھنے کے لئے "رہنمائے زندگی" خرید لایا۔ سوچا کہ گاڑی چلے گی تب پڑھنا شروع کروں گا۔ اِتنے میں پاس بیٹھے بابو جی نے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ——"ذرا رسالہ دیجئے گا؟"

مانگا تو، مگر دینے کی راہ نہیں دیکھی، رسالہ اُٹھا لیا۔ اور ناک کے اگلے حصّہ پر بابا آدم کے زمانے کی عینک ٹِکا کر پڑھنا شروع کیا تو ایسے، گویا رسالہ اُنہی کا ہو۔ بڑے اطمینان سے اُس کا ایک ایک صفحہ پڑھنے لگے۔

گاڑی چل دی، اُدھر میرا دھیان بار بار رسالہ کی طرف جانے لگا۔ آخر اِس لئے تو خرید کر لایا نہیں تھا کہ ٹک ٹک دیکھوں اور دُوسرے صاحب اُسے پڑھتے رہیں۔ واہ یہ بھی خُوب رہی!

جب مَیں نے دیکھا کہ جلدی رسالہ واپس کرنے کی اُن کی نیّت نہیں ہے تو مَیں نے جھنجھلا کر کہا —— "رسالہ ......"

اُنہوں نے بات پُوری نہیں ہونے دی۔ رسالہ سے نگاہ ہٹائے بغیر ہی بولے —— "ابھی دیتا ہوں جناب!"

جی میں آیا کہ رسالہ اُن کے ہاتھ سے چھین لُوں مگر کچھ سوچ کر چُپ رہ گیا۔

وہ صاحب حسبِ سابق پڑھنے میں مشغول رہے اور بعد کو اگر رسالہ اُنہوں نے دیا تو اِس لئے نہیں۔ کہ اُنہیں مجھ پر ترس آیا، بلکہ اس لئے کہ غازی آباد آ گیا تھا۔ اور وہاں اُنہیں اُترنا تھا۔ میری طرف رسالہ کو ٹِپک کر بغیر ایک لفظ کہے، اُنہوں نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور

اور ڈبّے سے باہر گئے ؛

اور ـــــ مَیں سوچ رہا تھا کہ ہم آزاد تو ہُوئے مگر شہریت کا پہلا سبق بھی ہم نے ابھی تک نہیں پڑھا ؛

۳

ایک اور واقعہ سُنئے ۔ ناگپور جا رہا تھا ۔ راستے میں پڑھنے کے لئے میں نے ایک کِتاب رکھ لی تھی ، جس کے ۵۰ صفحے پڑھ چکا تھا ، کتاب اِتنی دِلچسپ تھی کہ دِل اِس میں پڑا تھا ۔ سامان جما کر صراحی میں پانی لینے گیا ، آکر دیکھتا کیا ہُوں کہ کتاب پاس بیٹھے ایک صاحب کے ہاتھ میں ہے ۔ مَیں نے حیرانی سے ایک بار اُن کی طرف دیکھا ، پھر صراحی کو سٹینڈ میں لگا کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور اِنتظار کرنے لگا کہ کتاب اَب دیں ، اَب دِیں ، لیکن مَیں نے دیکھا کہ انہوں نے کتاب کو باقاعدہ شروع کر دیا ہے ۔ مَیں نے جھنجھلا کر کہا ـــــ "جناب ، اپنے پڑھنے کے لئے لایا ہُوں" ؛

"اُنہوں نے لاپرواہی کے ساتھ جواب دیا ـــــ "مَیں کب کہتا ہوں ۔ کہ میرے لئے لائے ہیں ، لیکن ذرا ٹھہریئے تو ۔ بڑا لُطف آ رہا ہے ۔ ذرا صبر کیجئے صاحب !"

کتاب زبردستی تو چھینی جا نہیں سکتی تھی ۔ من مار کر رہ گیا ؛

کافی دیر تک اُن کی شرافت کا خاموش اِمتحان لینے کے بعد مَیں نے کہا ـــــ

"میرے حال پر رحم کر کے اَب تو کتاب دے دیجئے" ؛

اُن کے ماتھے پر پانچ چھ تیوڑیاں پڑ گئیں ، بولے ـــــ "بڑی جلدی پڑ رہی ہے آپ کو ، جیسے کتاب کو لے کر مَیں بھاگے جا رہا ہُوں ۔ بھائی صاحب کتاب آخر آپ ہی کی تو ہے ۔ جِتنا جی چاہے ، پڑھیئے ۔ ذرا اِس کے چند صفحے مجُھے بھی اُلٹ لینے دیجئے" ؛

"ضرور اُلٹئے" مَیں نے تھوڑا منہ بنا کر کہا ۔ مگر شائد اُن کا دِل کتاب میں اِتنا لگا تھا کہ میرے طنز کا اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہُوا ، اور وہ کتاب پڑھنے میں بدستور لگے رہے ؛

●○●

دونوں واقعات ظاہراً طور پر معمُولی ہیں ، مگر گہرائی سے دیکھا جائے تو کافی اہمیت رکھتے

رکھتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی سہولیت کے آگے دوسرے کی سہولیت کا خیال نہیں کرتے، اور دوسرے کے ساتھ کتنی بڑی زبردستی کر بیٹھتے ہیں ؛

کہتے ہیں، باہر کے ملکوں میں کوئی کسی کا اخبار نہیں پڑھتا۔ سب اپنا اپنا پرچہ خریدتے ہیں۔ ایک گھر میں کئی کئی اخبار آتے ہیں۔ اس کی بنیاد میں ایک ہی بات ہے، اور وہ یہ کہ وہاں پر ہر ایک شہری چاہتا ہے کہ اس کی آزادی میں خلل واقعہ نہ ہو اور وہ جانتا ہے کہ دوسرے کی آزادی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھ کر ہی اُس کی آزادی برقرار رہ سکتی ہے ؛

ہم میں زیادہ تر لوگ کتابیں رسالے مانگ کر پڑھتے ہیں۔ اور اگر حساب لگا کر دیکھا جائے تو ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نکلے گی۔ جو کتابیں و رسالے اُدھار لے کر کبھی واپس ہی نہیں کرتے۔ امریکہ کے ابراہیم لنکن نے کسی سے ایک بار ایک کتاب پڑھنے کو لی تھی۔ بعد کو وہ کئی ضروری کام چھوڑ کر اُسے مقررہ وقت پر واپس پہنچانے کے لئے کئی میل پیدل گئے۔ بات چھوٹی سی تھی، مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ چھوٹی باتوں میں غیر محتاط رہ کر کوئی بھی انسان بڑا نہیں بن سکتا ؛ (لیش پال جین)

مایا داس

اُس دن دیہاتوں کے بیچ سے ہوتی موٹر بس جا رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ بھارت جیسے لمبے چوڑے دیش کو، اُس کے ہر گاؤں اور قصبے کو ریلوے لائین کے ذریعے جوڑ دینا، تو ایک صدی کے بعد بھی ناممکن ہی رہے گا، لیکن ہم اُسے پکی سڑک کے ذریعے ضرور جوڑ سکتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے ملک میں موٹر ٹرانسپورٹ اور بیوپار دونوں کا ہی مستقبل روشن ہے ؛

اتنے میں ایک اڈے پر موٹر ٹھہری۔ قریب کا گاؤں تو چھوٹا سا ہی ہے۔ مگر دو سڑکوں کا یہ جنکشن ہے۔ اس لئے اڈہ بن گیا ہے۔ میری ہی سیٹ پر ایک صاحب



اپنا اُردو کا روزانہ اخبار پڑھنے
کے بعد اُسے اپنی موٹی ران
کے نیچے دبائے بیٹھے تھے۔
تبھی ایک دیہاتی
لڑکے نے بس میں جھانک کر
دیکھا اور حلیم زبان میں کہا
—— "شرمیان جی! ہمارے
گاؤں میں لائبریری ہے۔
اُس کے لئے اپنا اخبار دے
دو"۔

"آج ہم دے دیں تو
کل کہاں سے آئے گا۔
تمہاری لائبریری میں
اخبار؟" شرمیان جی
نے پوچھا، تو لڑکے نے
کہا —— کل کسی اور بھائی سے لے لیں گے۔ ہم روز اسی طرح کر لیتے ہیں شرمیان جی!"

موزوں سوال کا موزوں جواب تو تھا۔ مگر شرمیان جی بولے —— "اخبار لینا ہے تو دو آنے دو۔" لڑکے نے ہاتھ جوڑے، وہ گڑگڑایا، لیکن شرمیان جی ڈٹے رہے۔

بس چلی، تو آپ ہی آپ بولے —— ہم تو 'بیپاری' ہیں، مال مُفت بانٹنے لگیں، تو ہمارا دیوالہ نکل جائے"۔

سُن کر سوچا —— 'بیپاری' ہے یا نہیں، مگر یہ مایا داس ضرور ہے!

٢

ایک دن بوڑھا چاٹ والا آیا، تو پاس پڑوس کے بچے مجھے لپٹ گئے ——

——— "ہم چاٹ لیں گے، ہم تولیں گے" سب کو چاٹ کھلا دی۔ وہ چاٹ کھاتے رہے، مَیں اُن کی باتوں کا لُطف لیتا رہا مگر دُوسرے دِن بیشتر بچّوں کی طبیعت خراب تھی ؛

پھر ایک دِن بُوڑھا آیا اور مَیں نے اُسے آہستہ آہستہ باتوں پر چڑھایا تو پتہ چلا کہ برسات کے اِس خراب مَوسم میں پہلے دِن چاٹ بکنے سے بچ گئی تھی، اُسے بھی اُس نے دُوسرے دِن کی چاٹ میں مِلا دِیا تھا ؛

مَیں نے سوچا ——— "یہ غریب چاٹ والا بھی، جو دُوسروں کی تندرستی سے اپنے چند پیسوں کو زیادہ اہمیّت دیتا ہے، پُورا مایا داس ہے"!!

دو سنوں کی لڑائی

میرے ایک جگری دوست تھے ——— تھے اِس لیئے کہ اَب وُہ اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔ ہم دونوں آپس میں گھُل مِل گئے تھے کہ دُو ہو کر، دُو دکھائی دے کر بھی دُو نہ تھے ؛

دُنیا کا دستُور ہے کہ ایسا ملاپ اُسے اچھّا نہیں لگتا، اور اِس دُنیا میں ہی کچھ ایسے ہیں، جو مَوقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کب اِن کے دِل کھٹّے ہوں ؛

میرے دوست کی بیوی مر گئی اور ایک لڑکی کے رِشتہ کو لے کر ہم دونوں میں خاصہ کھِچاؤ آ گیا۔ مَیں نے کوشِش بھی کی۔ مگر نہ صرف یہ کہ کھِچاؤ ڈھیلا نہیں پڑا، وہ دِن بدِن اور طُول پکڑتا گیا۔ اَب ہمارا مِلنا جُلنا اور بول چال بھی بند۔ یاروں نے اِس کا فائدہ اُٹھایا اور اُنہیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا ؛

ایک دِن مُعتبر ذرائع سے خبر مِلی کہ وُہ مجھ پر یہ دیوانی دعوےٰ کرنے والے ہیں کہ اُن کی مرحُومہ بیوی نے میرے پاس تین ہزار روپیہ رکھا ہُوا تھا اور اَب وُہ روپیہ مَیں نے مار لیا ہے۔ سُن کر غصّہ بھی آیا، ہنسی بھی آئی ؛

اِتفاق کی بات اُسی دِن شام کو مجھے مِل گئے وہ ——— اور بچ کر، آنکھ بچا کر ایک طرف کو نِکلنے لگے، مگر مَیں یہ مَوقعہ کیوں کھوتا۔ مَیں اُن کے سامنے چلا گیا اور اُنہیں

کندھے سے ہلا کر کہا ـــــ "ارے بھائی، ابھی تو دعوے ہی لکھا گیا ہے، ابھی سے بچکر بِلکنے لگے ـــــ تو آگے کیا کرو گے؟ ہم نے تو یہاں تک کا ارادہ باندھ لیا ہے کہ مقدمہ جم کر لڑیں گے اور تمہیں ہی جیل بھجوا کر ہٹیں گے۔ مگر دوستی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تمہیں جیل ہو جائے، تو میں تمہاری اور تمہاری بچی کی خبر رکھوں اور مجھے جیل ہو جائے تو چھوٹنے کے دن تم ہی دروازے پر ملو۔ مگر تم تو ابھی سے ساتھ چھوڑ رہے ہو!"

یہ سُن کر اُن کا خون جم سا گیا، میرا ہاتھ پکڑ کر بولے ـــــ "گھر تک چلو"۔ اور گھر پہنچتے ہی میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگے۔ میں بھی رو پڑا۔ اور مختصراً بات یہ ہوئی کہ ہم دونوں پہلے کی طرح ایک ہو گئے"۔

آپ بھی اپنے دوستوں میں کبھی اپنی طرف سے لڑائی کی ہوا نہ آنے دیجئے۔ آپ کے کسی دوست کو غصّہ آ ہی گھیرے، تو خود ٹھنڈے رہئیے، بات کو طرح دیجئے، ٹال دیجئے ـــــ اور آپ کو بھی غصّہ آ ہی جائے تو لڑ لیجئے، مگر غصّے کے اترتے ہی دوست کے پاس پہنچئے۔ اور شربت پی کر ہی اٹھیئے۔



ایک آنکھ سے دیکھنے والے

شریمتی کملا دیوی اندر کے کمرے سے باہر صحن میں آ رہی تھیں کہ اُن کا پاؤں راستے میں رکھی بوتل سے ٹکرا گیا۔

بوتل سرسوں کے تیل کی! تیل

بکھر گیا، ناخن میں سخت چوٹ لگی جھنجھلا کر نوکر سے بولی ——"ارے! تو جہاں دیکھتا ہے، وہیں چیز ٹیک دیتا ہے۔ یہ بوتل رکھنے کی جگہ ہے؟ گدھا کہیں کا!"

موقعہ شناس نوکر نے اُن کا پاؤں دبایا، نیل سمیٹا اور غلطی مانی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

دو ہفتے بعد ایک دن نوکر اندر کے کمرے سے باہر صحن میں آرہا تھا کہ اُس کا پاؤں راہ میں رکھی بوتل سے ٹکرا گیا۔ پاؤں میں چوٹ لگی، نیل بکھر گیا۔ بوتل ٹوٹ گئی۔ وہ سنبھل ہی رہا تھا کہ جھنجھلا کر کملا دیوی نے کہا ——"ارے، آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا تیری؟"

نوکر جانتا تھا کہ بوتل آج راستے میں مالکن نے رکھی ہے۔ بولا ——"بی بی جی! میں آنکھیں پھوڑ کر چلتا ہوں مگر آپ ہی راستے میں بوتل کیوں رکھیں؟

اتفاق کی بات، میں دونوں دن وہیں تھا۔ میں نے کہا ——ٹھیک ہے، جب نوکر راستے میں بوتل رکھے، تب چیز کو غلط رکھنے کا اصول مانا جائے —— اور جب وہی کام خود مالکن کرے، تو آنکھیں پھوڑ کر چلنے کا اصول لاگو ہو!"

بات ہنسی کی تھی، ہنسی میں ختم ہو گئی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہم لوگوں میں زور سے یہ مرض پھیل رہا ہے کہ ہر ایک بات کو اپنے زاویہ نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک اخلاقی مرض ہے، جو آدمی کو دماغی طور سے کانا بنا دیتا ہے —— کانا، جس کی ایک آنکھ بد قسمتی سے پھوٹ گئی۔ یا جو ہر سوال کو، ہر سچائی کو ادھورا دیکھتا ہے۔

●

ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رُکی، اندر ڈبے میں چند مسافر، جن میں ایک کا نام "ر" اور ڈبے کے باہر دوسرا مسافر "س"۔ "س" چٹخنی کھول کر اندر آنا چاہتا ہے، مگر "ر" اُسے کہتا ہے ——"ارے بھائی، پیچھے تمام گاڑی خالی پڑی ہے، وہاں کیوں نہیں چلے جاتے!"

"ر" ایک خوبرو جوان ہے —— اُس کی دونوں آنکھیں بہت خوبصورت ہیں، مگر دماغی طور سے وہ کانا ہے، کیونکہ مسافروں کی سہولیت کے سوال کو یہ ادھوری شکل میں ہی دیکھتا ہے۔

ہم "ر" کی برائی کریں گے اور "س" کو ہمدردی کا مستحق قرار دیں گے۔ مگر صرف اگلے

صرف اگلے اسٹیشن تک کیونکہ وہاں مسّی ڈبّے کا دروازہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُوپر چڑھنے مسافروں کو جھنجھوڑتا ہے ـــــ جب پیچھے کے ڈبّے میں جگہ خالی پڑی ہے، تو یہاں کیوں گھُسے آ رہے ہو؟ چڑھنے والے نہیں مانتے تو کہتا ہے ـــــ "ہمارے دیش میں تو بھیڑ چال ہے صاحب، جہاں ایک گھُسے گا، وہیں سب گھُسیں گے"۔

اسی مسّی نے پہلے اسٹیشن پر تر سے کہا تھا ـــــ "ارے! ارے بھائی ڈبّے میں جگہ ہوگی تو بیٹھ جاؤں گا، ورنہ کھڑا رہوں گا۔ تمہارے سر پر تو میں گروں گا نہیں، پھر تمہیں موت کیوں آ رہی ہے!"

آخر تر کی طرح مسّی بھی کانا ہی نکلا۔

●

ایک اور دوست ہیں۔ گھر میں ایک لڑکا ہے، ایک لڑکی۔ لڑکے کی شادی ہوئی تو انہوں نے لڑکی والے سے اُسی طرح روپیہ وصُول کیا، جیسے پولیس والے چور سے چوری کی جانکاری اُگلواتے ہیں۔ جہیز میں اُنہیں اڑھائی ہزار روپے ملے، مگر اُمید تھی پانچ ہزار کی۔ وہ خاموش رہے، مگر دوسرے دن بیٹے نے کہہ دیا کہ یہ تو وہ لڑکی ہی نہیں ہے، جو پہلے دِکھائی تھی، بھلا میں اسے کیسے قبول کر سکتا ہوں! چار پانچ گھنٹے کی رسّہ کشی کے بعد ۲½ ہزار اور مِل گئے، تو لڑکی پسند کی ہو گئی۔

ایک دِن ملے تو میں نے کہا ـــــ "آپ نے تو قصائی کو بھی مات کر دیا خُون نکالنے میں!"

وہ بلا جھجک بولے ـــــ "بغیر دبائے گنّے سے رس کہاں نکلتا ہے بھائی صاحب!"

کوئی تین سال بعد اُنہوں نے اپنی بیٹی کا بیاہ رچایا، تو اِتفاق کی بات، اُنہیں اُن جیسا ہی ناطی مِل گیا۔ ایسا نچوڑا کہ سفید پڑ گئے، اور ایسا شکنجہ لگایا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ شادی کے بعد ایک دِن سماج اور برادری کو کوستے ہُوئے وہ کہہ رہے تھے ـــــ "ہمارے یہاں لڑکی والے کو تو کوئی آدمی ہی نہیں سمجھتا۔ کمبخت مجھے اِس طرح دیکھتا تھا، جیسے میں اُس کے باپ کا قرض دار ہُوں"۔

جی میں آیا، کہہ دُوں! ـــــ تین سال پہلے تو آپ کو گنّے کی مثال پسند تھی بھائی صاحب۔

●

ایک اور دوست ہیں۔ جب مِلتے ہیں، اپنے اکلوتے بیٹے کی شکایت کرتے ہیں ـــــ میری

کوئی بات سنتا ہی نہیں، ہمیشہ اپنے دِل کی کرتا ہے۔ ناک میں دَم ہے پنڈت جی! ایسی اولاد سے تو بے اولاد بھلا!!"

ایک دِن بیٹا مِلا، تو بولا ——— "مَیں تو اُن سے پریشان ہوں پنڈت جی ہمیشہ رٹ لگائے رہتے ہیں کہ یہ مت کرو، وہ مت کرو۔ آخر آپ ہی بتائیے کہ مَیں کوئی بھیڑ بکری ہوں کہ گڈریے کی طرح وہ مجھے ہانکا کریں، وَرنہ مَیں گڑھے میں گر پڑوں گا!"

کوئی نئی بات نہیں سِوا اِس کے کہ دونوں کانے ہیں ——— باپ کو بیٹے کی جوانی دِکھائی نہیں دیتی، تو بیٹا باپ کی بزرگی نہیں دیکھ پاتا!

آپ ہمیشہ دُوسرے کو اُس کی آنکھ سے دیکھئے

اور خبردار رہئیے اُس خطرہ سے، جو دُوربین کو اُلٹی کرکے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔



تین بھلے آدمی

(۱)

مسٹر تیواڑی

بہت ہونہار جوان ہیں۔ کالج میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ——— ہمیشہ فرسٹ آتے ہیں۔ اُن میں ایک کمی ہے کہ سگریٹ بہت پیتے ہیں۔ اِس کا اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ اسے چھوڑنا چاہتے

ہیں، مگر چھوڑ نہیں پاتے ؛

اُس دن رسالہ میں اُنہوں نے پڑھا - "سگریٹ کا زہر پھیپھڑے کو کاٹتا ہے" تو قسم کھائی کہ وہ اب نہ پئیں گے۔ اُنہوں نے ۳ دن تک سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مگر چوتھے روز پکنک میں یار دوست مجبور کرنے لگے، اور وہ پھر سگریٹ پینے لگ پڑے ؛

تیواڑی شادی شدہ ہیں، اُس دن کہہ رہے تھے۔ بیوی ایسی ضدی ہے کہ میری کوئی بات مانتی ہی نہیں۔ سو بار کہا ہر چیز قرینے سے کمرے میں رہنی چاہیئے، مگر وہ اُسے کباڑی کی دکان بنائے رکھتی ہے۔ کئی بار میں اُس سے بولنا چھوڑ چکا، ناراض ہُوا، مگر وہ سنتی ہی نہیں ؛

(۲)

شمس الدین بڑی عُمر کے آدمی ہیں ـــــ کھاتے پیتے اور بھلے آدمی۔ ایک بڑی فرم کے وہ رُوحِ رواں ہیں۔ اس کا سب کام اُن کے ہاتھوں میں ہے۔ سال کے آخر میں جب حساب بنتا ہے تو یہ پریشانی آتی ہے کہ بہت سے واؤچر نہیں ملتے۔ اور کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بل پر لکھا ہُوا ہے، رقم سات تاریخ کو آگئی، مگر کیش بُک میں وہ جمع ہوتی ہے بائیس تاریخ کو۔ یہ سب روز کا حساب روز نہ لکھنے اور فوراً واؤچر نہ بنانے کی سُستی کا نتیجہ ہے ؛

ہر بار شمس الدین صاحب کان پکڑتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں۔ دو چار دن اِس کا اثر بھی پڑتا ہے، کام ٹھیک چلتا ہے، پھر ارادے ہار جاتے ہیں، عادت جیت جاتی ہے ؛

شمس الدین صاحب کا کنبہ بڑا ہے، بیٹے ہیں، پوتے ہیں۔ بیٹیاں ہیں، بہوئیں ہیں۔ سب طرح کا سُکھ ہے، مگر وہ سکھی نہیں ہیں۔ اُنہیں دُکھ ہے کہ کنبے میں کوئی اُن کی نہیں سُنتا۔ وہ چلاتے ہیں، رُوٹھتے ہیں۔ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر پرنالا وہیں پڑتا رہتا ہے ؛

(۳)

پرنسپل ڈیوڈ کی عُمر ۷۰ سال سے کم نہیں، مگر وہ جوانوں سے زیادہ پُھرتیلے ہیں۔ پہلے بہت بیمار رہا کرتے تھے، مگر اب بیماری اُنہیں دیکھ کر دُور بھاگتی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ وہ پہلے بہت شراب پیتے تھے۔ ایک دن کسی ڈاکٹر نے کہا ـــــ "یا تو شراب چھوڑ دو، یا جینے کی اُمید!"

بس وہ چونکتے ہی گئے۔ اور اُسی دن اُنہوں نے شراب کی سب بوتلیں پھوڑ دیں۔ آج تک

اِس کے بعد اُنہوں نے شراب نہیں پی۔ ایک کتاب میں اُنہوں نے پڑھا۔ کہ سویرے اُٹھ کر گھومنا صحت کے لئے مفید ہے۔ وہ صبح دیر تک سویا کرتے تھے۔ اُسی دِن سے ۴ بجے اُٹھنے لگے۔ پھر ایک دن بھی کبھی لیٹ نہیں ہوئے ؛

اُن کے کالج میں تقریباً ساڑھے سات سو لڑکے ہیں —— سب سے بڑا کالج شہر میں اُن ہی کا ہے۔ اور وہی سب سے زیادہ اچھا ہے۔ دوسرے کالجوں میں ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ ہلّہ مچتا ہے۔ مگر اُن کے یہاں تو جو ڈیوڈ نے کہہ دیا، ہوگیا، یہ حال ہے۔ نہ اُن کی بات ٹالنے کی طاقت طلباء میں ہے، نہ پروفیسروں میں ؛

●

یہ تین آدمیوں کی تین تصویریں ہیں۔ مگر اصل میں یہ دو ہی تصویریں ہیں۔ مسٹر تیواڑی اور شمس الدین دو ہو کر بھی ایک ہیں۔ وہ اپنی سب کمزوریوں سے واقف ہیں۔ اُنہیں تسلیم کرتے ہیں۔ اُنہیں دور کرنا بھی چاہتے ہیں، اُس کے لئے تہیّہ کرتے ہیں مگر اُس پر قائم نہیں رہ پاتے۔ پرنسپل ڈیوڈ اپنی کمزوریوں کو پہچانتے ہیں۔ مانتے ہیں، اُنہیں دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے تہیّہ کرتے ہیں۔ اور اس پر مضبوطی سے عمل کرتے ہیں ؛

براہِ مہربانی اپنے سے پوچھئے کہ آپ مسٹر تیواڑی اور شمس الدین کی قطار میں ہیں یا ڈیوڈ کی۔ اور ابھی تک اوّل الذکر کی قطار میں ہیں، تو کیا آج سے دوسری قطار میں آنے کا مصمم ارادہ کریں گے؟ اِس فیصلے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو اپنا فیصلہ خود نہیں مانتا، اُس پر قائم نہیں رہتا، دوسرے بھی اس کا فیصلہ نہیں مانتے۔ مسٹر تیواڑی، شمس الدین اور ڈیوڈ کی ناکامی اور کامیابی کا یہی راز ہے ؛

سائیکل رکشا

ابھی اُس دِن ہمارے گہرے دوست بھاسکر راؤ شرما کا ٹیلیفون آیا۔ کہ ذرا آجاؤ۔ میں پیدل ہی اُٹھ کر چل دیا۔ راستے میں پڑا کچہری کا پل۔ اوپر سے سڑک اور نیچے سے ریل جا رہی ہے ؛

پُل پر آیا تو دیکھا، کچھ لوگ سائیکل رکشا میں بیٹھے جا رہے ہیں۔ چڑھائی پر رکشا پیروں سے تو کھینچی نہیں جا سکتی۔ اس لیئے رکشا والا خود پیدل چل کر ہاتھوں سے رکشا کھینچتا ہے۔ رکشا کو ہاتھوں سے کھینچتے دیکھ میرا من گھاٹی میں اُتر گیا اور مَیں نے سوچا کہ یہاں کھڑے ہو کر انسان اور انسان میں فرق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ——— ، دیکھا ؛

• ..... وہ چلی آ رہی ہے ایک رکشا۔ ایک آدمی رکشا میں سوار ہے اور جونہی چڑھائی پر رکشا والا اُترا کہ وہ رکشا میں بیٹھا مسافر بھی اُتر پڑا۔ اب مسافر بھی پیدل اور رکشا والا بھی۔ چار پانچ منٹ میں دونوں پل پر پہنچ گئے اور مسافر پھر رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا ڈھال پر سپاٹے سے دوڑ چلی۔ مَیں نے سوچا۔ یہ مسافر انسان ہے۔ کیونکہ اسے دوسرے کا دُکھ محسوس ہوتا ہے اور یہ دوسرے کے دُکھ کے لیئے اپنا سُکھ چھوڑ سکتا ہے ؛

• ..... وہ چلی آ رہی ہے دوسری رکشا۔ اس میں بھی ایک سوار بیٹھا ہے۔ رکشا والا پیدل رکشا کھینچ رہا ہے۔ اور سوار بھی اُس کے ساتھ ہی کھنچا جا رہا ہے۔ رکشا پل پہ آئی تو سوار بولا ———

"بھائی، بڑی محنت کی کمائی ہے تمہاری" ؛

مَیں نے سوچا۔ یہ سوار بھینسا ہے، جو دوسرے کا دُکھ تو محسوس کرتا ہے مگر اُس کے لیئے اپنے آرام کو نہیں چھوڑ سکتا ؛

• ..... تیسری رکشا بھی سامنے ہی ہے۔ اس میں بھی بیٹھا ہے ایک سوار کافی موٹا تازہ۔ رکشا والا ایک لڑکا ہے، کچی عمر کا، رکشا اُس سے کھنچتی نہیں۔ پسینہ چھوٹ رہا ہے۔ تھک کر اُس نے کہا ——— "لالہ جی ذرا اُتر جاؤ"۔ غرا کر سوار نے کہا ——— "کیوں پیسے نہیں لے گا جو اُتر جاؤں"؟ اور وہ اکڑ کر بیٹھا ہی نہ رہا، ہنسی بھی کرتا رہا۔ "ابے کھینچ ! لگا زور !!"

مَیں نے سوچا ——— "یہ سوار بھیڑیا ہے، جس کے لیئے دوسرے کا درد، دوسرے کا تڑپنا ہی راگ رنگ ہے" ؛

آگے بڑھتے بڑھتے مَیں نے سوچا ——— "انسانوں میں انسان بھی ہیں، بھینسے بھی، اور بھیڑیئے بھی۔ مہربانی کر کے اپنے دل سے پوچھیئے کہ اس کسوٹی پر پرکھنے کے بعد آپ انسان ہیں، بھینسے ہیں، یا بھیڑیئے ہیں؟ اور آخری دو میں آپ آتے ہیں تو کیا آج سے پہلے نمبر میں آنے کی کوشش شروع کریں گے؟"

(کنہیا لال)



وقت کی قیمت

ایک شخص کافی دیر تک بنجمن فرینکلن کی دکان کے سامنے کھڑا رہا۔ اور آخرکار اُس شخص نے دکان کے ایک کلرک سے دریافت کیا۔ "اس کتاب کے کیا دام ہیں"؟

"ایک ڈالر"۔ کلرک نے جواب دیا۔

"ایک ڈالر! اس میں کچھ رعائت نہیں ہو سکتی"؟

"نہیں"

"گاہک نے تھوڑی دیر ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد پوچھا"۔ کیا مسٹر فرینکلن اندر ہیں"؟

"ہاں ابھی کام میں لگے ہوئے ہیں"۔

"میں ذرا اُن سے ملنا چاہتا ہوں"۔

دکان کے مالک کو بلایا گیا۔ خریدار نے دریافت کیا۔ "مسٹر فرینکلن! آپ اس کتاب کی کم از کم کیا قیمت لیں گے"؟

"سوا ڈالر"!

"سوا ڈالر! ابھی آپ کا کلرک تو ایک ڈالر کہتا تھا"۔

"لیکن، اپنا کام چھوڑ کر آنے میں میرا وقت بھی تو خرچ ہوا ہے"!

"خریدار حیران و ششدر رہ گیا۔ اور اپنی بات چیت کو ختم کرنے کے خیال سے اُس نے پوچھا۔ اچھا آپ اِس کی کم سے کم قیمت بتا دیں، تو مَیں خرید لُوں گا"؛

"ڈیڑھ ڈالر"؛

"واہ، ڈیڑھ ڈالر! ابھی تو آپ سوا ڈالر کہہ رہے تھے"؛

"ہاں۔ مَیں نے وہ قیمت تو اُس وقت ہی کہی تھی۔ اب اِس کتاب کی قیمت ڈیڑھ ڈالر ہوگی۔ اور جُوں جُوں آپ دیر کرتے جائیں گے، آپ کی قیمت بڑھتی جائے گی"؛

گاہک نے جیب سے رقم نکال کر دے دی اور گھر کا راستہ لیا۔ اُسے آج محسُوس ہُوا کہ وقت کتنی بڑی دولت ہے۔ اُسے علمی دُنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دینے والی عظیم شخصیت سے ایک ناقابلِ فراموش سبق مِل گیا تھا؛

ٹائیم ٹیبل

۱۹۲۸ء سے سابرمتی آشرم میں مشترکہ رسوئی گھر (کچن) کا آغاز ہُوا۔ کُل دو سو عورتیں مَرد وہاں کھانا کھاتے تھے۔ رسوئی گھر کی گھنٹی ٹھیک وقت پر بجتی تھی، کسی دِن بھی وقت کی گڑبڑ نہیں ہوتی تھی۔ سارا کام گھڑی کے مطابق چلتا تھا جس طرح کھانے والوں کے لئے گھنٹی بجتی تھی، اُسی طرح پروسنے والوں کے لئے بھی۔ اِس گھنٹی کے بعد پروسنا شروع ہوتا تھا۔ اِس کے بعد جو کوئی کھانے آتا اُسے دُوسری بیٹھک کا انتظار کرنا ہوتا تھا۔ اور تب تک اُنہیں باہر ہی بیٹھنا پڑتا تھا؛

گاندھی جی بھی روز وقت پر وہاں آجاتے تھے۔ ایک دِن دوپہر کو پروسنے کا وقت ہو جانے پر بھی وہ نہیں آئے۔ گھنٹی بجانے والا اُن کی راہ دیکھتا رہا۔ جب دُور سے اُس نے گاندھی جی کو آتے دیکھا تو سوچا، اُن کے نزدیک آجانے پر ہی گھنٹی بجاؤں۔ گاندھی جی کو معلوم ہُوا کہ اُن کی خاطر کھانا پروسنے میں ایک منٹ کی دیر ہوگئی، اور گھنٹی بھی دیر سے بجائی گئی، تو اُنہوں نے گھنٹی بجانے والے سے کہا ——"میرے لئے تم نے کتنے آدمیوں کا وقت

ضائع کیا! اگر میں دیر سے آؤں تو مجھے بھی دوسرے دیر سے آنے والوں کے ساتھ باہر بیٹھنا چاہیئے، لیکن گھنٹی میں ذرا بھی دیر نہیں ہونی چاہیئے ؛

دوسرے دن کھانے کی گھنٹی بجی اور سب آشرم باسی رسوئی گھر پہنچ گئے۔ گاندھی جی بھی اپنی تھالی لئے نکلے، مگر اسی وقت آ گئے کوئی صاحب، اور گاندھی جی کو ان سے کوئی ڈیڑھ منٹ باتیں کرنی پڑیں۔ قاعدہ بن چکا تھا کہ گھنٹی کے ۲ منٹ بعد رسوئی گھر کا دروازہ بند۔ جھپٹے جھپٹے گاندھی جی جونہی گیٹ کے باہر کی سیڑھیوں پر پہنچے، گیٹ کیپر دروازہ بند کرنے کے لئے آ گیا۔ گیٹ کیپر پانچ سیکنڈ بھی رک جاتے تو گاندھی جی گیٹ کے اندر داخل ہو جاتیں۔ مگر وہ رکتے تو آشرم کا قاعدہ ٹوٹتے تو وہ سزاوار ٹھہرے۔ ادھر کوارٹر بتاتے ہوئے ادھر ۲ قہقہے بلند ہوئے۔ ایک قہقہہ گیٹ کیپر کا اور دوسرا گاندھی جی کا ؛

قاعدے کی پابندی کی کتنی اچھی مثال ہے یہ! (اشوا بھائی پٹیل)

کام کا وقت بنام اپنا وقت

اُن دنوں کی بات ہے، جب میں لنڈن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے ایک نئے کیمرہ سے، جس کو میں نے حال ہی میں خریدا تھا، یونہی مشق کر رہا تھا کہ ایک انگریز سڑک پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا ——— "میں تمہارا فوٹو لے سکتا ہوں؟" اس وقت میرے ہاتھ میں چھوٹا سا کیمرہ تھا۔ اس میں ایک بہت ہی تیز لینز لگا ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو بات کی بات میں اس سے بغیر پوچھے ہی اس کا فوٹو اتار لیتا۔ پھر بھی میں نے پہلے اس سے پوچھ لینا ہی مناسب سمجھا ؛

اچھا، اب ذرا اس کا جواب سنئے ——— "آپ ۲ منٹ ٹھہر جائیے۔ ۲ منٹ میں بارہ ۱۲ بج جائیں گے، اور اس وقت میں اپنا دوپہر کا کھانا کھانے جاؤں گا۔ وہ میرا اپنا وقت ہے۔ اس میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا، تب آپ چاہے جتنا وقت شوق سے لے سکتے ہیں"۔ یہاں یہ بتلا دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جواب دینے کے پہلے اس نے اپنی گھڑی کو دیکھ لیا تھا ؛



آفس منیجر

اُدھر ایک دِن ولیم صاحب بھی ولائیت رُوانہ ہو گئے۔ اِتنے بڑے دفتر میں جہاں انگریز ہی انگریز نظر آتے تھے، آزاد ہند کے آزاد باشندے دکھائی دینے لگے۔ ولیم صاحب کی جگہ ایک "دیسی صاحب" آ گئے۔ دفتر کے تمام لوگ ولیم صاحب کی مانند انہیں بھی صاحب ہی کہتے ؛

اِنہوں نے بھی ولیم صاحب کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ کئی باتیں تو وہ نہ اپنا سکے لیکن چند ایک باتوں کو انہوں نے خوب عملی جامہ پہنایا۔ جس کام کو وہ شوق سے کرتے تھے، وہ یہ تھا کہ دفتر میں آتے ہی حاضری کا رجسٹر منگوا لیتے اور جو بھی اس وقت تک نہ آیا ہوتا اُس کی غیر حاضری لگا دیتے۔ چند ہی دِنوں میں انہوں نے رجسٹر کا حُلیہ تک بگاڑ دِیا ہم سب لوگ اِن سے تنگ آ گئے ؛

تنگ آنے کی وجہ تو یہ تھی کہ "صاحب بہادر" خود تو بعض اوقات گھنٹہ گھنٹہ دیر سے آتے اور اُنہیں پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اور کئی دفعہ تو نو بجے آ کر ڈٹ جاتے اور جیسے ہی کلاک ٹن ٹن کر کے دس بجے کی منادی کرتا۔ ایں جناب رجسٹر منگوا لیتے۔ دس میں سے سات اور آٹھ "بابوؤں" کی غیر حاضری لگا دیتے ؛

ولیم صاحب کا زمانہ مجھے ہرگز نہیں بھول سکتا۔ اِدھر گھڑی نے دس بجائے اور اُدھر اُنہوں نے دفتر میں قدم رکھا۔ پانچ سات منٹ سگریٹ وغیرہ پی کمرے کی چہل قدمی کی اور دس بجکر دس منٹ پر رجسٹر حاضری منگوا لیا۔ سات سال میں وہ ایک دِن بھی دیر سے نہ آئے تھے، وقت کے ایسے پابند آدمی کے لئے دُوسروں سے ایسی ہی اُمید رکھنا جائز بھی ہے اور مناسب بھی۔ لیکن اِس "ہندوستانی صاحب" کا کیا حق ہے، کہ خود تو وقت کی مٹی پلید کرے اور اپنے ماتحوں سے پابندی کی اُمید رکھے ؂

(شیام لال)

پبلک سرونٹ



(۱)

۱۹۳۴ء کی ہولی کی بات ہے۔ کچھ غنڈوں نے میری دُکان کا تھڑا توڑ ڈالا۔ اور دُکاندار کا سائن بورڈ جلا دیا۔ کیونکہ اُس نے اُن کو شراب نوشی کے لئے پیسے نہیں دیئے تھے۔ اُن لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرانے کی غرض سے مَیں تھانہ میں رپورٹ لکھوانے گیا۔ میرے ساتھ امریکہ سے لَوٹے ہُوئے میرے ایک دوست بھی تھے۔ کوتوال صاحب میز کُرسی لگائے کُلاہ باندھے اور مونچھوں کو تاؤ دیئے بیٹھے تھے۔ ہم نے جاکر رپورٹ لکھنے کو کہا۔ اُنہوں نے کچھ دھیان نہ دیا۔ ہم آدھ گھنٹہ کھڑے رہے، مگر اُن کے مُنہ سے اِتنا بھی نہ نکلا کہ بیٹھ جائیے، مَیں ٹھہر کر رپورٹ لکھتا ہُوں۔ تب ہم نے دوبارہ بڑی عاجزی کے ساتھ اُن سے رپورٹ لکھنے کی درخواست کی۔ اِس پر آپ کڑک کر بولے ——— "مَیں تمہیں گیارہ برس کے لئے جیل میں بھجوا دُوں گا۔ فضول میں جھُوٹی رپورٹیں کرنے چلے آتے ہیں"۔

میں نے کہا ——— "آپ نے ابھی ہماری رپورٹ تو سُنی ہی نہیں۔ جھوٹی پہلے ہی کہنے لگ گئے ہیں"۔ تب تو آپ اور بھی بگڑ گئے اور بولے ——— "میرا سر نہ کھاؤ۔ اور بھی کام ہیں"۔ اس پر میرے دوست نے اُن سے انگریزی میں کہا ——— "آپ کو اس طرح بگڑ کر بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر آپ رپورٹ لکھنا نہیں چاہتے تو نہ لکھیے"۔ اب کوتوال صاحب کا پارہ کچھ نیچے اترا اور بولے ——— "اچھا، جائیے منشی کو رپورٹ لکھوا دیجئے"۔ تب ہم منشی کے پاس گئے، وہ بھی ٹال مٹول کرنے لگا۔ کوئی ایک آدھ گھنٹہ انتظار کر کے ہم تنگ آ گئے۔ تب ہم نے اُسے کچھ زور سے کہا ——— "لکھنا ہو تو لکھو، نہیں تو صاف جواب دو"۔ اس پر وہ بڑے رُوکھے لہجہ میں بولا ——— "تم بڑے جلدی کرنے والے آ گئے ہو۔ یہاں تو لوگ رپورٹ لکھانے کے لئے چار چار گھنٹے بیٹھے رہتے ہیں"۔ ہم نے کہا ——— "چار گھنٹے بیٹھنے والے کوئی دُوسرے ہوں گے، ہم تو جاتے ہیں"۔ اتنا کہہ کر ہم تھانہ سے چلے آئے۔ گھر آ کر میں نے انگریزی میں رپورٹ لکھ کر آدمی کے ہاتھ کوتوالی میں بھیج دی۔

(۲)

اسی طرح لاہور ہائیکورٹ کے ایک جج صاحب کے ہاں چوری ہو گئی۔ وہ سویرے معمولی کپڑوں میں ہی اُس کی رپورٹ لکھانے پولیس چوکی میں گئے مگر چوکی کے منشی نے اُنہیں ڈانٹ کر کہا ——— "جا، اُدھر جا کر بیٹھ جا۔ ابھی سُورج نکلا نہیں۔ یہ پہلے ہی آ گیا ہے، جیسے ہمیں اور کام ہی نہیں"۔ جج صاحب کوئی ایک آدھ گھنٹہ کھڑے رہے، لیکن منشی نے اُن کی بات تک نہ پوچھی۔ تب اُنہوں نے پھر اُس سے رپورٹ لکھنے کو کہا، مگر وہ پھر اُسی تحکمانہ لہجہ میں کڑک کر اُنہیں دھمکانے لگا۔ اتنے میں منشی کا افسر آ گیا۔ منشی سے اُس نے پوچھا ——— "کیا بات ہے؟" منشی نے کہا ——— "جی کیا بتائیں؟ یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں۔ ابھی سویرا نہیں ہُوا ——— یہ پہلے ہی آ مرا ہے۔ اس سے کہا ہے۔ کہ ذرا ٹھہر، رپورٹ لکھ لیتے ہیں، مگر یہ دم ہی نہیں لینے دیتا۔ جلدی کرو، جلدی کرو، کہہ رہا ہے"۔ اس پر منشی کا افسر جج صاحب سے بولا ——— "ہم لوگ تمہارے باپ کے نوکر ہیں۔ جو سویرے سویرے ہی یہاں دَوڑے چلے آتے ہو، ذرا ٹھہر جاؤ، رپورٹ لکھے لیتے ہیں"۔ جج صاحب چپ رہ گئے۔ کچھ دیر بعد اُنہوں نے پھر منشی کے افسر سے رپورٹ لکھنے کو کہا۔ اس پر وہ بڑا احسان جتلاتا ہُوا بڑے رُوکھے لہجہ میں بولا ——— "لکھاؤ، کیا لکھاتے ہو؟ بار بار کہنے پر بھی تم ٹلنے والے تھوڑے ہی ہو"۔ اب

جج صاحب رپورٹ لکھانے لگے منشی نے پوچھا ——"تمہارا نام"؟ جج صاحب نے بتا دیا۔ باپ کا نام؟ جج صاحب نے وہ بھی بتا دیا۔ اور منشی نے لکھ لیا۔ پھر اُس نے پوچھا ——"کیا کام کرتے ہو"؟ جج صاحب نے کہا ——"ہائیکورٹ کا جج ہوں"۔ بس اتنا سنتے ہی منشی اور اُس کے افسر کے ہوش اُڑ گئے۔ دونوں نے جج صاحب کے پاؤں پکڑ لئے کہ ہمیں معاف کیجئے، ہماری جان بخشئے، ہم سے بھاری غلطی ہوئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اس واقعہ کا پتہ بڑے پولیس افسروں کو لگنے پر وہ دونوں موقوف کر دیئے گئے؛

(۳)

آپ کچہری جائیے، ہسپتال جائیے، وہاں کے اردلی، چپڑاسی، منشی آپ سے اس طرح سلوک کریں گے اور آپ پر اس طرح رُعب جمائیں گے، گویا وہ آپ کے افسر ہیں۔ ریلوے بکنگ آفس پر جا کر بابو سے ٹکٹ مانگئے، ڈاک خانہ میں منی آرڈر کرانے جائیے، یہ لوگ آپ کے ساتھ ایسی بے رُخی سے پیش آئیں گے، جیسے آپ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں؛

افسوس کہ پبلک ان کے غیر مہذبانہ سلوک کے خلاف پروٹسٹ نہ کر کے اُسے چُپ چاپ سہہ لیتی ہے۔ اگر کچھ ہمتی اصحاب موزوں ڈھنگ سے شکایت کریں تو یہ غیر شائستگی، یہ بدسلوکی بہت کچھ بند ہو سکتی ہے۔ شکایت کے الفاظ جتنے تھوڑے ہوں اُتنا ہی اچھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بدسلوکی کرنے والے، کانسٹیبل، کلرک، منشی، اردلی، یا بابو کو ٹانٹ چکیر کو یہ یاد دلانا ہے کہ ہم نے تمہاری بدسلوکی کو بہت بُرا مانا ہے۔ اور آئندہ ہم اسے چُپ چاپ برداشت نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص نہ صرف آپ کے ساتھ، بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی زیادہ شائستگی کا سلوک کرنے لگے گا؛ (سنت رام بی۔ اے)

پچھلے سال میں نے "رہنمائے صحت" منگائی تھی جو میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی ہیں نے آنکھوں کا علاج آپ کی کتابوں کی ورزشوں کے ہی ذریعہ کیا ہے۔ پہلے میں سیاہ بورڈ پر لکھے سفید حروف نہیں پڑھ سکتا تھا، مگر اب اچھی طرح پڑھ لیتا ہوں۔ اگر اس کتاب کو آب حیات کہا جائے تو نہائیت موزوں ہے؛ (بی۔ ایس سنت سنگھی۔ آگرہ)



کتنا خود غرض!

رائے چھوٹے لال ہمارے شہر میں مصنف تھے۔ ایک بھلے افسر تھے۔ پبلک میں حصہ لینے کی وجہ سے ہر دلعزیز بھی تھے۔ تھوڑی سی بیماری کے بعد اچانک دل کی حرکت بند ہونے سے اُن کی موت ہو گئی۔ اُن کی ارتھی کے ساتھ جنتا ہزاروں کی تعداد میں تھی۔ میں بھی شامل ہو گیا تھا۔ چِتا سُلگ چکی، اُس کی لپٹیں اُوپر تک آسمان میں لپک رہی تھیں۔ چِتا کی گرمی دُور تک محسوس کی جا رہی تھی۔ اُس گرمی سے بچ کر لوگ چِتا سے دُور درختوں کے سایہ میں، ٹین کے شیڈ کے نیچے یا کسی دیوار کی آڑ میں، جہاں کہیں دھوپ سے بچاؤ ہو سکے، اِسی انتظار میں بیٹھے تھے، کہ چِتا جل چکے تو وہ اپنے اپنے گھر کا راستہ لیں۔ میں بھی اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں چُپ چاپ بیٹھا ہُوا زمین پر ایک تنکے سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اُسی وقت قریب کے ایک سجن شاید مجھے پہچان کر میری طرف آئے اور پاس آکر اُنہوں نے نمسکار کیا۔ میں نے اپنی یادداشت پر جہاں تک ہو سکا، زور ڈالا، مگر پوری کوشش کے بعد بھی پہچاننے میں ناکام ہی رہا۔

یہ صحیح ہے کہ میں نے اُنہیں نہیں پہچانا، لیکن اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ جس نے نمسکار کیا ہے۔ اُس سے کچھ نہ کچھ بات چیت کی جائے، اور اُس کی خیر و عافیت دریافت کی جائے۔ اخلاق کا یہ تقاضا پُورا کرنے کے لئے میں نے سوال پھینک دیا ——— "کہیئے ٹھیک تو ہو، خوش تو ہو!"

کسی ناواقف شخص سے اِس سے کچھ زیادہ پوچھا بھی نہیں جا سکتا۔ اُس نے بہت دھیمی

آواز میں جواب دیا ——— "نہیں جی، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اب کام کاج کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔ کسی دوسرے کاروبار کی تلاش میں ہوں"۔

"بھئی بتاؤ تو سہی کہ ایسی کونسی مشکل تمہارے سامنے آپڑی ہے، جس کے حل کرنے میں تم دِقّت محسوس کر رہے ہو؟ ممکن ہے، مَیں تمہاری کچھ سیوا کر سکوں"۔

میرے اِس سوال کے جواب میں اُس ناواقف دوست نے جو کچھ کہا، اُس کو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ اُس کے اس جواب میں اِنسان کی خودغرضی اپنی ننگی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔ جواب دیتے وقت اُس کا چہرہ ایسا بگڑ رہا تھا، گویا مہینوں سے وہ کسی بیماری میں پھنسا ہُوا ہے۔ بڑے ہی دردبھرے لہجہ میں دونوں ہاتھوں کو میرے سامنے تھوڑا آگے کر کے اور کچھ پھیلاتے ہُوئے اس نے کہا ——— "جناب کیا بتاؤں! کچھ دن پہلے انفلوئینزا کی بیماری بڑے زوروں پر تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ روزانہ تقریباً چار یا پانچ سو مُردے آتے تھے"۔

مَیں نے سوچا کہ شاید اِسی بیماری میں اِس کا اکلوتا بیٹا، چھوٹا یا بڑا بھائی، باپ یا چاچا، جو کہ گھر کا کاروبار سنبھالنے والا تھا، جاتا رہا ہوگا۔ اَور اِسی لئے یہ دُکھی ہے۔ مَیں ان خیالات میں ڈوبا ہُوا تھا کہ اُس نے اپنی تقریر جاری رکھی ———۔

اِس گھاٹ پر ۳۰ یا ۴۰ اَرتھیاں آ ہی جاتی تھیں۔ کاروبار اچھّا چل رہا تھا۔ تین ساڑھے تین سو من لکڑی بک جاتی تھی۔ اَب کیا ہے؟ دِن بھر مکھیاں مارتا بیٹھا ہوں۔ مُشکل سے دو چار مُردے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیس پچیس من سے اُوپر بکری نہیں ہوتی۔ کہاں تین ساڑھے تین سو من! اور کہاں بیس پچیس من۔ اِسی سے آپ ہمارے حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں"۔

یہ خودغرضانہ جذبہ دیکھ کر مَیں دنگ رہ گیا۔ شمشان میں لکڑی کی دُکان لگا کر بیٹھا ہُوا یہ لکڑ ہارے کی خودغرضانہ ذہنیّت کو دیکھ کر میرے دِل میں ایک ہی سوال اُٹھا ——— "ہنسُوں یا روؤں؟"

(روناتنگ راؤ)



میں حیران رہ گیا

مَیں اپنی بہن کے مرتک سنسکار سے فارغ ہو کر راولپنڈی سے لاہور آ رہا تھا کہ لالہ موسےٰ ریلوے اسٹیشن پر کچھ شور سا سُنائی دیا۔ مَیں اپنے ڈبے میں سویا ہُوا تھا، کہ اِس آواز سے چونک پڑا۔ ایک ریلوے قُلی ایک عورت سے جھگڑ رہا تھا۔ عورت کے پاس ایک سُوٹ کیس، ایک چھوٹا سا بکس اور ایک بستر تھا۔ اِس کیلئے وُہ قُلی کو تین آنے دے رہی تھی مگر قُلی چار آنے کیلئے اِصرار کر رہا تھا۔ بارہ یا ایک بجے رات کا وقت تھا۔ قُلی اور عورت کا جھگڑا ہر ایک مُسافر کی دِلچسپی کا باعث بنا ہُوا تھا۔ بعض مُسافر تو خاموشی سے سُن رہے تھے۔ بعض نیم دِل سے عورت کی حمایت کرتے اور بعض بڑی صفائی سے اِسکے چہرہ پر نگاہ ڈال لیتے۔ چند ایک کہہ رہے تھے کہ یہ عورت بڑی بے حیا ہے، جو دُوسروں کے سامنے زور زور سے بول رہی ہے ——— مَیں اپنی نشست پر لیٹا ہُوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قُلی کا رویہ مُجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ مَیں تیزی سے اُٹھا اور قُلی کو کمرے سے نکالتے ہُوئے کہا کہ تمہیں جھگڑنے کا کوئی حق نہیں۔ اِسکی جائز مزدُوری مِل گئی ہے اور اب تو خواہ مخواہ تنگ کر رہا ہے۔ قُلی نے مجھے گالی دی۔ عورت نے یہ دیکھتے ہُوئے کہ ایک اجنبی مرد کی بے عزتی ہو رہی ہے۔ ایک آنہ جیب سے نکالا اور قُلی کو دینے والی تھی کہ مَیں نے اُس کا ہاتھ روک دیا۔ اور قُلی کو تھپڑ لگا کر کہا کہ اگر آپ کے زبان درازی کی تو پولیس کو

رپورٹ کر دوں گا ——— قلی گھبرا گیا اور یہ بڑبڑاتے ہوئے کہ "عورت کا ہر کوئی ہمدرد ہو جاتا ہے" تیزی سے غائب ہو گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور عورت کو ازراہِ ہمدردی پوچھا کہ اُسے کوئی اور دقت تو نہیں"۔

اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور میں پھر اپنی سیٹ پر لیٹ رہا۔

ٹرین چلی تو میرے ساتھ والا مسافر دوسرے کو کہہ رہا تھا۔ "معلوم ہوتا ہے دونوں کی آنکھ لڑ گئی ہے۔ اب یہ ضرور اس عورت کو پھانسنے کی کوشش کرے گا"۔

دوسرے نے چپکے سے کہا ——— "پھانسنے میں کامیاب ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک عورت کی اس طرح حمایت کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے"۔

میں حیران رہ گیا۔ سوچا۔ کیا یہی ہے عورت کے متعلق ہمارے سماج کی ذہنیت؟



خواہ مخواہ

(۱)

ریلوے کے ایک جنکشن پر ایک خاتون نے اپنے جیٹھ کو آ کے ملنا اور پھر اس کے ساتھ ہی آگے سفر کرنا تھا۔ جیٹھ نے اپنے گھر کے رواج کے مطابق چھوٹی بھاوج کو گلے لگا کے اس کے سر پہ پیار دیا۔ اور پھر اپنے ساتھ والے زنانے ڈبے میں بٹھا دیا۔ ایک بزرگ عورت نے دریافت

کیا۔ "یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟" "جیٹھ"۔ سُن کر وہ ہاتھ ملنے لگی اور اِس بے چاری کو کئی طعنے دیئے۔ جیٹھ جب بھی کسی سٹیشن پر کوئی ضرورت وغیرہ کے متعلق پُوچھنے آتا تو وہ بہت پریشان ہو جاتی۔ کیونکہ وہ بوڑھی عورت اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتی جس سے اُس کا خون خشک ہو جاتا۔ سردی کا موسم تھا۔ ایک سٹیشن پر جیٹھ کمبل دینے آیا لیکن بھاوج کی جان اجیرن ہو رہی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی کمبل لینے سے انکار کر دیا، اور سردی سے کانپتے رہنا قبول کیا۔ لیکن پھر بھی وہ بوڑھی عورت کہتی رہی "دیکھو جی غضب خدا کا۔ خاوندوں کے ساتھ بھی کوئی اتنی آزادی نہیں لیتا! اگر میری بہو ہو تو مَیں چوٹی کاٹ ڈالوں"۔

جیٹھ کی حیثیت کے متعلق اِتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔ کہ وہ اوّل درجے میں سفر کر رہے تھے۔

(۲)

ایک بہو اپنے سُسر کے ہمراہ سفر کر رہی تھی۔ سُسر کی عُمر ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ اور وہ پندرہ سو روپیہ ماہوار کی ملازمت سے پنشن یافتہ تھا۔ بہو اعلےٰ تعلیم یافتہ اور ایک عزیز سی لڑکی تھی۔ اِس لئے خُسر کو اُس کے آرام کا خاص خیال تھا اور وہ کئی سٹیشنوں پر بہو کی ضروریات کے متعلق پُوچھنے کے لئے آتا تھا۔ کیونکہ شادی ہُوئے ابھی چند ہی مہینے ہُوئے تھے۔ بہو اپنے خُسر سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ ساتھ بیٹھی عورتوں نے آپس میں کانا پھُوسی شروع کر دی:۔

"والدین نے کتنا ظُلم کیا ہے"۔ "لڑکی کی عُمر تباہ کر دی ہے"۔ "صحت چاہے کتنی اچھی ہو عُمر تو ساٹھ سے ہرگز کم نہ ہو گی"۔ اور اسی طرح کی کئی اور باتیں ہوتی رہیں۔

لیکن چونکہ یہ لڑکی اچھی تعلیم یافتہ تھی۔ اِس لئے کبیدہ خاطر ہونے کی بجائے ان عورتوں کی غلط فہمی کا لطف اُٹھاتی رہی۔ اور جب کسی نے سیدھا ہی سوال کر دیا، یا بہت زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا تو اُس نے اپنا رشتہ بتا دیا۔

دراصل بات یہ ہے کہ دُوسروں کے معاملات میں دخل دینے والے اپنی پارسائی سے مجبور ہو کر اِس قسم کا وطیرہ اختیار نہیں کرتے بلکہ یہ اُن کا اپنا دبا ہُوا جنسی احساس ہوتا ہے۔ جو



پارسائی کا جامہ پہن کر ظاہر ہونا چاہتا ہے۔ اور انہیں خود بھی اس حقیقت کا علم نہیں ہوتا ؛

روز کا واقعہ

دس بج چکے تھے، کلکتہ کے دفتروں کے بابوؤں اور کالجوں کے طلباء سے "بس" ٹھساٹھس بھری ہوئی تھی۔ کنڈکٹر چلا رہا تھا۔۔ شیام بازار ۔۔ کالج سٹریٹ ۔۔۔ دھرم تلا !

"ذرا روک لینا بھیا"۔ ایک بڑھیا بڑی مشکل سے "بس" پر چڑھی۔ وہ بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ بس چل دی۔ ٹن ! ٹن !! ٹن !!! ۔۔۔

"بس کو ٹھہرنے کی فرصت کہاں تھی ؛

بیچاری بڑھیا، بس کے دھکے سے ایک بھلے آدمی پر جا گری" ؛

"اندھی ہے کیا" ؟ بھلے آدمی نے اُسے زور سے دھکا دیا ؛

شرما کر بڑھیا نے کہا۔ "بابو ذرا جگہ مل جائے" ؛

"اِدھر نہیں، اُدھر جاؤ"۔ بھلے آدمی نے سنجیدگی سے کہا ؛

بڑھیا کو بخار چڑھا تھا، وہ کانپ رہی تھی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھرتی رہی، مگر سب جگہ سے اسی طرح کا جواب ملنے پر وہ نیچے ہی بیٹھ گئی۔ ایک مسافر نے

"بس" سے اُترتے وقت اُس کا پاؤں کچل دیا۔ وہ چیخ اُٹھی۔ کئی اُس کو دھکا دیتے ہوئے چلے گئے۔ بچاری کر ہی کیا سکتی تھی، اور پھر کس کو اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت تھی؟

(۲)

ایک دم "بس" ایک دھکے کے ساتھ ایسی رکی، گویا چلنا جانتی ہی نہیں ہے۔ عام مسافروں کے لئے وہ اس طرح کبھی نہیں رکتی ؛

"بس" میں چڑھی ایک دبلی پتلی خوبصورت جوان لڑکی ؛

"بس" میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لیکن لڑکی کے چڑھتے ہی ہلچل مچ گئی۔ دس بارہ آدمی ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے، اُس کو جگہ دینے کے لئے ؛

"تھینکس" کہہ کر لڑکی نے ایک شخص کی جگہ پر قبضہ جما لیا۔ باقی سب آدمی کھڑے ہو گئے تھے۔ مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ صرف ایک ہی بابو کے چہرہ پر فتح کی جھلک دوڑ رہی تھی۔ اب سب کی آنکھیں اُس لال ساڑھی کی طرف تھیں ؛

(۳)

"دھرم تلا"۔۔۔۔ کنڈکٹر نے پکارا ؛

وہ بابو، جو اب تک اپنے فاتحانہ غرور میں مست تھے، گویا چونک پڑے۔ دھرم تلا اتنی جلدی آ جائے گا، اس بات کی انہیں اُمید نہیں تھی۔ مجبوراً اُترنا پڑا، مگر جانے سے پہلے انہوں نے اپنی آنکھوں کو ایک بار پھر ٹھنڈا کر لیا ؛

"ذرا روک لو بھیا"۔ بڑھیا اُترنے کے لئے اُٹھی ؛

"ٹھیک ہے جاؤ"۔۔۔۔ کنڈکٹر نے کہا ؛

بڑھیا گرتے گرتے بچی۔ بڑھیا کے لئے کنڈکٹر نے گاڑی کو زیادہ روکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کچھ مسافر بڑھیا کی اس حالت پر ہنسنے لگے۔۔۔۔ "بالکل گنوار ہے" ؛

"ان کو تو "بس" پر چڑھنا ہی نہیں چاہیئے" ؛

(۴)

"بس" تیزی سے جا رہی تھی۔ "روک کر، زنانہ اُترے گی"۔ کنڈیکٹر نے پکارا ؛

"بس" بالکل ڈیڈ سٹاپ ہو کر رُکی ؛

"سُندری اُتر گئی! اور ساتھ ساتھ اور بہت سے اُترے، جنہیں وہاں اُترنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ؛

"بس" پھر چلنے لگی اور مسافروں میں سُندری کی چرچا ہونے لگی ؛

ایک نے کہا ——"بڑی سمارٹ لڑکی تھی" ؛

نئی سپرٹ



اگست کی اُداس دوپہر تھی۔ مَیں نے وقت کاٹنے کے لئے "تخلیہ" پڑھنا شروع کیا تھا۔ اَب تو اُس ناول کے تیسرے باب میں ڈوب ہی گیا تھا کہ کپُور آ پہنچا۔ کپُور، پشاور سپورٹس کمپنی کے منیجر مسٹر کرشن چندر کپور، میرے اُن دوستوں میں سے تھے، جن کی دوستی پر مجھے ناز تھا، بھروسہ تھا، خوشی تھی۔

"سُنتے ہو! مَیں تمہیں ایک تکلیف دینے آیا ہوں"۔ کپُور نے کہا۔

"بولو!"

"تم تو جانتے ہی ہو کہ اگلی ۷ تاریخ کو میری چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ تم نے اُس میں شریک ہونے کا وعدہ بھی کیا ہے...."

"تو مَیں اِنکار کب کر رہا ہُوں؟" مَیں بیچ ہی میں بول اُٹھا۔

"اِنکار کیوں کرو گے، تمہیں تو کچھ اَور کرنا ہے۔ سُنو، اَب شادی میں محض ۵ ہی دِن رہ گئے اَور شادی کی تیاری مجھے خود ہی کرنا ہے، اس لئے مَیں تو چھٹی لے کر کل ہی جا رہا ہُوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ مَیں اپنی بیوی اَور بچّے کو ساتھ نہیں لے جا سکوں گا! بچّے کا اِمتحان اگلے منگلوار کو ہے، اِس لئے خواہ مخواہ بیوی اَور بچّے کو ابھی یہاں ہی چھوڑ جانا پڑیگا۔ تُم شادی کے دو چار دِن پہلے آؤ گے ہی، اِنہیں ساتھ لیتے آنا"۔

مَیں دِل میں سوچنے لگا، اِس بلا کو کیسے ٹالوں کہ کپُور بول اُٹھا۔ "بہانہ تلاش کرنے کی تکلیف نہ کرو۔ کسی اَور سے یہ کام ہو سکتا تو تمہیں تکلیف نہ دیتا"۔ لاچار ماننا ہی پڑا۔

اور مقررہ تاریخ کو میں، بھابی (مسز کپور) اور اُن کے بچے کے ساتھ پشاور کے لئے روانہ ہوگیا۔ پنجاب کی طرف میرا یہ پہلا سفر تھا ؛

نو بجے رات کو ہم لوگ بٹھنڈہ پہنچے، گاڑی یہاں کافی دیر تک ٹھہرتی تھی۔ اس لئے یہیں کھانا لینے کی رائے پکی ہوئی۔ میں بچے کو ساتھ لے کر پلیٹ فارم کے باہر پوری مٹھائی لینے چلا گیا۔ بھابی ویٹنگ رُوم کے پاس ایک بنچ پر بیٹھ رہیں ؛

پوری مٹھائی لے کر بیس پچیس منٹ کے بعد جب میں آیا تو یہ دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہوگئے کہ بھابی ایک نوجوان کو چپل سے پیٹ رہی تھیں، اور پاس کھڑے کچھ لوگ "جانے دیجئے" کہہ رہے تھے۔ میں دوڑ کر پاس پہنچا تو بھابی سے معلوم ہوا۔ اس غنڈے نوجوان نے پہلے تو بھابی کو کئی طرح کے اشارے کیئے، جب اس پر وہ ذرا بھی مخاطب نہیں ہوئیں تو وہ چلا گیا۔ دو ہی منٹ بعد وہ پھر آیا اور بھابی سے کہنے لگا: "آپ کے ساتھ جو بابو ہیں، وہ باہر آپ کو بلا رہے ہیں، چلئے"۔ بھابی کو اُس کی نیت سمجھتے دیر نہ لگی۔ اُنہوں نے چپل نکال لیا اور اُس کی پوجا شروع کر دی۔ اُس غنڈے پر چاروں طرف سے پھٹکار کی بوچھار ہو رہی تھی اور اُسے کافی چپل بھی لگ چکے تھے۔ اِس لئے اُسے چھوڑ دیا گیا۔ وہ نیچا سر کیے چلا گیا، اور بھابی کی اس بہادری سے میں تو پھول اُٹھا ؛

"خوب کیا بھابی!" میں نے خوش ہو کر کہا ؛

"اور کرتی ہی کیا بھیا!" اپنے سر کے گھونگھٹ کو ٹھیک کرتی ہوئی بھابی بولیں ——"میں ابلا ٹھہری، نہیں تو دکھا دیتی" ؛

"ابلا؟ ہاں ابلا! کاش بھارت کی سبھی ناریاں تمہاری ہی جیسی ابلا ہوتیں بھابی!"

(مظلوم کیدنضلوی)

(۲)

چند روز ہوئے، میں شام کے وقت ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ ایک غنڈہ ایک نوجوان عورت کے پیچھے لگا تھا، جو کبھی اُس کے آگے ہو جاتا، کبھی پیچھے۔ کبھی اشارے کرتا اور کبھی زور سے کھانستا۔ وہ عورت اس کی حرکات کو دیکھ رہی تھی، مگر عزت کے مارے



بول نہیں سکتی تھی - ہمارے سماج نے اُس کے مُنہ پر تالا لگا رکھا تھا، اگر وہ عزّت کے لیئے بولتی ہے، تو اُسے بے شرم کہا جاتا ہے - مُجھ سے یہ نہ دیکھا گیا - مَیں نے حلیمی سے کہا - "بہن! تم نے اِس پاجی کو دیکھا - اُس کے اِشاروں کو سمجھا"؟ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی - اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا - میرے دِل میں آگ لگ رہی تھی کہ آہ! یہ وہ ناری ہے، جسے کمر میں کٹار باندھ کر نڈر ہو کر گھومنا چاہیئے تھا اگر کسی نے اِس کی طرف بُری نظر سے دیکھا، کہ اِس نے آنکھیں نکال لیں!

ہم دونوں کے سامنے بے شرم نوجوان ابھی تک کھڑا تھا - جو گھور گھور کر ہمیں دیکھ رہا تھا - مَیں نے جھٹ کہا - "دیکھتی کیا ہو؟ اِسے پکڑ لو اور اِس کی مرمت کر ڈالو - یہ کام تمہارے کرنے سے ہی ہو گا - جو بُرائی آج تک کوئی نہیں روک سکا، وہ تم روک سکتی ہو"۔

میری بات اُس کے دِل لگ گئی - اُس نے نوجوان کو للکار کر پکڑ لیا - عورت میں دِل بھی تھا اور طاقت بھی موجود تھی، مگر وہ سو رہی تھی - مَیں نے دونوں کو جگا دِیا - دو چار تھپڑ پڑے، وہ بھاگا، شور مچ گیا، بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے - مَیں نے اُس بہن کو جلد وہاں سے نکل جانے کو کہا۔

اِس واقعہ کے چند روز بعد وہ پھر نیلا گنبد کے قریب مجھے ملی، وہ مجھے پہچان گئی - اور شکر گذاری کے لہجہ میں بولی - "آپ نے اچھا گر بتا دِیا - پہلے ہم ڈرتی ڈرتی بازار نکلتی تھیں - اب بے خوف ہو کر جاتی ہیں - کیا مجال کوئی آنکھ اُٹھا سکے"۔ یہاں تک کہہ کر وہ چُپ ہو گئی مَیں نے کہا ——— "کہو بہن! کیا کچھ اور کہنا چاہتی ہو"؟

"ہاں بہت کچھ"۔

"کیا؟"

"ایک اور واقعہ سُن لو۔ اَب میری حالت بدل گئی ہے۔ مَیں اِس ہپرٹ کا پرچار اپنی دیگر بہنوں میں بھی کرتی ہُوں۔ تھوڑے دِن گُزرے، مَیں آگرہ گئی۔ اکیلی تھی۔" وہ " ساتھ نہ جا سکے۔ گاڑی میں میرے قریب ہی ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا۔ دیر تک دیکھتی رہی۔ اُس کا یہی ڈھنگ رہا۔ اَب مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں نے اُس سے کہا "کیوں، آپ کا کیا کھو گیا ہے؟ کیا کبھی عورت نہیں دیکھی!" وہ ایک طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ گاڑی کے دُوسرے مُسافر میری اِس جرأت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اَور سب اُس نوجوان کی طرف دیکھنے لگے۔ جس سے تنگ آ کر وہ اگلے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ شاید ڈبّہ بدل لیا"۔

مَیں نے کہا۔ "جاؤ بہن تُم نے زندہ رہنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ خود بھی عزّت سے جِیو، دُوسروں کو بھی عزّت سے جینے دو۔ جو کام پولیس، شہری قانون کا ڈنڈا نہیں کر سکا، وہ تم کر سکتی ہو۔ تمہارے اندر آگ ہے۔ اِسے ٹھنڈا نہ ہونے دو"۔

یہ پاگل نوجوان

ایک دفعہ مجھے مفرے تک جانا تھا، مَیں ارادتاً اکیلی گئی، پہلے جب کبھی مَیں باہر نکلتی تو نوکرانی میرے ساتھ ہُوا کرتی تھی۔ ہمیں نوجوانوں کے ہاتھوں سے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑتا تھا لیکن میرا مفرے تک اکیلا جانا میری زندگی کا عجیب و غریب وَرق ہے، اَور یہ ایک دِلچسپ افسانہ بن سکتا ہے۔

نوجوان یہ سمجھتے ہیں، کہ ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے کالج کی لڑکی معلوم ہو، اگر کہیں تانگے میں اکیلی جا رہی ہو تو سمجھو وہاں دعوتِ نگاہ ہے۔ مَیں ابھی کالج کے ہوسٹل سے نکلی ہی تھی کہ ایک سائیکل سوار میرے پیچھے ہو لیا، مَیں نے کچھ اِس کی طرف توجہ نہ کی۔ جس کی وجہ سے وہ تھوڑی دُور تک میرے ساتھ آیا اَور پھر مَیں نے دیکھا کہ وہ کِسی اَور "دِل چسپ تعاقب" میں مصروف ہو گیا۔

اِس کے بعد۔ ایک اَور طرار سا نوجوان ٹیڑھی ٹوپی لئے ہُوئے مجھے تر نوالہ سمجھ کر مجھ پر کر مفرماتی

کرنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے سائیکل کا اگلا پہیہ بالکل میرے تانگہ کے نزدیک آجاتا۔ میں نے غلطی کی کہ میں ایک دفعہ اس کی طرف ذرا گہری نگاہوں سے دیکھ بیٹھی، اس نے سمجھا کہ وار خالی نہیں گیا ؛

پاگل کہیں کا۔ میری موہوم اور بے معنی سی نگاہوں کے فریب میں آگیا، مجھ سے کہنے کے لئے بار بار اس کے سینے سے الفاظ نکلنے تھے لیکن ہونٹوں پر آکر رک جاتے تھے، میں نوجوان کی اس حماقت پر مسکرا دی۔ اور یہ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی، کیونکہ اب اس کا شک یقین تک پہنچ چکا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ محافظ اب مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک دبی ہوئی آواز میرے کان میں آئی ؛



"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس کے بعد میں نے اسے ڈانٹ پلا دی، پھر وہ نہ ٹھہر سکا۔ مرد کی غیرت عورت کی ڈانٹ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ عورت ایک مرد کو بازار میں دھمکا دے تو مرد کے لئے اس سے زیادہ جاں گداز واقعہ کوئی نہیں۔ اگر وہ ٹھہرنا چاہے بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔ پر اس کے مردانہ وقار پر ایک گہرا زخم ہوتا ہے ! ؛

وہ نوجوان ایسے گم ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور آج تک میں اسے نہیں دیکھ سکی ؛

مقبرے میں

پہنچی تو بہت سے نوجوان پڑھنے کے بہانے سے وہاں پہنچے ہوئے تھے، بعض نوجوان کبھی کتاب کی طرف دیکھتے، کبھی میری طرف۔ بعض میری طرف پیٹھ پھیر کر بیٹھ گئے کہ شاید اُن کی توجہ میری طرف سے ہٹ جائے۔ لیکن پھر بھی مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے، بعض کتابیں وہیں چھوڑ کر کسی نہ کسی بہانے پودوں اور درختوں کے چکر کاٹ کر دُور میرے راستے پر آ رہے تھے۔ سینکڑوں اور ہزاروں آنکھوں نے مجھے گھُور گھُور کر دیکھا۔ وہ سمجھے تھے کہ میرا اکیلے آنا مصلحت سے خالی نہیں۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے مُجھ پر چھا جانا چاہتے تھے

کس قدر احمق ہیں یہ مرد۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ نوجوان چاہتے کیا ہیں؟ بے کیف اور بے روح سے مجسمے لوہے کے آدمی کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔ جس طرف انہیں کوئی "پھڑکیلی" سی لڑکی نظر آ جاتی ہے۔ ان کے سائیکل، تانگے اور موٹر کا رُخ اُدھر ہو جاتا ہے۔ کس قدر دُور ہیں یہ نوجوان زندگی کے راز سے! آج کے نوجوان کو یقین نہیں کہ وہ سڑک پر کس مطلب کے لئے چل رہا ہے، اِس پاگل کو اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں!!

(نرگس بانو)

شرارت کا جواب

میں بڑی تیزی سے کالج جا رہی تھی۔ پونے دس بج چکے تھے، اور مجھے دس بجے کالج پہنچنا تھا۔ بڑی تیزی سے پیڈل لگا رہی تھی۔ آخر کالج بھی تین میل تھا۔ شیطان کی آنت کی مانند لمبی سڑک ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی ؛

پیچھے سے ایک سائیکل نہایت تیزی سے آیا اور میرے قریب بالکل میرے ساتھ چلنے لگا۔ اُس پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ اُن کی چال ڈھال اور کتابیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ وہ بھی کسی کالج کے طالب علم ہیں۔ میں نے اپنا سائیکل دیدہ دانستہ آہستہ کر لیا تاکہ وہ گزر جائیں۔ لیکن میں نے چور نگاہوں سے دیکھا تو وہ بھی سائیکل کو آہستہ کرنے کے لئے اُلٹے پاؤں مار رہے تھے ؛

جو لڑکا سائیکل چلا رہا تھا، اُس نے اپنی ٹائی کو درست کیا اور میرے آگے سے

ہو کر گزرا، اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ مَیں تو پہلے ہی تاڑ گئی تھی، اُس کی کوشش ناکام رہی ؛

اِدھر مَیں نے گھڑی کی جانب دیکھا، صرف دس منٹ باقی تھے۔ مَیں نے سائیکل پھر تیز کر دیا، اور سڑک کو چیرتی ہوئی تیر کی مانند بڑھتی چلی گئی۔ سائیکل کا سایہ مجھے سڑک پر دِکھائی دیا۔ وہ نوجوان پھر میرے نزدیک آ پہنچے تھے۔ اب تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شرارت کرنا چاہتے ہیں ؛

وہ ہنستے ہوئے مجھے گرانے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے، اور متواتر تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ مَیں نے فوراً اپنے سائیکل کو بریک لگا کر آہستہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اُن کے سائیکل کا پہیہ میرے سائیکل کے پچھلے پہیئے سے ٹکرایا اور دونوں تڑاخ سے سڑک پر آ رہے۔ مَیں نے اپنا سائیکل تیز کر دیا۔ آج تک مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے تو افسوس سا ہونے لگتا ہے۔ لیکن میری سہیلیاں اِسے سُن کر کہتی ہیں ——— "اوشا تم نے خوب کیا"؛

(اوشا)





گرہست کی گاڑی کیسے چلیگی؟

"پھر کیا ہُوا؟" — مَیں نے اپنے ساتھ چلتے ہُوئے دوست سے پُوچھا:

"ہوتا کیا تھا" — وہ ذرا گہرا سانس، جو اُن کے دِل کے دُکھ کو صاف بتا رہا تھا، لیتے ہُوئے بولے

"کہنے لگی مجھے میکے بھیج دو!"

"ارے!" بڑے تعجب کے ساتھ میرے مُنہ سے اِتنا ہی نکلا۔ کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ گرہستی زندگی کو سُکھی بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب دوست کو میسّر تھیں۔ پھر یہ زبردستی گھر چھوڑنے کی نوبت اُن کی بیوی کو کیوں آئی؟

اُنہوں نے میرے "ارے" کا مطلب سمجھ لیا اور اپنے پاؤں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولے — "یہ جُوتا دیکھتے ہو — نیا ہی ہے۔ خوبصورت بھی ہے، مگر کیا تم بتا سکتے ہو، کہ یہ میرے پاؤں کو کہاں کاٹتا ہے؟"

بات تو پُرانی تھی۔ کئی بار پہلے سُن چکا تھا۔ مگر صحیح طور پر آج ہی سمجھ سکا۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد مَیں نے پُوچھا —

"پھر تُم نے کیا کہا؟"

"کہتا کیا! روزمرہ کی اس ہائے، ہائے سے مَیں تو تنگ آگیا ہوں۔ مَیں نے بھی

صاف کہہ دیا ——— اِتنی دھونس کس بات کی دِکھاتی ہے۔ چلی جاؤ"۔

"یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا ——— میں نے کہا۔

"کیا کروں، بھائی، میں جانتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں۔ مگر آئے دِن کی ہائے ہائے اب مجھ سے نہیں سہی جاتی۔ سویرے آفس جاتا ہوں۔ تو اُن کی فرمائشیں ساتھ ہوتی ہیں۔ شام کو آفس سے تھکا ماندہ آتا ہوں تو بجائے اِس کے کہ ہمدردی یا پیار سے کوئی بات پوچھیں۔ پہلے ہی پوچھا جاتا ہے، یہ لائے، وہ لائے؟ اور دِن بھر کے کام سے تھک کر چور ہوا میں کسی بات پر ذرا ناراضگی ظاہر کر دوں تو سمجھتی ہیں کہ میں اُن سے محبت ہی نہیں کرتا۔ کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اِس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔

آج ہی کی بات لو ——— ذرا بات ہوئی اور انہوں نے جھٹ کہہ دیا ——— "مجھے میکے بھیج دو"۔



دوست کے الفاظ دِل کے درد کے بوجھ سے اِتنے دبے ہوئے تھے۔ کہ منہ سے لڑکھڑاتے سے نکل رہے تھے۔ مجھے دوست کی اِس حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ اُن کی بیوی کا چھوڑا ہوا یہ غیبی راکٹ بم اُن کے گرہست کو تباہ کر دیگا۔ ——— یہ مجھے دِکھائی پڑ رہا تھا۔ دوست سے رُخصت ہونے کے بعد یہ اُلجھن میرے دِل میں ہلچل مچاتی رہی۔

ہم نہ جانے کب سے یہ سُنتے چلے آ رہے ہیں کہ گرہست ایک گاڑی کی طرح ہے۔ اور خاوند بیوی اُس گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے بھی ٹھیک یہ ہے کہ گرہست کی گاڑی میں خاوند بیوی دو بیلوں کی مانند ہیں۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی گاڑی کو

کو اپنی طرف کھینچنا چاہے گا یا آرام کرنے کے لئے بیٹھنا چاہے گا تو گاڑی کبھی ٹھیک نہیں چلے گی۔ دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے چلنا ہو گا۔ تب ہی گاڑی راستے پر چلے گی۔

گرہست کی گاڑی ایسے چلے گی

۱

● ایک سمجھدار بہن سوشیلا نے مجھے بتایا کہ جب وہ اپنے شوہر کی زیادہ سگریٹ پینے کی عادت سے پریشان ہو جاتی تھی۔ تو اس دن وہ ذرا خاموش رہتی۔ جو بات وہ پوچھتے، اس کا ٹھیک طور سے جواب دیتی۔ خاطر تواضع پہلے سے بھی زیادہ کرتی۔ بس، اس کے شوہر تاڑ جاتے کہ آج بیوی کے چہرے پر رونق نہیں ہے۔ تنہائی پا کر وہ پوچھتے "کیوں بات کیا ہے؟ آج چاند مسکرا نہیں رہا؟"



سوشیلا — "آپ تو دل میں بستے ہیں، پھر بھی کیا آپ کو بتانا ہوگا کہ مجھے کیا بات اچھی لگتی ہے اور کیا بری؟ خیر! آپ کو میں الزام کیوں دوں، میرے میں ہی کچھ کسر ہے، جو آپ کا پریم پانے میں کمی رہ گئی۔ نہیں تو بھلا اپنی پیاری بیوی کے لئے خاوند کیا اپنی عادتیں نہیں سدھار سکتا؟"

اس طرح کی پیار بھری شکائتیں سن کر

خاوند پانی پانی ہو جاتے - آخر کار اُنہیں اپنی عادت چھوڑنی پڑی ؛

(۲)

شیام لال کو گھوڑ دوڑ میں پیسہ لگانے کی بہت عادت تھی جس دن وہ گھوڑ دوڑ میں سو پچاس روپے پھونک آتے، بیوی سے چُھپا نہ رہتا - اُن کی بیوی نے ستیا گرہ کا ایک نیا طریقہ نکالا - جس مہینے شیام لال گھوڑ دوڑ میں پیسہ خراب کر آتے - اُس مہینے کے باقی دنوں کے لئے بیوی گھر کے دودھ اور پھل کا خرچ چوتھائی کر دیتی - نہ آپ دودھ اور پھل کھاتی، نہ بچے کو دیتی، صرف خاوند کو پروس دیتی - یہ دیکھ کر شیام لال نے اس کا سبب پوچھا - بیوی بولی "اب، آپ کے گھوڑ دوڑ کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے! ہمارا پیٹ کاٹ کر ہی تو!! اگر یہی حالت بنی رہی، تو روٹی کپڑا نصیب ہونا بھی



بند ہو جائے گا - اگر کوئی عیال دار ایسی تفریح میں پیسہ پھونکے گا تو بال بچوں کا پیٹ ہی تو کاٹے گا۔ اگر آپ نے ہمیں اسی حالت کو پہونچانا ہے تو پھر چند روز دودھ پھل کھا کر اپنی عادتیں کیوں بگاڑیں!" بیوی کی بات کا شیام لال پر بڑا اثر پڑا - اس ستیہ گرہ کا وہ مقابلہ نہیں کر سکا - اور اس نے پھر ریس کورس کی طرف بھول کر بھی رُخ نہیں کیا ❊

(۳)

اپنی سُہاگ رات کے پندرہ بیس دن بعد شام کو میں گھوم کر لوٹا تو دیکھا چولہا سنسان پڑا ہوئے ہے اور بیوی اپنے اوپر کے کمرے میں لیٹی ہے - پتہ چلا کہ ان کی طبیعت ذرا خراب ہے میں نے ان کی طبیعت پوچھی اور وید جی کو بلانے کی بات کہہ کر اپنا انگوچھا اور بنیان پہن کر میں نیچے چلا آیا - انہوں نے سمجھا میں نہانے جا رہا ہوں - مگر میں جب دیر تک اوپر نہ پہنچا تو وہ نیچے آئیں، دیکھا میں نے چولہا جلا کر سبزی چھونک دی ہے اور آٹا گوندھ لیا ہے ❊

بچاری پریشان ——— "یہ کیا کر رہے ہو؟"

میرا جواب سیدھا، میٹھا اور صاف ——— "مجھے باسی کھانا کھانے کی عادت نہیں اور تمہاری طبیعت خراب ہے - صبح کا کھانا میں نے مہری کو دے دیا ہے - دس منٹ میں ہی کھانا بن جاتا ہے - بیٹھو دونوں ساتھ کھائیں گے ❊

پیار سے تھپتھپا کر میں نے انہیں پیڑھے پر بٹھا دیا، مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ چولہے پر گئیں - میں بھی لگا رہا اور سچ یہ ہے کہ دس پندرہ منٹ میں ہی کھانا تیار ہو گیا - ہم دونوں کھانے بیٹھے، تو کھانے کی تمام خوبیوں کا کریڈٹ میں نے اپنے کو دیا اور بیوی نے اپنے کو - اس بحث کے ساتھ کھانا کھانے میں بڑا لطف آیا - اور اس دن کے بعد مجھے تو زندگی میں کبھی باسی کھانے کی تجویز پیش نہیں کی گئی - کتنا سہل طریقہ ہے!

اگر آپ چاہتے ہیں کہ گھر میں روزانہ ہونے والی معمولی شکائتوں، خرچ اور پریشانی سے بچیں اور ڈاکٹروں کی نت نئی خوشامد نہ کرنی پڑے - اگر آپکی آرزو ہے کہ محلّے کے چھوٹے بڑے لوگ آپ کے ممنون احسان رہیں - تو "رہنمائے صحت" کی ایک جلد ہمیشہ اپنے پاس رکھیے - ضرورت کیوقت خود فائدہ اٹھایئے اور اہل محلّہ کی اس کے ذریعہ خوشنودی حاصل کیجئے ❊



ایک ایسی مُسکراہٹ

فوٹوگرافر ایک عورت کی تصویر کھینچنے والا تھا۔ وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھی۔ بڑھیا کپڑے اور زیور اُس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ فوٹوگرافر اُس کا پوز بنا چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد اُس نے کہا ——"ذرا مُسکرایئے تو!" اُس عورت نے مُسکرانے کی کوشش کی مگر پھر وہی سنجیدگی چھا گئی چہرے پر۔ فوٹوگرافر نے جب "ریڈی" کہا تو وہ عورت اور بھی سنجیدہ ہوگئی۔

مَیں نے ایک بات ایسی کہہ دی۔ جسے سُنتے ہی وہ ڈھیر سے ہنس پڑی۔ اُس کے سنجیدگی اختیار کرتے سے پہلے ہی فوٹوگرافر نے کہہ دیا۔ "شکریہ!" اُس عورت کا منہ ایک دم لال ہوگیا، جیسے بہت مشقت کرنی پڑی ہو۔

باہر نکل کر اُس نے بتایا کہ وہ اپنے برتھ ڈے (جنم دن) پر اپنا ایک فوٹو ضرور کھنچواتی ہے۔

مَیں نے کہا ——"آج آپ کی مُسکراہٹ بڑی مُشکل سے آئی"۔

اِس پر وہ بہت جھینپ کر بولی ——"آج میری تصویر ضرور بگڑ گئی ہوگی، کیونکہ مجھے مُسکرانے کی عادت نہیں ہے"۔

دُوسرے دِن مَیں اُس عورت کے گھر گئی، اُس کے خاوند ولائیت میں تھے۔ گھر پر ساس

اور ایک تنا تنا تھیں ۔

مَیں نے اُس عورت سے پوچھا ـــــ "کل کا فوٹو کیسا آیا"؟

اُس نے کہا ـــــ "ابھی آتا ہی ہوگا" ۔

اس کی ساس بولی ـــــ "بہو! اپنی پچھلی تصویروں کی البم تو دکھاؤ انہیں"۔ اُس میں اُس کی پہلی سالگرہ سے اب تک کی تصویریں موجود تھیں۔ سب ایک سے ایک سنجیدہ۔ سنجیدگی ہی اُس کی زندگی کا گویا واحد راز تھی ۔

اتنے میں اُس کی نند تصویر لئے دوڑی آئی اور بھابی سے چپٹ کر کہنے لگی

"وَنڈرفل اکسپریشن، بھابی!"

سچ مچ اُس کی ساری البم ایک طرف اور وہ تصویر ایک طرف۔ اُس کے حسین چہرے پر کھیلتی ہوئی ہلکی مُسکراہٹ نے اُسے اور بھی پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے نہ پھُوٹ کر آنکھوں میں چمک اُٹھی تھی۔ نند بولی ـــــ "بھابی، ایسی حسین تو تم اس دن بھی نہیں لگ رہی تھیں۔ جب بیاہ کر نئی نئی آئی تھیں" ۔

بات ٹھیک تھی۔ مُسکراہٹ نے جیسے اُس کے مزاج میں مٹھاس بھر دی تھی۔ وہ دھیرے سے بولی ـــــ "جب مَیں اپنے باپ کے یہاں تھی تو ڈپٹی کمشنر کی اکلوتی لڑکی ہونے کے باعث مجھے عام بچّوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے کا بہت کم موقعہ مِلا۔ میری ماں کو بھی لڑکیوں کا زیادہ ہنسنا بولنا پسند نہیں تھا۔ اِس طرح مجھے سنجیدہ بنے رہنے کی عادت پڑ گئی۔ بیاہ کر آئی تب بھی سنجیدہ تھی۔ پڑوسنوں نے سمجھا شاید مجھے میل ملاپ اچھا نہیں لگتا۔ سہیلیاں تو ہمیشہ سے ہی ٹوکتی رہیں کہ کیسی عجیب ہو، مُسکرانا بھی نہیں جانتی ہو" ۔

پھر اُس نے قدرے شرما کر کہا ـــــ "اُنہیں بھی مجھ سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ مَیں بہت سنجیدہ رہتی ہوں۔ اِس تصویر نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مَیں اسے اُن کے پاس ولایت بھیجوں گی۔ اُنہیں بڑی خوشی ہوگی۔ اب مَیں اپنی عادت بدلوں گی مُسکرانے کی کوشش کرونگی" ۔

ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ "خوش رہنا تندرستی کی سب سے بڑی کُنجی ہے"۔ خوبصورتی

آنکھ ناک کی بناوٹ یا اچھے کپڑے اور زیور پہننے سے ہی نہیں آتی۔ طبیعت کی مٹھاس سے بھی آتی ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں، اپنے حسن کو چار چاند لگانے کے لئے ذرا مسکرایئے تو! (وِدّیا)

میرا - تیرا

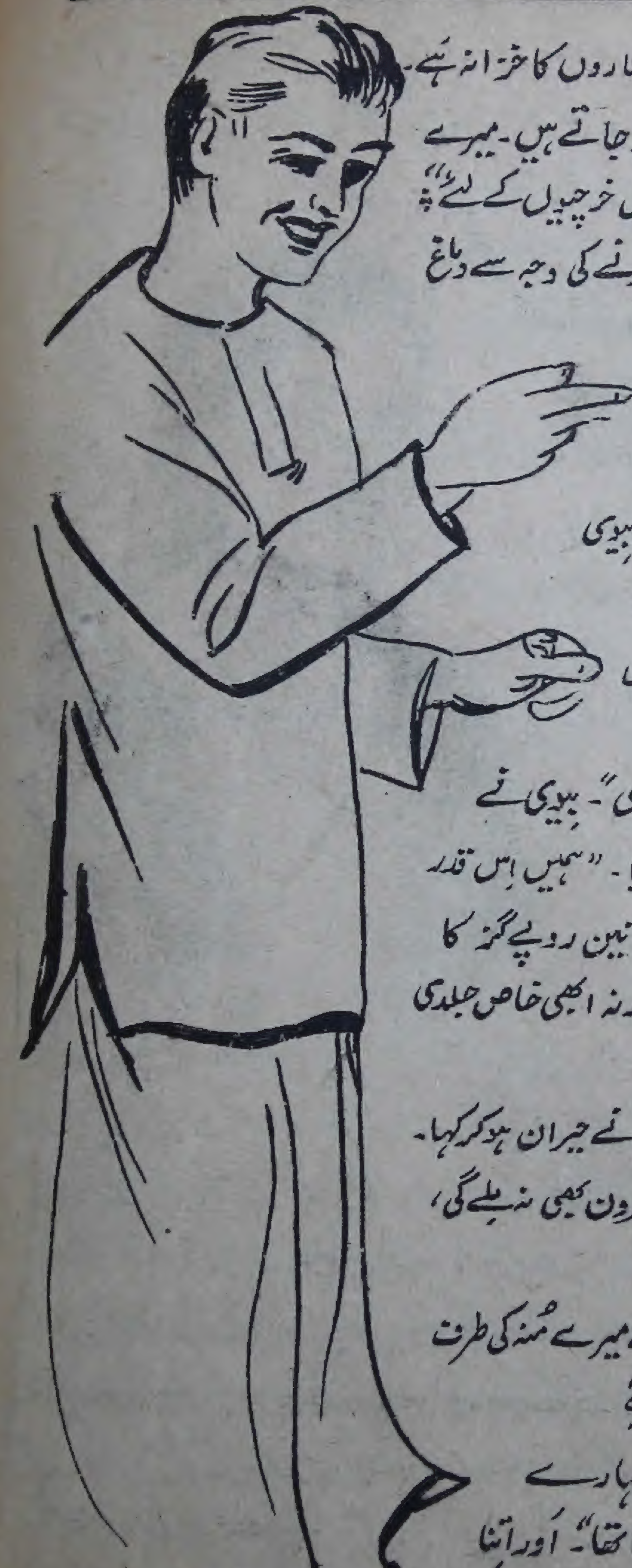


میری بغل میں بنڈل دیکھ کر میری بیوی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا لائے؟"

بیوی کو مسکراتے دیکھ کر میں نے بھی اپنے لبوں پر ہنسی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آج پریم بابو کے ساتھ بازار چلا گیا تھا۔ انہوں نے ایک سوٹ کا کپڑا خریدا۔ مجھے بھی کپڑے کا رنگ پسند آ گیا۔ بس ایک سوٹ کا کپڑا خرید لایا ہوں"۔

اور میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر بیوی آگ بھبھوکا ہو گئی۔ "یہ پریم بابو تمہارے کپڑے بھی نیلام کر دیں گے۔ پچھلی دفعہ ان کے ساتھ گئے تھے تو چودہ روپے کا بوٹ خرید لائے تھے۔ آج پچاس روپے سوٹ کے کپڑے پر خرچ کر آئے ہوں گے۔ میں پوچھتی ہوں، آخر اپنی چادر دیکھ کر کیوں نہیں پاؤں پھیلاتے۔ کماتے ہیں صرف سو روپیہ، اور سوٹ کا کپڑا خریدا ہوگا ریئسوں والا۔ اب باقی مہینہ گھر کا خرچ کہاں سے پورا ہوگا؟"

"تم پچاس روپیہ ادھار دے دینا، اگلے ماہ دے دوں گا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔



"جی ہاں۔ گویا میرے پاس تاروں کا خزانہ ہے۔ ہر ماہ دس پانچ روپیہ گھر میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس ایک دھیلا نہیں ہے اِن فضول خرچیوں کے لئے"۔

"تمام دِن دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے دماغ پریشان تھا۔ مَیں نے جھُنجھلا کر کہا۔ آپے سے باہر کیوں ہو رہی ہو، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو مَیں پریم بابُو کو دے آتا ہوں۔ اُن کی بیوی کو اِس کا رنگ اِس قدر پسند آیا ہے کہ ایک سُوٹ کے لئے اور منگوا رہی ہیں"۔

"ہاں دے آیئے اُنہیں ہی"۔ بیوی نے اطمینان کا سانس لیتے ہُوئے جواب دیا۔ "ہمیں اِس قدر بڑھیا کپڑے کی ضرورت نہیں۔ اگر دو تین روپے گز کا کپڑا مل جائے تو اگلے ماہ لے آنا، وَرنہ ابھی خاص جلدی نہیں ہے"۔

"دو تین روپے گز" مَیں نے حیران ہو کر کہا۔ "اِس بھاؤ میں تو سُوٹ کے قابل گبرون کبھی نہ مِلے گی، ساٹن تو ایک طرف"۔

"ساٹن ——؟" بیوی نے میرے مُنہ کی طرف تکتے ہُوئے پُوچھا۔ "کیسی ساٹن؟"

"نیلی وِلائیتی ساٹن۔ تمہارے سُوٹ کے لئے۔ تم ہی نے آج صبح کہا تھا"۔ اور اِتنا

کہہ کر مَیں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی دروازے تک پہنچنے ہی نہ پایا تھا کہ بیوی تیر کی سی تیزی کے ساتھ میرے سامنے آ کر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی، اور اپنی نیم باز نگاہ، نیم مسکراہٹ اور دیگر تمام اداؤں کے حربوں سے مجھ پر حملہ کرتے ہوئے انتہائی پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "ناراض ہو گئے آپ، مَیں نے تو یونہی مذاق کیا تھا"۔

"مذاق نہیں" مَیں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ سُوٹ کے لئے پچاس روپیہ کا کپڑا خریدنا فضول خرچی ہے"۔

"اجی چھوڑیئے ان باتوں کو، اور اتنا کہتے ہوئے بیوی نے میری بغل میں سے کپڑے کا بنڈل نکال کر کھول لیا"۔

مَیں نے کہا۔ "چھوڑیئے، کس طرح؟ مہینہ ختم ہونے میں ابھی پندرہ بیس دن باقی ہیں، ان دنوں گذارہ کس طرح ہو گا؟"

"مَیں روپیہ دے دُوں گی، آپ فکر نہ کیجیئے"۔

"لیکن تمہارے پاس روپیہ ہے کہاں؟" مَیں نے طنزاً جواب دیا۔ "لاؤ اسے پریم بابُو کے ہاں دے آؤں"۔

اور بیوی مُنہ بسور کر بولی۔ "آپ تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے نا کتنا اچھا رنگ ہے اس ساٹن کا ——— مجھے بہت پسند ہے، کیا ہُوا اگر ایک دفعہ خرچ زیادہ آ گیا۔ چیز تو اچھی بن جائے گی"۔ اور پھر میرے منہ کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگی ——— "چل کر کھانا کھایئے۔ مجھے بھی سخت بھوک لگی ہے"۔

اور ——— اگلے ہی لمحہ بیوی میری کمر کے گرد اپنا بازو ڈالے کشاں کشاں مجھے کمرے کی طرف لے جا رہی تھی۔

(مظلوم۔ کیتھلوی)



بے چاری بہو

میرے محلے میں ایک لالہ صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ لڑکے کی بیوی خوبصورت اور نازک طبع تھی۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک تو اُس کی خاطر ہوتی رہی۔ زاں بعد اُس سے گھر کا کام لیا جانے لگا۔ جس روز سے بہو نے کام شروع کیا، اُس روز سے ساس دیوی کو پنشن مل گئی۔ کہاں تو پہلے ساس دیوی سب کام کرتی تھیں لیکن جب دن سے بہو نے کام میں ہاتھ لگایا، اُسی دن سے اُن کا مزاج تھرما میٹر کا پارہ بن گیا۔ روٹی بنانے پر دھوآں اُن کی آنکھیں خراب کرنے لگا۔ گھر میں جھاڑو لگانے سے دھول کے باعث کھانسی آنے لگی۔ نیچے سے پانی بھر کر اُوپر لانے میں اُن کو دمہ کی بیماری کا اندیشہ ہونے لگا۔ اب اُن کی صحت کے لئے اگر کوئی بات موافق تھی تو صرف بہو پر حکم چلانا، اور وقت پر پکا پکایا کھا لینا، بس!

گرمیوں کے دن تھے۔ بچاری پھول سی نازک لڑکی گاگریں بھر کر تیسری منزل کی چھت پر لے جا کر چھت کو تر کرتی تھی۔ بستر بچھاتی تھی اور دیگر ضروری چیزیں پہنچاتی تھی۔ اِس کے بعد کھانا پکاتی۔ اور سب کو کھلا کر پیچھے خود کھاتی تھی۔ اِس کے بعد گھنٹہ بھر ساس کے پاؤں دباتی تھی۔ اُس کے ساتھ صرف

اِتنی رعایت ضرور تھی کہ اُسے چھت پر سونے والوں کو پیٹھ پر لاد کر اُوپر نہیں پہنچانا پڑتا تھا۔ وہ سب اُس پر ترس کر کے اپنے پاؤں چل کر اُوپر چلے جاتے تھے۔ وَرنہ اَور کوئی اَیسا کام نہیں تھا جو اُسے نہ کرنا پڑتا ہو۔ بچاری کو وقت پر سونا بھی نہیں ملتا تھا ـــــ ابھی خاوند کے پاؤں دبانا جو باقی ہے۔ بارہ بجے رات تک خاوند کی خدمت میں حاضر رہی۔ تب جا کر اُس بچاری کو سونا نصیب ہُوا۔ اِتنا ہی ہوتا تو غنیمت تھا۔ رات کے دو بجے کسی کو پیاس لگی تو جھٹ اُس نے حکم صادر فرمایا ـــــ "بہو ایک گلاس پانی لاؤ"۔ بہو بچاری دِن بھر کی تھکی بے ہوش پڑی ہَے، اُس کو ذرا اُٹھنے میں دیر ہُوئی تو بس مزاج کا پارہ اُبلنے لگا ـــــ "واہ! ایسا بھی کیا سونا کہ تن بدن کی سُدھ نہ رہے۔ سر پر توپیں چھُوٹا کریں۔ پھر بھی خبر نہ ہو" اَور سُنیئے۔ ایک بار معمولی آواز میں کہی ہُوئی بات توپ کی آواز ہو گئی!

اِس طرح وہ بچاری سویرے سے اُٹھ کر رات کے بارہ بجے تک مشین کی طرح کام کرتی رہتی تھی۔ رات کے بارہ بجے کے بعد وقتاً فوقتاً اُسے جو دو ایک بار اُٹھنا پڑتا تھا۔ وہ اَوور ٹائم سمجھ لیجئے۔ خاوند پانچ ہاتھ کا مضبوط جوان، سُسر بھی ہٹا کٹا اَور ساس بھی اَیسی کہ اگر بگڑ اُٹھیں تو باپ بیٹے کی کھوپڑی پکڑ کر لڑا دیں۔ مگر کام کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں۔ کام کے لئے سب کی صحت بگڑی رہتی تھی ؛

اِس طرح بہو بےچاری بے حد محنت کرتی رہتی تھی۔ اَور دُوسرے تیسرے دِن پتی دیوتا اُسے پیٹ بھی دِیا کرتے تھے۔ یُوں چاہے باہر گالیاں اَور جُوتے کھا کر بھی دُم دبائے ہُوئے گھر چلے آئیں۔ مگر بیوی کے سامنے اگر ناک پر مکھی بھی بیٹھ جلئے تو اس میں بھی بیوی ہی قصور وار ـــــ بس لگے تڑا تڑ برسانے ؛

اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ چھ مہینے کے اَندر ہی اُس بےچاری کو تپدق ہو گیا۔ اُس حالت میں بھی وہ ظالم اُن سے وَیسی ہی کڑی محنت کراتے رہے۔ آخیر میں جب وہ بالکل ہی کمزور اَور ناکارہ ہو گئی، تب اُس کا پیچھا چھُوٹا۔ اَب اُس کے علاج کا سوال پیدا ہُوا۔ مگر علاج کے لئے پَیسہ چاہیئے، اَور پَیسہ خرچ کرنے کے لئے اُنہوں نے دُوسری ترکیب سوچی۔ اُس کے میکے والوں کو بُلا کر میکے بھیج دِیا، اَور کہہ دِیا جب اچھی ہو

جائے، تب بھیج دیتا کتنا سہل نسخہ ہے۔

ایک دن لڑکے کے والد سے بات چیت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ "کہئیے، آپ کی بہو کا کیا حال ہے"؟

بولے۔ "پتہ نہیں، دہرہ سے کوئی چٹھی نہیں آئی"۔

میں نے کہا۔ "اُس سے کام بہت لیا گیا۔ اتنی کڑی محنت کے لائق نہیں تھی"۔

"کام نہ لیتے تو اُس کی پوجا کرتے؟ یہ آپ لوگوں میں ہی ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں عورت کو سر پر نہیں چڑھایا جاتا"۔

"کیا کسی شخص سے اُس کی طاقت کے مطابق کام لینا اُسے سر پر چڑھانا ہے"۔

"یہی تو ہوتا تھا۔ گھر میں جتنا کام ہوتا تھا، وہی لیا جاتا تھا۔ کوئی باہر کا کام تو کرایا نہیں جاتا تھا"۔

میں نے کہا۔ "وہ بھی کرا لیتے، ارمان تو نہ رہ جاتا اور کچھ کمائی ہو جاتی"۔

اور وہ بڑی شان سے اکڑ کر بولے ——— "ہم لوگ اتنے گرے ہوئے نہیں ہیں"۔

میں نے پوچھا ——— "اگر مر گئی تو کیا ہو گا"؟

"ہو گا کیا؟ دوسری آ جائے گی اور دو چار ہزار کی رقم ساتھ ملے گی۔ اُس کے مرنے سے ہمارا تو فائدہ ہی ہے"۔

یہ جواب سُن کر مجھے اُس شخص کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ یہ ہم لوگوں کی شرافت ہے کہ ایسے ایسے راکھشش بھی سماج میں سر اُٹھا کر شان سے چلتے ہیں۔

ٹوٹے دِل

"بلا کر لا، اُس نالائق جنگو کو!"

میرا بھنگی اکثر اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔ گھونسہ، تھپڑ، لات، لاٹھی، سُنا ہے کہ سب کا وہ اُستاد ہے۔ وہ غریب بھنگی ہے، میرے ماتحت ہے، اِس لئے مجھے حق ہے کہ اس

کے لئے ڈانٹوں اور اگر چاہوں تو سزا بھی دوں۔ ورنہ بڑے بڑے سماج سدھارک عالم اور ملکی رہنما اس اُستادی میں جینگو کے مخالف ہیں۔

ایک رُوئی کی بھری ہوئی بوری کی
محروم حرکت، محروم مخالفت، محروم انتقام۔
عورت کی نس

مانند ——— عورت ———
مرد مجسّم حملہ، مجسّم حرکت،
ناڑیوں کے مکمل



عِلم کا اَوتار۔ ایک باہر سے اندر تک خاموش اور دُوسرا اندر سے باہر تک متحرک ہمارے سماج کا یہ عام منظر ہے۔ اِسے دیکھ کر کسی کا دِل نہیں پھٹتا، کسی کی آنکھیں نہیں پسیجتیں۔

اُس دِن جب پھر بیوی کو پیٹنے کی بات سُدھا نے مجھ سے کہی تو سب کچھ جانتے ہُوئے بھی مَیں جھنجھلا اُٹھی ——— "بُلا کر لا، اُس نالائق کو"۔ وہ آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں رے، تُو روز اُسے مارتا کیوں ہے؟ تُو اِنسان ہے یا بھیڑیا؟ اُٹھا اپنا سامان اور میرا کوارٹر خالی کر، پاجی کہیں کا"۔

"بہُو جی! وہ بڑی سُور ہے۔ ہر روز میرے باپ کو تنگ کرتی ہے۔ مجبور ہو کر ہی میرا ہاتھ اُٹھتا ہے"۔

میری آدھی کوٹھی کے کرایہ دار مسٹر اروڑہ سامنے لان میں، بیٹھے خط لکھ رہے تھے۔ آپ فراخدِل اِنسان ہیں، دانی ہیں، ایک نیبکٹری کے منیجر ہیں، سوشل ریفارمر ہیں۔ سال میں کِسی نہ کِسی کانفرنس کے سبھا پتی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چلّا کر بولے ——— "بدمعاش، تیرے باپ کو وہ بہت تنگ کرتی ہے، تو اُسے پیار سے سمجھا، وہ کوئی گاجر مُولی ہے کہ جب چاہا دھمک دی۔ یہ ہندوستان ہے اور کوئی مُلک ہوتا تو تجھے جیل بھجوا دیتی، اور تب تجھے آٹے دال کا بھاؤ معلُوم ہوتا"۔

(۲)

ڈاکٹر اروڑہ کا دماغ آج صبح سے ہی گرم تھا۔

کھانا کھانے بیٹھے تو ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے تھال دُور پھینک دیا اور چلّا کر بولے ——— "جب مَیں بینگن نہیں کھاتا، تو یہ کیوں بنائے گئے ہیں؟"

"مجھے تو خود اِن کا شوق نہیں ہے۔ بچے ضِد کر رہے تھے۔ اِس لئے بنا لئے"۔

"تو بچے اچھے ہیں یا مَیں؟"

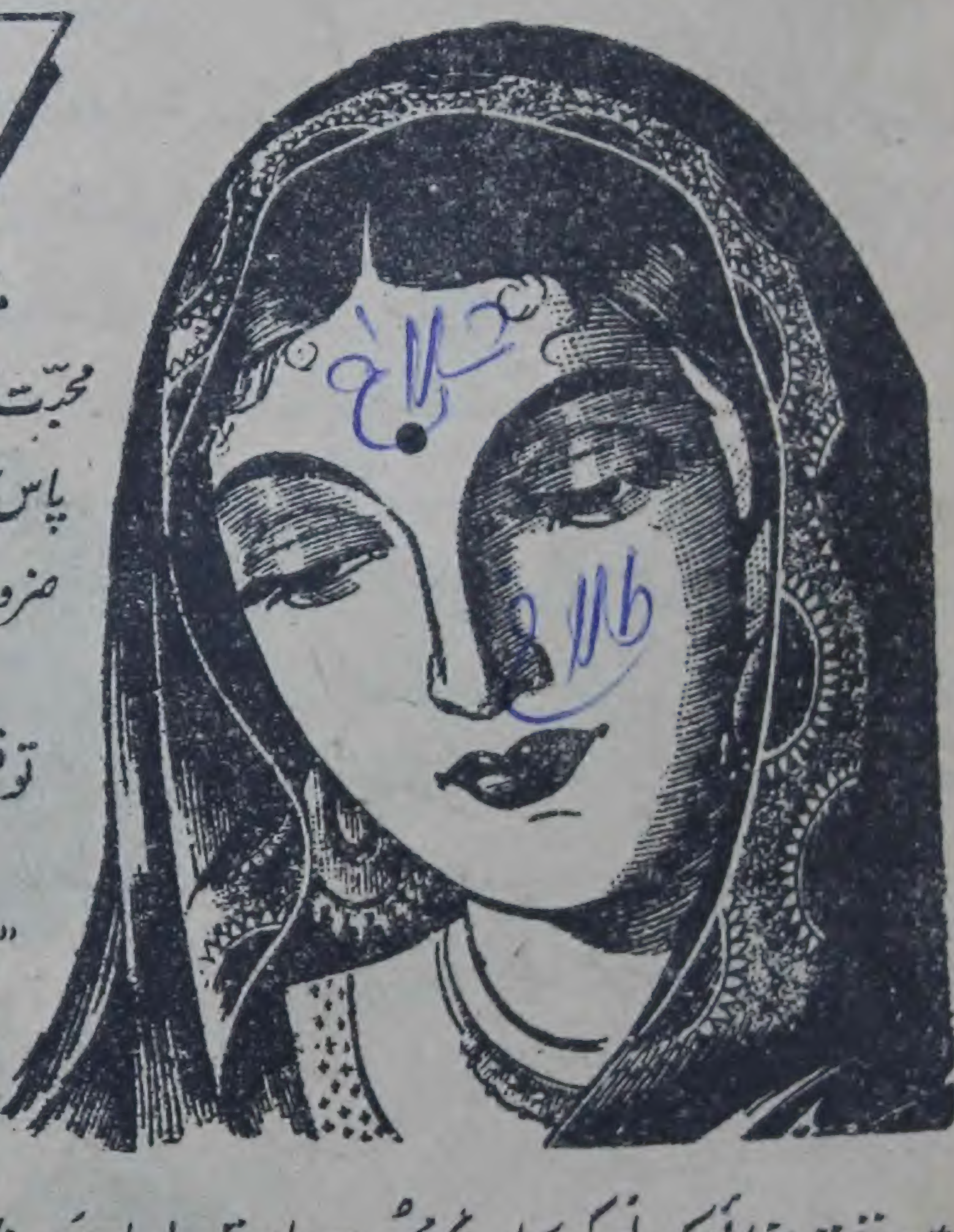
"بچے بھی اچھے ہیں اور آپ بھی۔ تھال میں اور بھی چار چیزیں تھیں۔ جو پسند آتیں، کھا لیتے"۔

اروڑہ صاحب کا ٹمپریچر ۱۰۶ ہو گیا اور چُپ۔ مسز اروڑہ کے گال پر پُورے ہاتھ کا

ایک دھپڑ لگا دیا اور پانچوں انگلیوں کے نشان پڑ گئے ؎

اچانک جنگو گیدڑ کی جھاڑ رہا تھا، اور میں برآمدے میں بیٹھی ننھے کا ٹوپا بن رہی تھی۔ مسٹر اروڑہ کو سنا کر مجھ سے بولا —— "بھوجی، عورت کوئی گائے بھینس نہیں ہے کہ جب چاہا دھمکا دی۔ یہ ہندوستان ہے اور کوئی ملک ہوتا تو بابو کو جیل بھیج دیتیں اور تب میاں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا"؎

جنگو کے ہونٹوں میں دبی ہنسی ابھر رہی تھی اور مسٹر اروڑہ سر کٹے اس کی طرف دیکھ رہے تھے ؎ (چندر وتی جین)



طلاق

مرد نے کہا —— "بیوی! مجھے تم سے محبت بھی ہے اور تمہارے جذبات کا پاس بھی۔ لیکن اولاد کی خواہش اور ضرورت بھی تو آخر کوئی چیز ہے" ؎

عورت نے بسور کر کہا —— "اولاد تو قسمت سے ....."

مرد نے بات کاٹ کر کہا —— "اس معاملہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ اپنا خیال میں تم پر ظاہر کر چکا ہوں اس لئے بہتر ہو، اگر فضول گفتگو میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مجھ سے طلاق لے لو۔ میں نکاح ثانی کا قطعی فیصلہ کر چکا ہوں ؎

عورت نے لجاجت سے کہا —— مگر میں بھی تمہاری لونڈی بن کر . . . .

مرد نے جھنجھلا کر کہا —— "یہ سب باتیں ایک سے زیادہ مرتبہ کہی سنی جا چکی

ہیں۔ اب اِن کا تذکرہ فضول ہے۔ تمہیں طلاق نہ دے دُوں تو نجم النساء مجھ سے نکاح کیونکر کرے گی؟

عورت نے بیکسانہ انداز میں کہا ——"تو کیا واقعی آپ مجھے طلاق دیئے بغیر نہ مانیں گے"؟

مرد نے غضب ناک ہو کر کہا ——"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اُس وقت تک میرے فیصلے کا یقین نہیں آئے گا، جب تک زبردستی گھر سے نکال کر تمہیں باہر نہ کروں گا"۔

عورت نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا ——"آپ مجھے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکنا چاہتے ہیں تو مَیں بھی وبالِ دوش بنکر نہ رہوں گی۔ میرا سب کچھ مجھے دے دیجئے۔ مَیں ابھی چلی جاتی ہُوں۔

مرد نے سرد مہری سے کہا ——"بڑی خوشی سے۔ تم اپنے مہر کا روپیہ لے سکتی ہو"۔

عورت نے تیز ہو کر کہا ——"میں روپے پر تھوکتی بھی نہیں۔ مجھے روپیہ نہیں چاہئے"۔

مرد نے لاپرواہی سے کہا ——"تو پھر اور کیا چاہتی ہو"؟

عورت نے لُٹے ہُوئے امیر کی طرح حسرت بھرے لہجے میں کہا ——"مجھے دو —— میری وہ بے داغ جوانی، جس کی بہاریں تم نے لُوٹی ہیں۔ مجھے دو —— میرا وہ اچھوتا حُسن، جسے چاند کی چاندنی بھی چھُو نہ گئی تھی! —— مجھے دو —— میرا وہ شیریں تبسم جس نے کبھی تمہاری تاریک زندگی منوّر کر دی تھی!

مجھے دو —— میری وہ عصمت جس کی قیمت دونوں عالم کے خزینوں میں بھی نہیں ہے"!



میاں! میں روٹی کے چند ٹکڑوں کے بدلے میں اور لباس کے چند دھجیوں کے عوض میں اپنی عصمت تمہارے ہاتھ بیچنے نہیں آئی تھی! میں تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بن کر آئی تھی!

تمہارے جسم کی رُوح بنکر تمہارے ساتھ رہنے آئی تھی۔ میں نے اپنا گدرایا ہُوا شباب اور اپنی اُٹھتی ہُوئی جوانی تمہارے ہاتھوں میں اِس لئے نہیں سونپی تھی کہ تم مجھے اپنی معصیت کا اِک کھلونا بنا کر میرے حُسن و جمال کی اچھوتی کلیوں سے نفس پرستی کے کھیل کھیلو۔ اور پھر جب کھیلتے کھیلتے تمہارا جی بھر جائے تو مجھے گھر سے نکال باہر پھینکو! کسی بدرو میں —— گلنے اور سڑنے کے لئے!



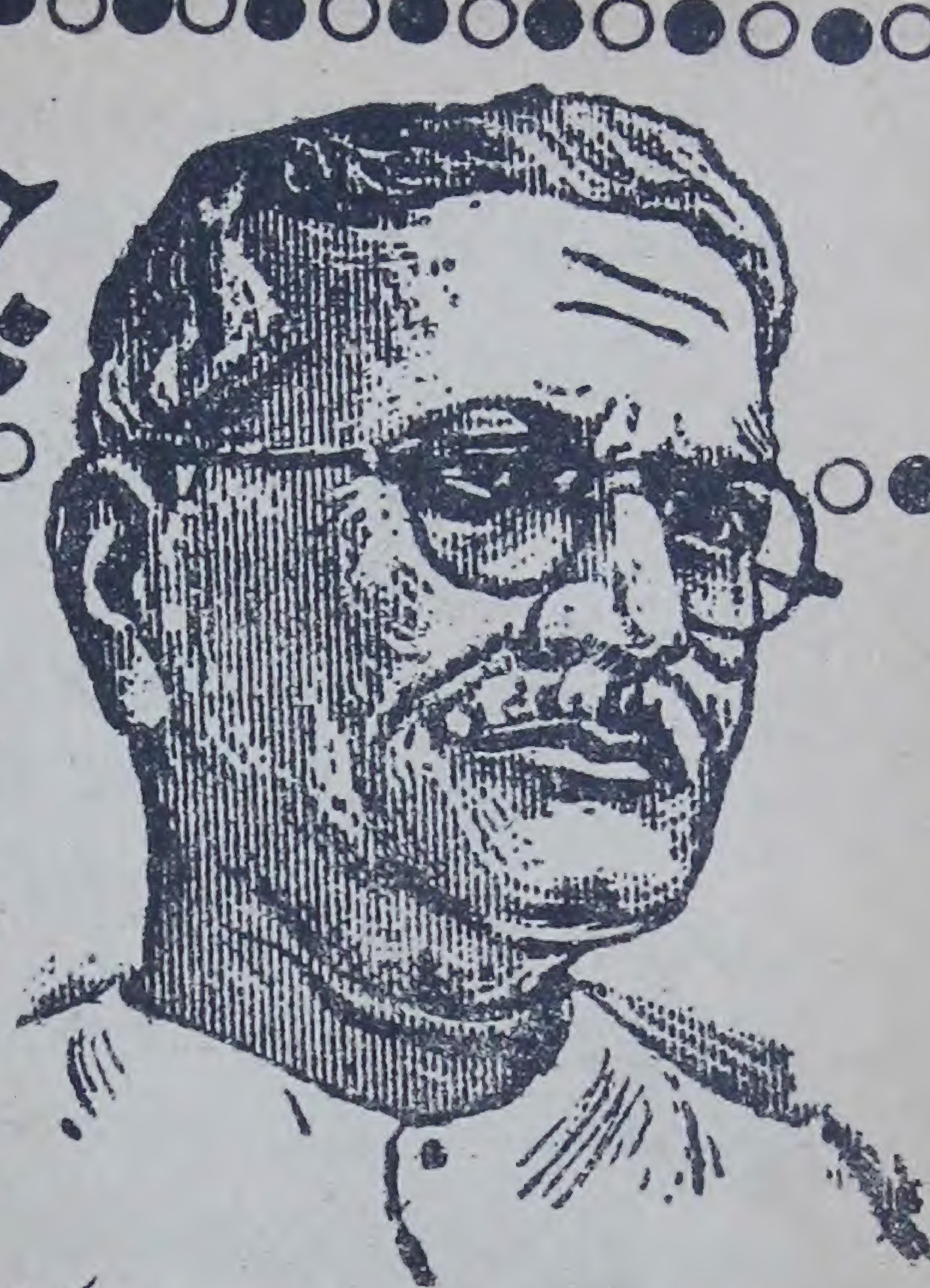
میرا صبح کے تارے کا سا حُسن، میری چاندنی کی سی بے داغ جوانی، میری نسوانی دولت تھی۔ جب تک یہ میرے پاس تھی، میں امیر تھی۔ اُس وقت تک اِک دُنیا میری پرستار تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے میری یہ دولت مجھ سے چھین لی ہے، میں ایک مفلس بھکارن بن کر دَربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے.....

مرد نے ڈانٹ کر کہا ——

ایک بار کہہ دیا کہ طلاق لینا ہے تو لے، ورنہ زبردستی گھر سے کھینچ کر باہر کر دُوں گا۔ لیکن پھر بھی بک بک جھک جھک کئے ہی جاتی ہے!

آہ، بے وفا مرد! نفس پرست مرد!!

چند تجربے



(۱)

لیجئے، میرے دوست شری کھنہ اور اُن کی بیوی کی بات سُنیئے۔ شری کھنہ ایک ایماندار، محنتی اور بھلے سرکاری ملازم ہیں اور شریمتی کھنہ گھر کی ایک سلیقہ شعار اور خوش طبع مالکن۔ ایک اوسط درجے کا چھوٹا سا گھر، مگر اتنا صاف سُتھرا کہ دیکھیں تو دیکھتے ہی رہ جائیں۔

مذاق میں دوست لوگ کہتے ہیں —— "شریمتی کھنہ جھاڑو سے صفائی نہیں کرتی ہیں، جیبھ سے فرش چاٹتی ہیں"۔ وہ اپنا گھر ایسا رکھتی ہیں کہ جیسے یہ میوزیم ہو، اور اس کی چیزیں استعمال میں نہ آتی ہوں، بس دیکھنے کے لئے سجا کر رکھی ہوں!

ایک دن میں نے پوچھا —— "اتنی صفائی کا راز کیا ہے؟"

شریمتی کھنہ بولیں —— "جو چیز جہاں کی ہے، اُسے وہیں رکھنے کی عادت!" اور تب انہوں نے ایک تازہ بات سُنائی —— "رات کو کھنہ صاحب ایک بجے آئے۔ اُن کے ساتھ سامان بھی تھا۔ آتے ہی انہوں نے کپڑے نکالے، بدلے اور بستر بند کھول کر جوتا جوتے کے سٹینڈ پر رکھا۔ چپل پلنگ کے پاس، بستر اندر کی چوکی پہ پہونچایا، میلے کپڑے ڈولی میں ڈالے، ہولڈال تہہ کر کے اُس کی جگہ رکھا، پھلوں کی ٹوکری رسوئی میں رکھ آئے، تھرمس کھونٹی پہ ٹانگ دی، ٹرنک اندر کے کمرے میں رکھا، چھتری کونے میں اور یوں اڑھائی بج گئے۔"

ہم صبح سو کر اُٹھے، تو گھر جیسے کا ویسا تھا۔ دوسرے لوگ ایسے موقعہ پر یہ پھینکا اِدھر، تو وہ مارا اُدھر —— کچھ پلنگ کے نیچے تو کچھ چاروں طرف، غرض یہ کہ گھر کو ایسا کر دیتے ہیں جیسے

یہاں سے ابھی ابھی راجستھانی لوہاروں کا قافلہ اُٹھا ہو!"
وہ بولیں ـــــــ "بس یہی ہماری صفائی کا راز ہے"۔

(۲)

کھنہ فیملی کے برعکس ہے۔ میرا ایک رشتے دار اور اُس کی بیوی رانی۔ دونوں خوبصورت ہیں، مگر گھر کی خوبصورتی دونوں کو پسند نہیں۔ اُن کا گھر دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ آج ہی اِس گھر میں آئے ہیں اور اُن کا سامان کسی دوسرے گھر سے لاکر ابھی یہاں رکھا گیا ہے۔ ایک چیز یہ پڑی ہے تو دوسری وہ۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کا گھر بھی صاف نہیں رہتا اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ کھنہ صاحب کے گھر کی طرح صاف ستھرا رہے، تو اَدھورا کام کرنے کی بُری عادت چھوڑیئے اور پورا کام کرنے کی اچھی عادت ڈالئے۔

اَدھورے یا پورے کام کا گھر کی صفائی سے بھلا کیا تعلق؟ آپ کے دل میں یہ سوال پورے زور سے اُٹھ رہا ہے، مگر اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ گھر کے اَدھورے کام ہی گھر کی صفائی کو خراب کرتے ہیں۔

یہ کیسے؟ اِس طرح کی آپ کا گھر اس وقت پوری طرح صاف ستھرا ہے، ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی کھِل رہی ہے اور آپ نے یہ تہیّہ بھی کر لیا ہے کہ اِسے ایسا ہی رکھیں گے۔ اب آپ کپڑوں کے دَراز میں سے ایک بنیان نکالتے ہیں۔ وہ کہیں کپڑوں میں رکھی گئی ہے، مِلتی نہیں۔ آپ دو چار کپڑے نکال کر کُرسی پر رکھ دیتے ہیں، اور بنیان لے کر باہر کے کمرے میں آجاتے ہیں۔ بس ساری صفائی ختم سمجھئے، کیونکہ آپ نے اَدھورا کام کیا اور کپڑوں کو جیسے کا ویسے نہیں رکھا۔
آپ کے بعد آپ کا لڑکا آگیا۔ اور وہ اپنی جگہ پر رکھی اُس کُرسی کو کھینچ، اُوپر کی الماری میں رکھا اپنا کھیل اُتار کر کرسی کو وہیں چھوڑ جائے گا۔ اس کے بعد لڑکے کی ماں جی آئیں گی اور وہ کپڑوں کی مرمت کر کے، قینچی سے کٹی کترنیں اور سوئی دھاگہ والا ڈبّہ وہیں چھوڑ جائیں گی ـــــ اور بس، آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی آپ کا گھر کباڑی کی دکان بن جائے گا۔

ہے نا اَدھورا کام گھر کی صفائی کا دُشمن؟



مارنے والی ماں

ہ رمٹی کی بات ہے۔ کالج سے آنے پر دیکھا کہ راج (چھوٹا بھائی) اپنے کمرے میں کُرسی پر اکڑوں بیٹھا رو رہا ہے۔ قریب جاکر اس کا مُنہ اُوپر اُٹھایا تو اِس کے بائیں گال پر اُبھر آئے طمانچہ پہ نظر پڑتے ہی میرا کلیجہ تڑپ اُٹھا۔ پُوچھنے پر اس نے سِسکتے ہُوئے بتایا کہ نارائین بھائی کو جواب دینے کی بات پر تاؤ کھا کر ماں نے اِس کے طمانچہ مار دِیا۔ مَیں مانتا ہُوں کہ راج شرارتی ہے۔ مگر بچے پر طمانچہ کا ہمیشہ ہی اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات ماں سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں میرے بھی کان مروڑ دِیئے جائیں، کیونکہ ماں کا غُصّہ کافی تیز ہے۔ آخر اس اُلجھن کا حل میرے دماغ میں آ ہی گیا۔

مَیں نے راج سے کہا ـــــ "بھیّا! جاکر ماں سے کہو رام دادا کہہ رہے ہیں کہ ایک گال پر بنا ہُوا طمانچہ ذرا بُرا لگتا ہے اور جب ایشور نے دونوں گال ایک جیسے بنائے ہیں تو ایک ہی کو کیوں بد رنگ کیا جائے؟ اس طرح دُوسرے گال کے ساتھ ناواجب رعایت سمجھی جائے گی۔ لہٰذا دُوسرے گال پر بھی اگر مہربانی ہو جائے تو اچھا رہے گا۔ اِتنا کہہ کر اپنا دائیاں گال

ماں کے آگے کر دینا۔ سمجھے؟ جاؤ تو"
وہ بولا ——"دادا! ایک طمانچے سے تو یہ حالت ہو گئی، دوسرے طمانچہ سے مُنہ کا حُلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ بولنا بھی مُشکل ہو جائے گا"
مَیں نے اُسے پچکار کر کہا——"نہیں، تم جاؤ تو! مَیں کہتا ہُوں، کچھ نہیں ہوگا"۔
آخر وہ میری بات مان گیا۔
ماں کے پاس جا کر میری بات کہہ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا داہیاں گال ماں کے سامنے کر دیا۔ ماں تو آخر ماں ہی رہتی ہے۔ غُصّہ تو عارضی ہوتا ہے۔ ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے لپک کر راج کو گلے سے لگا لیا۔ اور مار کھاتے ہُوئے اس کے بائیں گال کو چُومتی ہُوئی بولی——"اُف! مَیں بھی کتنی بے رحم ہُوں"۔
اُس دِن سے اَب تک گھر میں کسی پر بھی ماں کا ہاتھ نہیں چلا ہے۔ جبکہ پہلے ہر دُوسرے دِن ایک نہ ایک پٹ ہی جاتا تھا۔ (اِرام ناتھ)

پیار کی جیت

"مُنّی دَوڑ، میری قینچی تو اُٹھا لا۔ وہ سامنے میز پر میرے سینے کی پٹاری میں رکھی ہُوئی ہے"۔
دُو منٹ تک یہ دیکھ کر کہ مُنّی ہلی بھی نہیں۔ ماں نے ذرا زور سے کہا——"مُنّی! سُنتی نہیں! ذرا دَوڑ کر قینچی اُٹھا لا"۔
مُنّی چُپ چاپ بیٹھی اپنی گُڑیا کی ساڑھی ٹھیک کرنے میں مشغُول رہی۔ ماں کی بات جیسے اُس نے سُنی ہی نہیں۔
اَب تو ماں جھڑک کر بولی:"مُنّی، کیا سُنتا نہیں؟ مَیں نے قینچی مانگی تھی۔ فوراً گُڑیا کو چھوڑ اور ماں کی بات سُن، کیا بات ہے؟ اِتنی سُستی کیوں؟"
اَب بھی مُنّی کُچھ نہیں بولی۔ ماں کا غصّہ بڑھنے لگا۔ یہ سُستی نہیں ہے، کوئی نئی بات ہے۔

غصّہ سے بھرائی ہوئی آواز سے ماں نے کہا ——"منّی، یہ کیا بات ہے؟ فوراً اُٹھ اور قینچی لاکر مجھے دے جا"!

ڈر سے سہم کر منّی نے اپنا سر اِس طرح ہلایا کہ ماں کو صاف معلوم ہو گیا کہ وہ اُس کا حکم ماننے کو تیار نہیں ہے۔

اَب تو ماں کے غصّہ کا پارہ چڑھ آیا۔ بڑی رُوکھی آواز سے، لال پیلی آنکھیں کر کے بولی "اچھا، اپنے کمرے میں جا، جب تک حکم نہ ملے وہیں رہ۔ آج تیرے باؤجی سے کہوں گی! میری لڑکی ایسی ضدی ہو، یہ میری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے؟

اُدھر بیچاری منّی کا بُرا حال تھا۔ اپنی چارپائی پر پڑی ہوئی آنسوؤں کی مالا پرو رہی تھی اور بار بار یہی پچھتاوے میں تھی کہ باؤجی نا معلوم کتنے ناراض ہوں گے! "شام کا کھانا بند!" —— باؤجی نے ماں کی شکایت سُن کر ایک دم آرڈر نکال دیا۔ ایسی عادت ہمیشہ کے لئے روکنے کا صرف یہی علاج تھا! باؤجی نے ماں کی بات سُن کر یہی فیصلہ کیا۔ بیچاری منّی کی بات کسی نے نہ سُنی! باؤجی نے بھی اُس سے کچھ نہ پُوچھا۔

شام ہوتے ہوتے ماں کا غصّہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ منّی کے بغیر گھر کی چہل پہل بند تھی۔ ماں کا دل کام میں نہ لگتا تھا۔ آخر کار ماں کی محبّت غصّے پر غالب آئی اور وہ آہستہ آہستہ منّی کے کمرے میں پہنچی۔

منّی چونک پڑی۔ ماں نے اُسے گود میں بٹھا لیا، مگر ابھی تک پیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد بولی —— "بیٹی منّی! تم نے اپنی ماں کا کہنا کیوں نہیں مانا؟ پہلے تو تم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میری پیاری منّی۔ بھلا کہیں ماں کا کہنا نہ مانتے"۔ کہتے ہوئے اُس نے منّی کا مُنہ چوم لیا"۔

اَب تو منّی سِسک سِسک کر رونے لگی۔ ماں کے بہت پیار کرنے اور پُچکارنے پر بولی —— "تُم نے پہلے ہی مجھ سے پیار کی باتیں کیوں نہیں کیں؟ میں جب تم سے کسی بات کے لئے کہتی ہوں، تو جب تک نرمی سے نہ کہوں، کیا تم میرا کام کبھی کرتی ہو؟"

ٹھیک تو ہے۔ منّی بھی چاہتی ہے کہ ماں اُس سے حلیمی اور شائستگی سے بات کیا کرے۔

ماں مُنّی کو تو ہمیشہ حلیمی کی تعلیم دے اور اپنے برتاؤ میں اُسی تعلیم پر عمل نہ کرے! یہ کیسے اندھیر کی بات ہے!

کتنا دُکھ اور کلیش عموماً ہر گھر میں، ہر روز، صرف اسی لئے پیدا ہوجاتا ہے کہ ماں پیار اور نرم برتاؤ کو بھول جاتی ہے۔ (ساگر رام ایم۔اے)

یہ ڈر، یہ خوف



اس بار گرمیوں کی تعطیل اپنے ایک دوست کے ہاں ڈیرہ دُون میں بیتی۔ ایک دن کی بات ہے کہ میں باہر کے کمرے میں بیٹھا اخبار بینی میں منہمک تھا، دفعتاً اندر سے دوست کے تین سال کے چھوٹے بچّے مُنّے کے رونے کی آواز سُنائی دی، روتے روتے اس نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ آخرکار اخبار کو ایک طرف رکھ کر اندر جانا ہی پڑا۔ دیکھا، مُنّے کو نہلایا جا رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ چیخ رہا تھا۔

میں نے اُس کی ماں سے پُوچھا، آخر یہ پانی سے اس قدر خوف کیوں کھاتا ہے؟

اس کی ماں نے جواب دیا ـــــ "یُونہی" اسی طرح رویا ہی کرتا ہے"۔

وہاں مجھے بیس دن اور رُکنا تھا۔ میں نے کہا ـــ "اچھا کل سے آپ لوگ مُنّے کو نہلانے کا کام میرے سُپرد کریں"۔ اس کی ماں مُسکرا کر رہ گئی۔

مُنّا مجھ سے بہت مانوس تھا، اب میں جب بھی نہانے جاتا اسے اپنے ہمراہ لے جاتا اور بالٹی یا ٹب میں پانی بھر کر اس کی گیند اس پانی میں ڈال دیتا۔ مُنّا گیند کھیلنے کا بہت شوقین تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ہی سہی لیکن اس گیند کو نکالنے کے لئے آگے بڑھتا۔ میں اس سے گیند لے کر پھر پانی میں ڈال دیتا۔ وہ پھر اسے نکالتا۔ یہی بات اس کے دوسرے کھلونوں

کے ساتھ بھی پیش آئی - رفتہ رفتہ منّے کا پانی سے خوف دور ہونے لگا، اور کاغذ کی ناؤ چلانا اس کی ایک 'ہابی' بن گئی۔

نہاتے وقت میں ایک لوٹا پانی اپنے اوپر ڈالتا اور اپنے چہرے کو مضحکہ خیز بناتا، منّا تماشہ دیکھتا اور خوش ہوتا - اسی درمیان موقع پاکر ایک آدھ لوٹا پانی اس پر بھی ڈال دیتا - اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہوتے، لیکن اب منّا رونے کی بجائے اپنے کو سنبھالتا اور میری ہی طرح ہنسنے کی کوشش کرتا - میں نے نہانے کو اس کے لئے ایک کھیل بنا دیا - اس میں وقت تو ضرور لگا، لیکن آخرکار مجھے کامیابی ہو کر ہی رہی - اب ایک طرف منّے کی چھوٹی سی بالٹی ہوتی، چھوٹا سا لوٹا ہوتا، اور دوسری طرف میری بالٹی اور لوٹا - ہم دونوں اطمینان سے نہاتے، پھر تو دھیرے دھیرے منّے میاں صابون بھی اپنے ہاتھوں ہی سے استعمال کرنے لگے، اس کی ماں یہ سب دیکھ کر حیرت میں آگئی - اور شرمندہ ہوئی۔

یہ بات صرف ہمارے دوست کے ہی گھر کی نہیں، ہم سب کے گھر کی ہے، خوف ایک فطری جذبہ ہے، جو بلا امتیاز بچے، جوان، بوڑھے ہر ایک میں ہوتا ہے - جسے لوگ عموماً سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے - بچوں کو پریشان کرتے ہیں اور خود اپنے لئے بھی پریشانی اکٹھا کرتے ہیں۔

(اجودھیا پرشاد - پروفیسر)

جھوٹ کا بیج!

وہ تھی دو برس کی ایک چالاک لڑکی - ایک دن وہ اپنے ماتا پتا کے ساتھ کسی کے گھر گئی - وہاں اسے داکھ، بادام وغیرہ کھانے کو ملے - کچھ اس نے کھائے، باقی کو بچا کر وہ رکھنا چاہتی تھی - اس نے اپنی ماں سے میوہ کی ایک پڑیا بنوا لی - اور اسے ہاتھ میں بلتے رہی - اتنے میں اس کے سنگی ساتھیوں نے اسے کھیلنے کے لئے پکارا - لڑکی نے ایک نظر اپنے ہاتھ پر ڈالی اور دوسری نظر سے سامنے پڑی ہوئی گیند دیکھی، اس کے دل میں کشمکش چل پڑی - کچھ دیر ٹھہر کر اس نے سوچا اور پھر پڑیا کو ہاتھ میں دبائے ہی وہ کھیلنے دوڑ پڑی۔

اُس کی ماں نے اُس سے کہا۔ "پُڑیا یہیں رہنے دو، لَوٹ کر لے لینا"۔ لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔ پُڑیا کے ساتھ اُسے کھیلنے میں دِقّت تو ہوتی تھی اور پُڑیا رکھنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ اُسے مِل نہیں رہی تھی۔ ماں نے کہا —— "لا میرے پاس رکھ دے! میں اُسے سنبھال کر رکھوں گی"۔ اُس نے اِنکار کر دیا۔ وہ بولی —— "نہیں، نہیں، تمہارے پاس نہیں"

باؤجی نے کہا —— "اچھا تو مجھے دے دو۔ میری جیب میں رکھ دو۔ میں اُس کو سنبھال رکھوں گا"

لڑکی کا دِل اِس کے لئے بھی تیار نہ ہوا۔ دُور ایک کُرسی پڑی ہوئی تھی، لڑکی اُس پر پُڑیا رکھ کر کھیلنے چلی گئی۔ ماتا پِتا دونوں ہنس پڑے

ماں نے کہا —— "دیکھو تو کتنی چالاک ہے"

باؤجی نے کہا —— "بیوقوف ہے، بے وقوف۔ کیا ہم چاہیں تو کُرسی پر سے پُڑیا لے نہیں سکتے؟ لاؤ، پُڑیا اِدھر لاؤ۔ میں اُسے چھُپا دوں"

سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ مگر میں دِل میں بہت دُکھی ہُوئی۔ میں نے سوچا۔ اِن ماں باپ کو یہ دیکھ کر شرم کیوں نہیں آتی کہ اُن کی دو برس کی بھولی لڑکی تک اُن کا اعتبار نہیں کرتی؟ ابھی ابھی وہ اپنی بِنا اسکا ایک سخت ریزولیوشن اِن پر پاس کر چکی ہے پھر بھی یہ ہیں کہ بے شرم کی طرح ہنس رہے ہیں۔ اور اِتنے مُورکھ و بے رحم ہیں کہ لڑکی کی پُڑیا چھُپا کر اُسے حیران کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُس کے دِل میں جو تھوڑا بہت اعتبار رہ گیا ہے، اُسے بھی ختم کرنے پر کمربستہ ہیں!

کئی ماں باپ اِس طرح اپنے بچّوں کا اعتبار کھو بیٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر کہ سچ کہنے سے بالک ضِد کرے گا اور ہمارے کام میں رُکاوٹ ہوگی، ماں یا باپ بالک سے جھُوٹ بولتے ہیں۔ ماں جب باہر جانا چاہتی ہے، تو کہتی ہے —— "نہیں، مَیں نہیں جاؤں گی"۔ جب اُس کے سنگی ساتھی کچھ کھانے کی تیاری میں ہوتے ہیں تو کہتی ہے —— "نہیں، وہ نہیں کھائیں گے"۔ اِس طرح کا جھُوٹ دِن میں ایک دو بار نہیں، کئی کئی بار بلکہ ہمیشہ بولا جاتا ہے۔ پہلے تو بالک کو اپنے ماتا پِتا پر اور بڑوں پر اعتبار بھروسہ ہوتا ہے، اِس لئے اُن کی ہر بات کو سچ ہی مانتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے بالک کو جھُوٹ کا پتہ لگ جاتا ہے۔ تب سے وہ برابر چوکنّا

رہنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُسے پتہ چلتا ہے کہ بڑے تو ہمیشہ جھوٹ ہی بولا کرتے ہیں۔ بس اُس کا اعتبار ٹوٹ جاتا ہے۔

اِس طرح ماں باپ اپنی کرتوتوں سے بہت ہی چھوٹی عمر میں بالک کے اخلاق کو تباہ کر دیتے ہیں۔ بعد کو بڑا ہونے پر اخلاق سکھانے کے لئے وہ اپنے اسی بالک کو کبھی اس اُستاد کے پاس تو کبھی اُس ٹیچر کے پاس، کبھی اِس کالج میں تو کبھی اُس کالج میں بھیجتے ہیں۔ لیکن خود اِس بات پر مطلقاً غور نہیں کرتے۔ کہ خود جھوٹ بول کر کس طرح انہوں نے اپنے بچوں میں جھوٹ کا بیج بو دیا ہے، اور اُن کی شردھا کو کس طرح بیخ و بُن سے اُکھاڑ ڈالا ہے۔ (نارد ایڈیوی)

صحت اور خوراک

اِس ایڈیشن کی مدد سے آپ کھانے پینے کی روزمرہ کی غلطیوں سے بچکر اپنے کو ہر طرح سے تندرست، چست اور توانا رکھنے کا گُر پا جائیں گے۔

● یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ صحت کا بننا یا بگڑنا بہت حد تک درست یا غلط خوراک پر منحصر ہے۔ لہذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تندرست رہنے اور جسم کی طاقت قائم رکھنے کیلئے ہمیں کیا کھانا پینا چاہیئے، کیسے کھانا پینا چاہیئے اور کب کھانا پینا چاہیئے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کھانے پینے کی مختلف اشیاء کو کیسے ایسے طریقہ سے ملایا جائے کہ ہماری روز مرہ کی خوراک ہمیں مختلف امراض سے محفوظ رکھ کر صحت و طاقت دے سکے۔ اِس ایڈیشن میں بتایا گیا ہے کہ:- ● کس کس غذا سے کس طرح زیادہ سے زیادہ غذائیت اور طاقت ہو سکتی ہے ● کون کون سے تازہ پھلوں اور خشک میوؤں کا ہماری صحت پر کیا اثر ہوتا ہے ● دالوں اور ساگ سبزیوں کے صحیح استعمال سے ہم اپنی کایا پلٹنے میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں ● بچوں، عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بیماروں کے لئے الگ الگ صحت بخش و خوش ذائقہ خوراک کے دلچسپ تجربے ● دماغ کی پرورش و تقویت کرنے والی چہرے کی رنگت کو نکھارنے والی بگڑے مزاج کو درست کرنے والی نیز دردناک امراضِ جسمانی پر فتح پانے والی، اور جسم کو دنوں میں مضبوطی و توانائی بخشنے والی خوراک کے حیرت انگیز کرشمے ● پڑھ کر آپ عش عش نہ کر اُٹھے تو کہیئے گا۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ رجسٹری محصول ۸ر

دلچسپ آپ بیتیاں

شہر کا فیشن



اُس دِن سچ مچ میری شامت آگئی۔ جو بیٹھے بٹھلائے دِلّی کی سیر کرنے کا شوق چرّا اُٹھا۔ پورے گیارہ آنے کے پیسے ٹکٹ بابُو کی نذر کرکے مایدولتنہ دِلّی جا دھمکے۔ بے بہا دُ کی گرمی پڑ رہی تھی۔ گدّی پر بیٹھے ہُوئے موٹے تازہ لالچی سیٹھ سے کسے پیسے کی طرح پگھل رہے تھے۔ چھبیلوں پر لوگ پانی نہیں، اُمرت لُوٹنے کے لئے اُمڈے پڑے تھے۔ سُنا جاتا ہے، برف فیکٹری والوں نے اُس دن برف کا دام دُگنا بلکہ چوگنا کر دینے کا منصوبہ باندھ لیا تھا۔ ایک شربت والا کہہ رہا تھا کہ پچھلے سال کی گرمی تو یونہی چلی گئی۔ ہاں اس سال بھگوان نے چاہا تو گھر پختہ بن جاوے گا اور گھر والی کے بدن پر ہزار پانچ سو کا سونا ضرور لد جائے گا۔ مَیں نے بھی اُسے دو گلاس شربت کے

ایک دم دس پیسے دے ڈالے، وہ بھی کیا کہے گا، کہ ہوئی تھی کیسی رئیس کی ملاقات۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ایک صاحب مل گئے۔ وہ ایک چلتا پرزہ شاعر ہیں۔ ہم لوگ گھومنے گھامتے ایک بازار میں پہنچے۔ سامنے سے عورتوں کا ایک جھا جھمتا جھماتا چلا آرہا تھا میں نے پوچھا:۔



"بھئی! انہیں کوئی سزا ملی ہے؟"

"نہیں تو......!"

"پھر اپنے گھر والوں سے جھگڑ کر آئی ہوں گی"؛

"مجھے تو معلوم نہیں ہوتا"؛

"تو پھر سورج دیوتا ضرور اُن کے ساتھ کچھ رعائیت کرتے ہوں گے"؛

شاعر صاحب کی عقل، معلوم ہوتا ہے، کہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے چلی گئی تھی۔ حیران سے میرا مُنہ تاکتے رہ گئے۔ مجھے بے چارے پر ترس آگیا؛

"دیکھئے نا! ایسی سخت گرمی میں بھی یہ کیسی بھاری بھاری پوشاکیں پہنے ہیں۔ اِن میں کم از کم سیر سوا سیر تو سلمہ ستارہ ہی لدا ہوگا، اور پاؤں میں اُونچی ایڑی کی جُوتی۔ واہ واہ! گرمی میں گرم چائے کا نسخہ ہے!"

"اجی! یہ تو یہاں کا فیشن ہے۔ یہ کہیں دعوت پر جا رہی ہیں"؛

"فیشن ہے! ایسا فیشن کس کام کا صاحب! لوگ تو مارے گرمی کے اُبلے جا رہے ہیں اور یہ اتنے بھاری بھاری کپڑے پہنے گھوم رہی ہیں۔ شائد انہیں گرمی نہیں لگتی؟"

"لگتی کیوں نہیں۔ ایسا نا۔ اری کی بات تو یہ ہے، کہ یہاں کی عورتوں سے زیادہ گرمی اور شاید ہی کہیں کی عورتوں کو ستاتی ہو۔ اسی لئے یہ بے چاری ان دنوں روٹی تک نہیں بناتی ہیں"۔



"روٹی نہیں بناتی ہیں؟

پھر گھر والے کیا خالی پانی پر قناعت کرتے ہیں؟ چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ پیسہ بچتا ہوگا"۔

"اجی نہیں۔ بازار سے کھاتے ہیں۔ دیکھتے نہیں آجکل ہوٹل والوں کے پو بارہ ہیں!"

"ایسا!"

"جی ہاں۔ یہاں کے اکثر گھروں کی یہی حالت ہے۔ بہت تھوڑے سے خوش نصیب ہی گرمی میں دیوی جی کے ہاتھ کی پکی کھاتے ہیں۔ زیادہ تر ہوٹل کے میز کی ہی رونق بڑھاتے ہیں"۔

"اور یہ ـــ یہ کیا ہوا پھانکتی ہیں"؟

"ان کے لئے بھی وہیں سے روٹی آجاتی ہے"۔

"اور اگر کوئی مہمان آگیا"؟

"ہوٹل کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے"۔

"ذرا ٹھہریئے میں پیشاب کر آؤں!"

وہاں سے جو میں کھسکا، تو سیدھے گھر آکر ہی پناہ لی۔ راستے میں ٹکٹ لینا بھی

بھول گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ کوئی چیکر نہیں ملا۔ اِس ڈر کے مارے اُپنے دوست کے پاس بھی نہیں گیا۔ کہ کہیں اُن کی دیوی جی پر بھی شہر کا پانی چڑھ گیا ہو، اور وہ مجھے ہوٹل سے ہی نپٹا دیں ؏



جھوٹی خیرات

چند دِنوں کی بات ہے، مَیں ایک مندر کے باہر بیٹھا ہُوا تھا۔ اِتنے میں ایک سیٹھ صاحب پھل مٹھائی کا ایک بڑا ٹوکرا مزدور سے اُٹھوائے ہُوئے وہاں تشریف لائے، وہ میرے واقف تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتلایا کہ وہ اِس سارے سامان کو سادھوؤں فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے کِسی کام کے ہوجانے پر ایسا دان کرنے کا پرن کیا تھا۔ اَب اُس کو پُورا کرنے لگے ہیں۔ پچیس روپئے اِس سارے سامان پر خرچ ہوگئے ہیں۔ مزدور ٹوکرا وہاں اُٹھا لایا۔ اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھے۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا، کہ وہ مصیبت زدہ ہے۔ سیٹھ صاحب نے مزدور کو ایک پیسہ دیا۔ وہ ہکّا بکّا سا رہ گیا۔ بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کی۔ "سیٹھ صاحب یہ کیا؟ نصف میل کے فاصلہ سے اِتنا وزنی بوجھ اُٹھا کر لایا ہوں اور آپ صرف ایک پیسہ دیتے ہیں۔" سیٹھ صاحب نے

جواب دیا۔ "تمہیں ایک پیسہ کم لگتا ہے۔ آخر یہ جگہ ہے کتنی؟" اس کے ساتھ اُنہوں نے ایک پیسہ اور دیا۔ مزدور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے ہاتھ جوڑ کر مزید مطالبہ کیا۔ اس پر سیٹھ صاحب کا پارہ تیز ہوگیا۔ جیسے کہ وہ اس قسم کا جواب سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ غصے سے فرمانے لگے۔ "تم لوگوں کو بات کرنے کا شعور نہیں۔ مفت میں میرا وقت ضایع کرتے ہو۔ دو پیسے سے زیادہ نہیں دوں گا۔ ضرورت ہے تو لے لو، ورنہ جاؤ۔" مزدور نے دست بستہ عرض کی۔ "حضور، غریب آدمی ہوں، آپ کی جان کو دعائیں دوں گا۔ دو آنے کوئی زیادہ نہیں ہیں۔" مگر سیٹھ صاحب کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زیادہ دینے کو تیار نہیں۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ "سیٹھ جی، غریب پر دیا کیوں نہیں کرتے؟ پچیس روپے کا یہ سامان دان کر رہے ہو، مگر اس کو اٹھانے والے کے لئے آپ کے پاس دو آنے نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ دو آنے کا مستحق نہیں۔ اتنا لمبا فاصلہ اتنے بوجھ کو آپ اٹھائیں تو اس کے مطالبہ کی صداقت آپ کو معلوم ہو جائے۔ اگر آپ مجھ سے متفق نہ بھی ہوں تو بھی آپ کو مجھ پر دیا کر کے دو آنے دینے چاہئیں۔ جب پچیس روپے کے پھل بلا مانگے لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے تیار ہیں، تو مزید دو آنے کی ادائیگی میں اعتراض کیا۔ جبکہ آپ کو علم ہو چکا ہے، کہ یہ بھی مستحق ہے اور اس کی آمدنی قلیل ہے۔ اور بچے زیادہ۔ کیا آپ کے خیال میں صرف وہی شخص خیرات کا مستحق ہے۔ جس نے باقاعدہ فقیر اور گداگر کا جامہ اختیار کر لیا ہے اور مزدوری کر کے پیٹ پالنے والا اس قابل نہیں کہ آپ اس کی خود بخود امداد کریں۔"

سیٹھ صاحب ہکے بکے سے ہو گئے، ان کا چہرہ بتلاتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں، تاہم اُنہوں نے دو آنے مزدور کے حوالے کر دیئے اور وہ دعائیں دیتا ہوا چلتا بنا۔

مسکراہٹ کی قیمت

مجھے ایک مرتبہ کاربالک صابن کی ضرورت پیش آئی۔ اچھا صابن کہیں نہیں ملا۔ آخر کار ایک دکاندار کے ہاں دستیاب ہوا۔ یہ دکاندار شہر کا سب سے بڑا تاجر ہے۔ لاکھوں روپیہ کا سرمایہ دکان میں لگا ہوا ہے، اور کم سے کم دکان میں بیس آدمی ملازم ہیں۔ جب میں داخل ہوا اور کاربالک صابن

مانگا تو پہلے شخص نے کہا۔ میں صرف بنیان موزے بیچتا ہوں، آپ اگلے سیلز مین سے دریافت کیجئے۔ اگلے سیلز مین نے مجھے چوتھے آدمی کے پاس اور چوتھے آدمی نے مجھے دکان کے سب سے آخر میں جو آدمی کھڑا تھا اُس کے پاس بھیج دیا۔ آخری سیلز مین کے پاس گیا تو اس نے مجھے واپس تیسرے سیلز مین کے پاس بھیج دیا :

معلوم نہیں آپ کو کبھی کسی عدالت میں مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے جانا پڑا ہے یا نہیں، لیکن مجھے بد قسمتی سے دونوں حیثیتوں سے عدالت کے پیش کاروں، اہلمدوں اور ناظروں سے ملنے کا واسطہ پڑا ہے۔ اور یقین جانئے ان عدالت میں کام کرنے والے سخت گیر اور خشک مزاج اہلکاروں سے مجھے اتنا ڈر نہیں لگتا، جتنا ان زبردست دکانداروں کے سیلز مینوں سے۔ ان میں سے کسی آدمی کے چہرے پر میں نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ ان میں سے کوئی آدمی بہت زیادہ مصروف نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی جس آدمی سے میں نے کاربالک صابن خریدا، اُس نے مجھ سے سیدھے مُنہ بات نہیں کی :

میں نے اس دکان سے سامان نہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس دکان سے سامان نہ خریدیں۔ اور میری طرح بہت سے ایسے لوگ یقیناً ہوں گے جو اس دکان سے ضرورت کی چیزیں خریدتے ہوں گے۔ اس زبردست دکاندار کے مقابلہ میں ایک گمنام سی گلی کی نکر پر ایک چھوٹا سا بساطی ہے۔ اس کے پاس نہ تو بہت سا سامان ہے اور نہ بہت سا سامان رکھنے کی جگہ ہے۔ لیکن جب میں کبھی اس کے ہاں کوئی چیز خریدنے جاتا ہوں وہ مجھ سے مسکرا کر بات کرتا ہے۔ میں نے کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے۔ اگر ضرورت کی کوئی چیز نہیں بھی ملتی تب بھی میں اس کے ہاں سے ضرور کچھ نہ کچھ خرید لاتا ہوں۔ اس دکان کے گاہک روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اور اب وہ برابر کی دکان کرایے پر لینے کو ہے۔ مجھے بتا رہا تھا کہ اب کام بڑھ رہا ہے۔ اور یہ دکان ناکافی ہے۔ جب تک اس بساطی کی مسکراہٹ قائم ہے، اس کی دکان بڑھتی رہے گی۔ در اصل یہ خوش مزاجی ہی اس کا سرمایہ ہے :

اناطریو کارنیگی امریکہ کا مشہور کروڑ پتی کارخانہ دار چارلس شویب کو ڈھائی لاکھ روپے ماہوار تنخواہ دیتا ہے۔ جب شویب سے پوچھا گیا۔ آپ کو اس قدر تنخواہ کیوں ملتی ہے تو اس نے

جواب میں کہا ــــــ "مُسکراہٹ" کی ؛

مُسکراہٹ کی قیمت کچُھ بھی نہیں۔ لیکن اِس کا نفع زبردست ہے ؛

یہ ایک لمحہ میں گذر جاتی ہے لیکن اپنی شیریں یاد ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتی ہے ؛

کالج کی لڑکی

میرے پڑوس میں ایک وکیل صاحب رہتے ہیں۔ وُہ جو کچُھ کماتے ہیں، اپنا رُعب رکھنے میں سب خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ اُن کے کئی لڑکے لڑکیاں ہیں اور سب کو اُنہوں نے اعلےٰ درجے کی تعلیم دِلائی ہے۔ ایک لڑکی بی۔اے پاس کر چکی ہے اور دُوسری بی۔اے میں پہنچی ہے۔ ایک لڑکا بی۔اے پاس کر کے وکالت پڑھ رہا ہے، اور دُوسرا بیماری کی وجہ سے پڑھنا چھوڑ بیٹھا ہے، اور قریب چار مہینے سے بستر پر پڑا ہے۔ مَیں اُن کے گھر اکثر جاتا ہُوں۔ میرے سامنے کچھ ایسے سوالات آجاتے ہیں، جن کا جواب مَیں سوچ نہیں پاتا ؛

ابھی پرسوں کی بات ہے۔ چھوٹی لڑکی کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ ساڑھی کے ایک کنارے پر سیاہی کا ایک چھوٹا سا دھبّہ پڑا ہے، بس اُس نے اُس ساڑھی کو اُتار کر رکھ دِیا، اور سر نیچے کر کے بیٹھ گئی۔ اُدھر موٹر والا ہارن بجا رہا تھا۔ اُس کی ماں نے کہا: "جاتی کیوں نہیں"؟

"کیا پہن کر جاؤں؟ لے دے کر یہ ایک ساڑھی بچی تھی۔ اِس پر بھی سیاہی کا یہ دھبّہ دیکھو"؛

ماں نے کہا۔ "پڑھنے لکھنے والیوں کے کپڑوں پر سیاہی کے چھینٹے پڑ ہی جاتے ہیں۔ اِس میں کونسی شرم کی بات ہے"؟

"نہیں، نہیں! آج مَیں کالج نہیں جاؤں گی۔ کل دیکھا جائے گا۔" لڑکی نے اپنے چھوٹے بھائی کو اشارہ کیا کہ وُہ موٹر والے سے جانے کے لئے کہہ دے ؛

ماں نے بہتیرا سمجھایا، مگر وہ نہ مانی۔ اُس کے پاس ایک ساڑھی اور تھی، جسے وُہ ایک دِن



پہلے پہن کر کالج گئی تھی۔ وہ اچھی تھی۔ مگر آج اُسے وہ نہیں پہن سکتی تھی۔ اُس کا نمبر آٹھ دس دن بعد تھا۔

اُس نے اپنے ماں باپ کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا۔ کہ اُس کے پاس کافی کپڑے نہیں ہیں۔ اُس کی ماں نے مجھ سے کہا" لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں سے بھی زیادہ خرچیلی ثابت ہو رہی ہے۔ کالج کی فیس کے علاوہ سواری کی فیس اور پوشاک کا فضول خرچ۔ سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیا کیا جائے؟

مَیں نے دیکھا کہ اُس لڑکی کی ہمّت نہیں ہے کہ پوشاک میں تھوڑا بھی نقص ہونے پر وہ کالج جائے۔ یہ شائد اس لئے کہ ہمارے مہلا کالجوں میں مغربی فیشن کا بہت زیادہ بول بالا ہو گیا ہے۔ کوئی دلیل نہیں ہے، جو آجکل کی لڑکیوں کو اپنے ماں باپ کو اچھی ساڑھیوں کے لئے ستانے سے روک سکے۔ راون کے ذریعے جُدائی جانے پر سیتا کو جو انتہائی دکھ ہوا تھا، شائد اُس سے بھی زیادہ دکھ آج کل کی لڑکی کو "اپ ٹو ڈیٹ" پوشاک نہ ملنے پر ہوتا ہے۔ یہ روگ اب اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ صرف اسی لئے معمولی حیثیت کے لوگ اپنی لڑکیوں کو اونچے درجہ کی تعلیم دینے سے ہچکچاتے ہیں۔

سُکھ کہاں؟

سر پر چھوٹے چھوٹے بال، بدن پر پھٹی قمیض، گھٹنوں تک پھٹا پُرانا تہمد، دُبلا پتلا جسم، ننگے پیر، ننگے سر ---- اس حلیہ میں یہ ہے ایک خربوزے والا ---- جس کے ٹوٹے ٹوکرے میں تھوڑے سے خربوزے ۔

خربوزے والا سودا بیچنے میں مشغول، تو خریدار اُس سے خریدنے میں ---- یعنی دونوں اپنے داؤ پیچ چلا رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں اپنی ٹٹولتی آنکھوں سے اُس کی پھٹی پُرانی قمیض کو، اُس کے ہڈیوں کے ڈھانچہ کو اور اُس ڈھانچہ میں بیٹھے اُس کے دِل کو ۔

جب وہ اپنے گاہکوں سے ذرا خالی ہُوا، تو میں نے اُس سے پُوچھا ---- "کیوں بھئی، تمہارے پاس کتنی قمیض ہیں؟ میری طرف دیکھے بغیر ہی خربوزوں کو سنوارتا ہُوا بڑی سادگی سے بولا ---- "میرے پاس بس یہی ایک قمیض ہے بابُوجی!" اور بس وہ پھر سے اپنے خربوزوں میں لگ گیا ۔

اُسے اپنی طرف زبردستی کھینچ کر لاتا سا میں بولا ---- "تمہارے گھر میں کون کون ہیں"۔ بولا ---- "باپ ہے، ماں ہے، ایک چھوٹی بہن ہے اور میں ہُوں" ۔

اِن سوالوں کی لڑی میں ایک اور سوال کو جوڑتے ہُوئے میں نے پُوچھا ---- اِن تھوڑے سے خربوزوں کی بکری سے گُزر ہو جاتی ہے تمہاری؟ ایک دم تپاک سے بولا ---- "خدا کا شکر ہے"۔ اِتنے میں ایک گاہک آ پڑا، اور اپنے خربوزوں کو اُلٹا گھما کر اُس سے باتیں کرنے میں لگ گیا۔ میری بات اُس نے بیچ میں چھوڑ دی ۔

میں نے اپنے کو دیکھا تو پایا کہ مجھے اُس پر رحم آ رہا ہے۔ میں اپنے کچھ کپڑے اُسے دیکر اُس کا لباس ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔ میری دِلی ہمدردی اُس کے ساتھ ہے۔ مگر اُس کے وطیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میری یا کسی اور کی ہمدردی کا محتاج نہیں۔ خواہشمند بھی نہیں۔ وہ روزانہ اپنے خربوزوں سے سَوا، ڈیڑھ روپیہ کما کر اپنے گھر والوں کے ساتھ اُسے کھا کر بہت مطمئن

ہے کسی کو کچھ دے نہیں سکتا، تو نہ سہی مگر کسی سے کچھ لینا بھی تو نہیں چاہتا ؛
سچائی یہ ہے کہ سکھ نہ بہت میں ہے، نہ کم میں ——— وہ تو خواہشات کے کسی جگہ ٹھہر جانے میں ہے۔ غریب کا بچہ دو پیسے کے کھلونے سے کھیل کر خوش ہوتا ہے اور امیر کا بیسوں روپے کے کھلونوں سے۔ مگر جہاں تک خوشی کی مقدار کا سوال ہے وہ دونوں میں برابر ہے ؛

شہر سے دُور

شاہدرہ سہارنپور لائیٹ ریلوے کا واقعہ ہے اور ابھی ایک ہی سال پہلے کا۔ ایک نوجوان جاٹ عورت، اُوپر سے نیچے تک زیورات سے لدی ہوئی سر پر ایک بھاری سا گٹھر لئے ہوئے ڈبّہ میں گھُستی ؛

ایک دو اسٹیشن کے بعد اُس نے ایک آدمی سے کہا ——— "میرا گٹھر اس اگلے گیہوں کے کھیت میں پھینک دو۔ وہاں کوئی ہو تو کہہ دینا رام سنگھ کا ہے" ؛

"کھیت میں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا" ؛

"کوئی بات نہیں، پھینک دو جلدی سے" ؛

اُس آدمی نے کھڑکی میں سے گٹھر باہر کھیت میں پھینک دیا ؛

اسٹیشن ابھی ایک میل سے بھی دُور تھا۔ اپنی حیرانی کو نہ دبا سکنے کی وجہ سے میں نے اُس عورت سے پُوچھا :-

"ابھی اسٹیشن تو دُور ہے ؟"

"ہاں، ہمارا گاؤں یہی ہے۔ اتنی دُور سے کون بوجھ لاد کر لاتا" ؛

"اور جب تک تم یہاں پہنچو گی۔ تب تک گٹھر کو کوئی اُٹھا نہ لے جائے گا ؟"

"کوئی نہیں اُٹھائے گا اور اُٹھائے گا بھی تو پُوچھ پاچھ کر میرے گھر پہنچا دے گا" ؛

یہ ایک ہندوستانی گاؤں کی اخلاقی تصویر ہے، جہاں ایس ایس لائیٹ ریلوے تہذیب کو نہیں لے جا سکتی تھی ؛ (ہند رکماں)

پرائیویٹ بات چیت



چند دنوں کی بات ہے۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی۔ ہماری گفتگو پرائیویٹ تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ہم ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ تاکہ وہاں پہنچ کر کوئی کسی قسم کی مداخلت نہ کرے، اور ہم آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے۔ کہ کیا دیکھتی ہوں، ایک سہیلی جو کہ ہم دونو کی اچھی واقف کار تھی۔ وہاں پہنچی، اور ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ ہم اُسے اپنا راز دار بنانے کے لئے تیار نہ تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری اِن کے ساتھ اچھی جان پہچان تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوا کرتا، کہ ہم اپنی ہر ایک بات ہر دوسری سہیلی کے سامنے کر دیں۔ قدرتی طور پر ہمیں اپنا موضوع بدلنا پڑا، گو ایسا کرتے وقت ہمیں بہت تکلیف ہوئی۔ وہ معاملہ اہم تھا اور جلد ہی ہم اِس کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی مختلف معاملات کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ ہم نیم دلی سے جواب دیتی رہیں۔ ہمارے چہروں سے ایک دانشمند عورت بڑی اچھی طرح بھانپ سکتی تھی کہ اُس وقت اُس کی موجودگی ہمیں ناگوار محسوس ہو رہی ہے، اور ہمارا خیال ہے، کہ وہ تعلیم یافتہ سہیلی بھانپ بھی گئی، مگر انہوں نے وہاں سے ہلنے سے نام

نہ لیا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کیا۔ آخر ہمارے لئے اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوں۔ وُہ بھی چلنے کو تیار ہوئی، مگر ہم نے یہ کہہ کر اجازت حاصل کرلی، کہ ہمیں آج جلدی ہے، فلاں مقام پر جانا ہے"۔

ہمارے ہاں یہ بڑی کمزوری ہے کہ ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ دو شخص پرائیویٹ گفتگو کررہے ہیں، خواہ مخواہ وہاں جاکر انہیں سنتے اور اُن کی بات چیت میں دخل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر شریف مرد عورت کا تو یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ دُوسروں کو ایسے ہی آزادی کے ساتھ اپنی گفتگو کرنے کا موقع دے، جیسے کہ ہم خود چاہتے ہیں۔

(بمل کماری)

پنشن کا حق!

ایک دن میں تیل لینے کے لئے صادق تیلی کے ہاں گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بُوڑھا اور کمزور بیل کولہو چلا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "بھئی صادق! اسے تو اب پنشن ملنی چاہیئے"۔ صادق نے جواب دیا۔ "ایک ہفتہ کے اندر اندر میں نیا بیل خرید کے اسے ضرور پنشن دے دُوں گا"۔ یہ بیس سال سے اِس کولہو پر چل رہا ہے۔ جس دن سے میرے ہاں آیا ہے میں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے لگا ہوں۔ میں آپ کے سامنے خدا کو گواہ رکھ کے وعدہ کرتا ہوں کہ چاہے کوئی قصاب مجھے اس کے لئے پانچ سو روپیہ دے، میں ہرگز نہ دُوں گا اور نہ میں اِس سے کام لوں گا، بلکہ اِس کا فوٹو اُتروا کے اپنے پاس رکھوں گا"۔

میں نے صادق کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کہا کہ وہ بیل مرے۔ تو مجھے خبر کردے، میں اُس وفادار بیل کے جنازہ پر پھول چڑھانے آؤں گا۔

ایک سال تک وہ بیل پنشن پر رہا۔ میں کبھی کبھی صادق کے گھر جاکر اسے دیکھ آیا کرتا تھا۔ صادق اور اِس کی بیوی نہائت ہمدردی کے ساتھ اِس بیل کی خدمت کرتے تھے۔ اُن کے کہنے پر میں نے اس کی تصویر بھی اُتار دی تھی۔

چند دِن ہوئے وُہ بَیل مر گیا۔ صادق کا لڑکا مجھے بُلانے آیا۔ مَیں نے بازار سے پھولوں کا ایک ہار خریدا۔ میرے پہنچنے سے پہلے بَیل کی لاش کے پاس کئی آدمی جمع ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے صادق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وُہ کہنے لگا "میرا وفادار بَیل چل بسا"۔ مَیں نے صادق کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور بَیل کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ پھر مَیں نے اِس مجمع کو صادق کے ساتھ اپنی اُس ملاقات کا حال بتایا، اور فرانس کے ایک گھوڑے کی مثال دی، جسے اِس طرح پنشن دی گئی تھی۔

صادق نے پُرنم آنکھوں سے اپنے بَیل کی خُوبیاں بیان کیں۔ ہم سب نے بَیل کی رُوح کے لئے دُعا مانگی۔ پھر اس کی لاش کو ایک چھکڑے میں لاد کے دفن کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ بہت سے آدمی جنازے کے ساتھ تھے۔

مَیں سوچتا تھا —— اِس بَیل نے بیس سال ایک خاندان کی خدمت کی۔ اِسے گھر کا ایک قابلِ احترام ممبر کیوں نہ شمار کیا جائے۔

جب اِنسان اپنے سفرِ زندگی میں جانوروں کو اپنا ساتھی سمجھنے لگے گا، اُس وقت اس کی رُوح سے تکلیف اور خوف کا کانٹا نکل چکا ہوگا۔ (مختار سنگھ)

رواداری کا سبق

آٹھ بجکر بیس منٹ پر امرتسر سے دہلی روانہ ہونے والی ٹرین سات بجے سے کچھ پہلے ہی پلیٹ فارم پر آجاتی ہے۔ اُس روز مَیں ساڑھے سات بجے ٹکٹ لے کر ایک ڈبّہ میں داخل ہُوا، تو مجھے ایک بھلے مانس نے جو شکل و صورت سے کوئی ریٹائرڈ افسر معلوم ہوتا تھا، سیٹ پر بیٹھنے سے روک دیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ساتھ بٹھایا ہُوا تھا۔ اور دونوں کے درمیان ایک گٹھڑی پڑی ہوئی تھی۔ مَیں نے اُسے کہا۔ "آپ اِس گٹھڑی کو اُٹھا کر اُوپر رکھ دیں تو مَیں یہاں بیٹھ جاؤں"۔ وہ کہنے لگے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟ مَیں نے اِنکساری سے کہا۔ "یہ گٹھڑی والی جگہ تو ہے، اگر آپ

اسے دے دیں، تو آپ کی عنایت ہو گی"۔ وہ کہنے لگے۔ عنایت وِنایت میرے پاس نہیں، میں تمہارے لئے خود بے آرام نہیں ہو سکتا"۔ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اسی بھلے مانس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے مجھے کچھ جگہ دے دی، اور میں بیٹھ گیا۔ گاڑی جالندھر چھاؤنی پہنچی تو ایک فاد آور نوجوان جو کسی فوجی محکمہ کا ملازم معلوم ہوتا تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے بھی مذکورہ بالا مسافر سے کہا کہ وہ گٹھڑی اوپر رکھ دے، مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ ادھر یہ نوجوان بھی دھن کا پکا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو ایک طرف دھکیل دیا اور مزے سے بیٹھ گیا۔ اگلے سٹیشن پر ایک سکھ جاٹ اسی کمرہ میں داخل ہوا۔ گٹھڑی کو سیٹ پر دیکھ اُسے ہٹا کر بیٹھنے لگا کہ میرے ہم سفر نے اسے گالی دی۔ نو وارد کو بھی غصہ آگیا۔ اور اُس نے زور سے ایک چپت رسید کر دی۔ میرے ہم سفر نے اُٹھ کر مقابلہ کرنا چاہا تو جاٹ سکھ نے اسے گرا دیا۔ اور گھونسوں اور مکوں کی بارش شروع کر دی۔ دوسرے مسافر نے بڑی مشکل سے اُسے ہٹایا۔ میرے ہم سفر کے کپڑے پھٹ گئے تھے، اور ایک دو جگہ سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ ہم نے اُسے سمجھایا، تو اُس نے روتے ہوئے کہا "میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ میں خود ہی جگہ دینے والا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا"۔

میرے ساتھ والا فوجی نوجوان خوش تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا۔ اگر یہ شخص رواداری سے کام لیتا، اور گاڑی کو اپنی ملکیت نہ سمجھ لیتا، تو ہرگز یہ حالت نہ ہوتی۔

دو رنگ

امرتسر سے آنے والی گاڑی لیٹ تھی۔ میں اس پلیٹ فارم کو چھوڑ کر دوسرے پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ جہاں سہارن پور جانے والی کھڑی تھی۔ گو اس روز میری طبیعت درست نہ تھی مگر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اپنے کام میں مصروف ہوں کبھی کبھی مسافروں کے ٹکٹ دیکھ لیتا تھا۔

ابھی گاڑی کے روانہ ہونے میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مگر تمام ڈبے مسافروں

سے بھر گئے تھے۔ اور جو اس نعمت سے بھی محروم رہ گئے تھے۔ وہ گاڑی کے ڈنڈے تھامے پائیدان پر لٹک رہے تھے۔ جگہ کی تلاش میں مزید مسافر پلیٹ فارم پر اس تیزی سے گھوم رہے تھے کہ انہیں اپنی بھی سُدھ بُدھ نہ تھی۔

گھومتے گھومتے میں نے دیکھا کہ ایک ڈبے کے سامنے ایک سفید پوش بابو صاحب کھڑے ایک فوجی کی خوشامد کر رہے تھے۔ ڈبہ کافی بڑا تھا۔ اور اس میں صرف آٹھ دس فوجی بیٹھے تھے۔ بابو صاحب کہہ رہے تھے۔ "تھوڑی سی جگہ دے دیجئے۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ کل سہارن پور میں پیشی ہے"۔ اور کھڑکی میں کھڑا ہوا فوجی تُرشی کے ساتھ جواب دے رہا تھا کہ یہ فوجی ڈبہ ہے فوجی۔ تم یہاں نہیں بیٹھ سکتا" حالانکہ ڈبہ ملٹری کے لئے تھا نہ فوجیوں کے لئے ریزرو۔

میں چند سیکنڈ تک کھڑا اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ بابو صاحب نہایت عاجزانہ طریقہ پر فوجی سے جگہ کے لئے درخواست کر رہے تھے اور فوجی اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے بُت کی طرح کھڑا تھا۔

جب بابو صاحب کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہونے لگے، تو مجھے اُن پر رحم آگیا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر فوجی سے ذرا سختی سے پوچھا ——— "کیا بات ہے؟"

فوجی میری ریلوے کی وردی دیکھ کر کھڑکی سے علیحدہ ہو گیا اور میں نے بابو صاحب سے کہا ——— "سوار ہو جایئے"۔

(۲)

پلیٹ فارم کے چند چکر کاٹنے کے بعد جب میں اُسی ڈبہ کے سامنے سے پھر گزرا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ بابو صاحب گاڑی میں کھڑکی کے سامنے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ایک بوڑھا شخص کھڑا اُن کی خوشامد کرتا ہوا کہہ رہا ہے۔ "صاحب میرٹھ میں میرا لڑکا سخت بیمار ہے۔ اس لئے اسی گاڑی سے جانا ضروری ہے۔ اگر آپ گاڑی میں کھڑا ہونے کی بھی اجازت دے دیں تو شکر گزار ہوں گا"۔ اور بابو صاحب نہایت کرخت لہجہ میں جواب دے رہے ہیں۔ "اگر جانا ضروری ہے تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لو، اور سیٹ ریزرو کراؤ۔ دیکھتے نہیں یہ ڈبہ فوجیوں کے لئے ہے۔"

——— یقیناً بابو صاحب اپنی دس منٹ پہلے کی وہ حالت بھول چکے تھے۔ جب وہ پلیٹ فارم پر تھے اور قومی کھڑکی کے سامنے۔ اُس وقت اُن میں کتنا اِنکسار تھا اور اب کتنی فرعونیت ؟

فرض شناس



جوانی کے دِنوں میں دِل میں اُمنگوں کے طوفان اُٹھا کرتے ہیں۔ بنا کسی ہچکچاہٹ کے سب بُری بھلی باتوں میں شامل ہو جانا تو معمولی سی بات ہے۔ ایک دِن میں بھی سگریٹ کے دھوئیں سے کلیجے کو جلا جلا کر مزہ بنانے لگا۔ اُس وقت میری عمر لگ بھگ ۱۷ سال کی تھی۔ کالج کے دوستوں کی صحبت نے اور بھی اُکسایا۔ حالت اتنی نازک ہو گئی، کہ ہر منٹ پر سگریٹ کی خواہش ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ راز گھر والوں پر بھی کھُل گیا ؟

ایک دِن شام کو مَیں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پان والے کی دُکان پر کھڑا سگریٹ کا مزہ لے رہا تھا۔ اچانک بڑے بھائی صاحب نا معلوم کہاں سے اُدھر آ نکلے۔ آنکھوں سے آنکھیں مِلیں۔ سگریٹ ہاتھ کی ہاتھ میں رہ گئی۔ بزرگی اور جوانی کا مقابلہ تھا۔ فرض اور عیاشی کا سامنا تھا۔ بھائی صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ آنسوؤں سے بھرے لفظوں میں بڑے لاڈ سے، بڑے پیار سے اُنہوں نے پوچھا ———

"موہن! تم نے سگریٹ پینا کب سے شروع کر دیا ؟"

"آپ بھی تو پیتے ہیں۔" مختصر سے لفظوں میں مَیں نے جواب دیا۔ بات سیدھے سینے سے ٹکرائی۔ بھائی صاحب تڑپنے لگے۔

"اور اگر میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں تو کیا تم بھی چھوڑ دو گے؟" احساسِ ندامت جھک رہا تھا۔ اُن کے الفاظ میں۔

"ہاں چھوڑ دوں گا۔" اپنے آپ منہ سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اُن کے سامنے میرا سر جھک گیا۔ سوچا تھا کہ آج تو خیر نہیں۔ بھائی صاحب بغیر مار لگائے نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن جس پیار سے، محبت سے اور تیاگ کے ساتھ اُنہوں نے کام لیا۔ اُس نے مجھے بھی سگریٹ چھوڑنے کو مجبور کر دیا۔

وہ دِن تھا، اور آج کا دِن ہے۔ بھائی صاحب نے کبھی بھی سگریٹ نہیں پی۔ مَیں نے چھپ کر بھی بہت دیکھا لیکن جب بھی اُنہیں کسی نے سگریٹ پینے کو کہا تو اُنہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا:۔

"جتنا مزہ سگریٹ پینے سے مِل سکتا ہے اُس سے کہیں زیادہ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ موہن نے سگریٹ چھوڑ دی۔ کیا یہ بڑوں کا فرض نہیں کہ جس کام کے لئے چھوٹوں کو روکیں اُسے خود بھی نہ کریں۔" (ٹی۔ پی۔ جھُن جھُن والا)

کرایہ کا مکان

امریکہ میں مَیں اور میرا ایک اور پنجابی ساتھی ایک فلیٹ (ایک کمرہ اور باورچی خانہ) کرایہ پر لے کر اکٹھے رہا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم کو فلیٹ تبدیل کرنا پڑا۔ ہم نے اپنی تمام ردی اشیاء، کاغذ، پُرانے سیپر، پھٹی ہوئی نکٹائیاں وغیرہ پُرانے مکان پر ہی بکھری رہنے دیں۔ ویسے تو ہم ہر روز اپنے کمرہ کی صفائی کیا کرتے تھے۔ لیکن جانے سے تین دِن پیشتر ہم اپنے کمرہ کی چیزیں سنبھالنے اور باندھنے میں مصروف رہے اور بالکل صفائی نہ کی۔ چاروں طرف ردی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ جاتے وقت ہم نے مالکہ مکان کو بُلایا، تاکہ وہ اپنے کمرہ کا سامان

دیکھ لے۔ وہ اندر آتے ہی حیران رہ گئی۔ ہر طرف گوڑا کرکٹ اور گرد و غبار دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل آ گئے۔ لیکن اس نے اپنی مایوسی کا اظہار ہمارے سامنے نہ کیا۔ "اور سب ٹھیک ہے" کہکر اس نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے اور ہمارے لئے نیک خواہشات کا اظہار کر کے واپس چلی گئی۔ ہم بھی اپنے نئے فلیٹ میں چلے آئے ؛

اوپر والی بات سولہ سال پرانی ہو جانے سے بالکل بھول چکی تھی۔ چند دن ہوئے ہمارے پڑوس والی کوٹھی (دہلی) میں رہنے والے انگریز میاں بیوی نے واپس جاتے وقت کوٹھی خالی کی۔ انہوں نے دس دن پہلے اپنا سامان باندھ لیا تھا، اور جہاز روانہ ہونے کی تاریخ کے انتظار میں یہاں رکے ہوئے تھے۔ ہم آخری دن تک دیکھتے رہے کہ بنگلے کی بیرونی سیڑھیاں اور برآمدے وغیرہ روزانہ دھوئے جاتے تھے، شیشے ہر روز صاف کئے جاتے تھے۔ آخری دن میم صاحب نے مجھے کرایہ دیتے ہوئے کہا۔ کہ اس نے نوکروں کو ایک دن کی زیادہ تنخواہ اس غرض سے دے دی ہے کہ وہ ہمارے جانے کے بعد سارا دن لگا کر بنگلہ کو اچھی طرح سے جھاڑ دھو کر اور ہر ایک کمرہ کو صاف کر کے بنگلہ کی چابی آپ کے حوالہ کر دیں گے۔ وہ تو اس دن بنگلہ خالی کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن مہتر اور بہرے نے مل کر کوٹھی کو اچھی طرح صاف کیا۔ اور چابی ہم کو دے دی۔ اسی شام کو جب نئے کرایہ دار آئے، تو کوٹھی جگمگا رہی تھی ؛

اسی وقت مجھے یاد آیا۔ اور میری سمجھ میں بھی آ گیا۔ کہ ہماری امریکہ والی مالکہ مکان کیوں مایوس تھی ؛ (بھارتی)

●○●○●○●●○●○●●○●●○●○●●○●●○●○

آئے دن کی غلطیوں سے بچائے گی

ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" کی کتاب "گرہست شاستر" ہماری ازدواجی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور ہمیں آئے دن کی غلطیوں سے بچانے کیلئے ایک کامیاب کوشش ہے مصنف نے خاوند بیوی کیلئے ایک دوسرے کی فطرت سمجھنے اور فرائض متعلقہ کو خوش اسلوبی سے نبھانے کی عملی سکیمیں پیش کی ہیں۔ طرز تحریر سادہ، پاکیزہ اور غیر جذباتی، واقفیت ضروری، مفید اور دلچسپ "کام شاستر" کے علم کو عیاشی کا مضمون نہ سمجھ کر تندرست زندگی بسر کرنے کا ذریعہ سمجھنے والے اس کتاب کو یقیناً پسند کریں گے ؛ (ایڈیٹر ٹریبون)

پڑوسی



کل رات گیارہ بجے کے قریب جب میری پلکیں نیند کے غلبہ کی وجہ سے بھاری ہونے لگیں، کہ یکدم ایک کرخت آواز سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ۔

پڑوس کے سرکاری بھنگی کی بہن سُسرال سے آکر اپنی بھاوج کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی ۔

بہن کا لڑکا بیمار ہے، اِس لئے اس نے بھتیجی کو اُپنے گھر روک لیا۔ لیکن جب وہ دَوا لے کر گھر پہنچی تو معلوم ہُوا کہ کوئی لڑکی کو آکر لے گیا ہے۔ بہن اِسی وجہ سے بھائی سے لڑنے آئی تھی۔ بھائی گھر پر نہیں، اِس لئے بھاوجہ پر ہی دِل کا غبار نکالنے لگی ۔

مَیں دِل میں سوچنے لگا کہ جب سُننے والی سامنے ہی نہیں ہے تو یہ بے وقوف چِلّا کر محلّے بھر کی نیند کیوں حرام کر رہی ہے۔ مَیں جھنجھلا کر اُٹھا، اَور اُسے خُوب جھاڑ ڈالی !

آج رات کوئی گیارہ بجے جب نیند آنے لگی، تو کانوں میں ایک میٹھی چوٹ پڑنے سے مَیں تِلمِلا کر اُٹھ بیٹھا ۔

پڑوسی کھڑکی میں اُپنا گراموفون رکھے ایک پُرانا ریکارڈ بجا رہا تھا ۔

"جاؤ جاؤ رے سادھو رہو گورو کے سنگ"

میرا یہ پڑوسی یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ اَور ایک اُونچے سرکاری عہدے پر فائز تھا :
مَیں نے دِل ہی دِل میں کہا۔ "کل مَیں ناحق اُس اَن پڑھ اَور بدقسمت عورت پر

ناراض ہُوا، ہمارے ملک کا سارا تانا بانا ہی بگڑا ہُوا ہے ؛

سادھو بابا

ہم سنام سے لاری میں پٹیالہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک سفید کپڑوں میں ملبوس سنت نے اشارے سے موٹر کھڑی کروائی اور پُوچھا۔ "بھئی مجھے پٹیالہ جانا ہے، اور پیسے میرے پاس نہیں" ؛

ڈرائیور نے کہا —— اگر آپ راستے میں تلاشی دینا منظور کریں تو بیٹھ جائیں" ؛

سنت جی نے بڑی سنجیدگی سے یہ بات سُنی، مان لی اور لاری میں بیٹھ گئے ؛

سنت جی بڑے اچھے دکھائی دیتے تھے۔ راستہ بھر بہت سی سبق آموز باتیں کرتے رہے۔ پٹیالہ نزدیک آیا تو ڈرائیور نے بابا جی کو تلاشی دینے کو کہا۔ بابا ٹال مٹول کرنے لگے۔ ڈرائیور کا شک پختہ ہو گیا۔ اور اس نے انہیں زبان پر پختہ رہنے کو کہا۔ اتنے میں پٹیالہ آگیا اور گاڑی کھڑی ہُوئی —— کہ بابا جی چل پڑے۔ ڈرائیور نے بابا جی کو پکڑ لیا اور وہ زبردستی تلاشی لینے لگا۔ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ کئی سواریوں نے بابا جی کو اپنی زبان پُوری کرنے کے لئے کہا۔ کچھ نے یہ بھی کہا کہ سادھو کو بے آبرو نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن ڈرائیور نے تلاشی لے ہی لی۔ جیبوں میں سے کچھ نہ نکلا۔ لیکن کمر میں بندھی ہُوئی لنگوٹی سے پانچ روپے اور کچھ پیسے نکلے۔ ڈرائیور نے کرایہ لے کر باقی واپس کر دیئے ؛

یہ روپے کسی عقیدت مند نے بابا جی کو کار ثواب سمجھ کر دیئے ہوں گے۔ عقیدتمند دل کو یقین ہوتا ہے، کہ سادھو سنتوں کی خدمت ان کا فرض ہے ؛

ہندوستان میں اس طرح کے لاکھوں بے کار سادھو دن رات پھرتے ہیں۔ اگر ایک سادھو دس روپیہ مہینہ بھی خرچ کرے تو بھی کروڑوں روپے سالانہ اس پاکھنڈ کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستان میں خرچ کئے جا رہے ہیں ؛



سچ کی قیمت

میں ایک معمولی سی ۴۵ روپیہ کی ساڑھی لائی - نوکر نے پوچھا - "بی بی جی! یہ کتنے دام کی ہوگی؟" میں نے شان رکھنے کے لئے کہہ دیا - ۱۰۰ روپے کی، دیکھ کپڑا بھی کتنا بڑھیا اور عمدہ ہے کہ برسوں پہن لو، دھولو، ذرا خراب نہ ہو"۔

کئی ماہ گزر گئے، میں اِس معمولی سی بات کو بھول بھی چکی تھی - مگر ایک دِن وہ بھی ایسی ہی ساڑھی لایا تو مجھے وہ بات اچانک یاد ہو آئی - بولا ——— "بی بی جی - میری گھر والی بہت دِنوں سے ساڑھی لانے کو کہہ رہی ہے - میں نے سوچا، خواہ کچھ بھی ہو - آپ جیسی ہی ساڑھی لاؤں گا ایک بار - قیمت زیادہ لگ جائے گی، تو کوئی بات نہیں، ساڑھی تو بہت دِن تک چلے گی - اور اِتنے دِنوں کی تنخواہ جمع کر کے آج لا سکا ہوں"۔

"کِتنے کو لایا"؟ میں نے جلدی سے پوچھا۔

وہ بولا - "جِتنے میں آپ لائی تھیں - اُتنے ہی میں نے دِیئے - ہاں دیکھئے بی بی جی! یہ دُکان دار بھی ایسے ہوتے ہیں کہ غریب جان کر اچھا کپڑا ہی نہیں دِکھاتے - میں نے جب آپ جیسی ساڑھی دیکھ کر دام پوچھا تو بولا ۴۵ روپیہ ہے - میں نے کہا، ایسی ہی کوئی بڑھیا کپڑے

کی دکھاؤ۔ تو بولا، چاؤ نہیں ہے۔ جب پھر میں نے بہت کہا۔ بھیا نکال دو۔ ہماری بی بی جی بھی ایسی ہی تنو روپیہ والی لے گئی ہیں۔ تب بڑی لیت ولعل کے بعد یہ تنو روپے والی نکال کر دی" ❊

میں نے دیکھا، بالکل وہی کپڑا، وہی رنگ۔ میرے دل میں ایک دم دھکا سا لگا۔ سوچنے لگی۔ میری ایک ذرا سی شان نے اس کی خون پسینہ کی کمائی کو بھی لوٹ لیا۔ دل بار بار لعنت ملامت کرنے لگا کہ میرے چھوٹے سے جھوٹ سے ہی یہ ٹھگا گیا ہے۔ تمام دن بڑی بے چینی سے گذرا۔ اُس سے تو کچھ نہیں کہا، مگر پتہ پوچھ کر دکان پر گئی اور کہہ سن کر ۵۵ روپیہ واپس لے آئی۔ کچھ اپنی طرف سے ملا کر میں نے اُسی دن اُسے تنو روپے دیئے اور کہا کہ ساڑھی تم ہماری طرف سے دے دینا ❊

اس ایک دن کے چھوٹے سے واقعہ نے تمام عمر کے لئے میری آنکھوں سے شان اور جھوٹ کی پٹی کو اُتار پھینکا۔ حقیقت میں اُسی دن مجھے معلوم ہوا۔ کہ سچ کی بھی کوئی قیمت ہے ❊ (پریم جگدیش بھٹناگر، کلکتہ)

گندی عادتیں

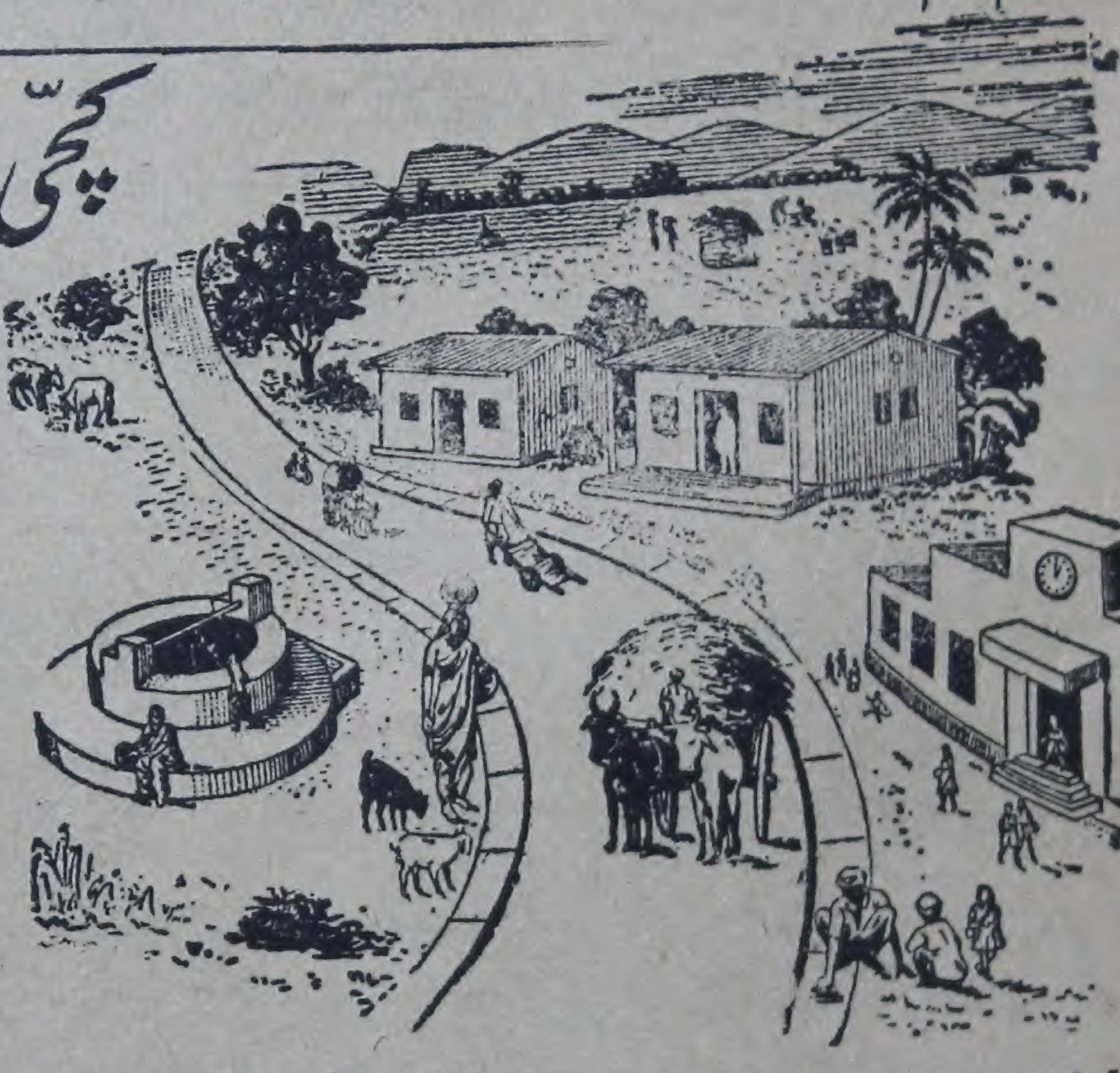
گذشتہ سال ہمیں چند سنیاسیوں کے ہمراہ نالندہ کی یاترا کرنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ ہم لوگ گھومتے گھومتے ایک کنوئیں کے پاس پہنچے، جو اشوک چندر گپت کے زمانہ سے بھکشوؤں اور دیگر مسافروں کی خدمت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ابھی اُس کی ایک اینٹ بھی نہیں اُکھڑی ہے ❊

کنوئیں کے پاس نہایت صاف ستھری جگہ دیکھ کر ہماری پارٹی نے تھوڑی دیر تک آرام کرنے کا ارادہ کیا۔ کھانے پینے کا سامان پاس تھا جو تقسیم کر دیا گیا۔ سب نے مزے سے کھایا پیا اور پیٹ بھر چکنے کے بعد حسبِ عادت پھلوں کے چھلکے، تیل اور بچی ہوئی جوٹھن کنوئیں کے آس پاس پھینکنا شروع کیا۔ میں اس ناجائز حرکت پر غور ہی کر رہا تھا کہ مہاراشٹر

کے براہمن سنیاسی سوامی سچدانند جی مہاراج نے اُٹھ کر وہ سب جُوٹھن اکٹھی کرنی شروع کی۔ تب سب لوگ شرمندہ ہو کر اُٹھے اور سب گندگی اُٹھا کر ٹھیک ٹھکانے لگا دی۔
آج بھی جب مجھے وہ مذموم حرکت یاد آجاتی ہے تو ندامت کا احساس ہوتا ہے۔

ہمارے تیرتھ استھانوں کی دھرم شالاؤں میں پان کی تھوک سے بھرے دروازے اور دیواریں ہماری بدتہذیبی اور عقیدت میں کمی کی شاہد ہیں۔ اگر ہم کچھ خدمت نہیں کر سکتے تو کم از کم جوٹھن تھوک اور امراض تو سماج کی نذر نہ کریں۔ (ہرگوبند رائے بیبونی)

کچّی زبان



میں اپنے گاؤں سے چار پانچ کوس کے فاصلے کے ایک گاؤں میں گیا۔ پھر وہاں سے مجھے بیکانیر کی ریاست میں کافی دُور جانا تھا۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ "مجھے بھی اُدھر جانا ہے، لیکن دوسرے راستے سے چلو۔ اسی راستے سے اکٹھے چلیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے راستے سے تو گاڑی سے اُترنے کے بعد پیدل کافی چلنا پڑتا ہے اور مجھے جلدی پہنچنا ہے۔ اس لئے آپ کے ساتھ چلنے میں مجھے دیر ہوگی۔ اُنہوں نے کہا کہ گاڑی سے اُترنے کے بعد میں اپنے رشتہ دار سے سواری لے لوں گا اور پھر سواری پر دونوں جلدی پہنچ جائیں گے۔

اِس طرح اُن کے کہنے پر مَیں واپس آ گیا۔ اور دُوسرے دِن رات کو گاڑی سے چلنے کی تیاری کی تو اُس دوست نے کہا کہ مَیں تو بڑے ضروری کام کی وجہ سے آپ کے ساتھ جا نہیں سکتا۔ میرے رِشتہ دار ہیں یہ گاڑی میں آپ کے ساتھ جائیں گے اور آگے سواری کا انتظام کر دیں گے۔ اُن کے یقین دِلانے پر مَیں گاڑی سے اُس جگہ پہنچا جہاں سے سواری لے کر آگے جانا تھا۔ میرے دوست کے رِشتے دار راستے بھر تو مجھے پکا یقین دِلاتے رہے کہ مَیں آپ کے لئے فوراً سواری کا بند وبست کر دُوں گا۔ لیکن اسٹیشن سے اُتر کر وُہ مجھے ایک دُوسرے آدمی کے پاس چھوڑ کر نو دو گیارہ ہُوئے :

مجھے اُن کے اِس برتاؤ سے دُکھ تو ہُوا مگر پھر پیدل چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پیدل گھومتے ہُوئے کبھی کسی سے سواری نہ لینے سے مجھے یہاں بھی پیدل چلنے کے لئے تیار ہوتے چنداں سوچنے کی ضرورت نہ پڑی۔ تھوڑی دیر دُھوپ میں آرام کرنے کے اِرادہ سے مَیں گاؤں کے پاس تالاب پر کھڑے پیپل کے نیچے چلا گیا۔ وہاں بیٹھے گاؤں کے دُوسرے لوگوں سے مَیں نے آگے کا سیدھا راستہ پوچھا، تو پاس بیٹھے ایک سکھ بھائی نے کہا کہ اُس گاؤں کے نزدیک تک تو مَیں انہیں اپنے اُونٹ پر لے جاؤں گا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے وہ چلنے لگا تو مَیں بھی تیار ہو گیا۔ گاؤں سے باہر نکل کر جب وُہ اُونٹ پر سوار ہونے لگا تو مجھے چڑھانے سے اِنکار کر دِیا۔ تب مجھے اِس علاقہ کی کہاوت یاد آئی کہ ——"مرد کی زبان اور گاڑی کا پہیہ تو پھرتا ہی رہتا ہے"۔ لوگوں میں اپنی بات کا اِتنا کچا پن اور اعتماد و سچائی کی اِتنی کمی دیکھ کر مجھے دُکھ ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ لوگوں میں اِتنی ہمت نہیں رہی کہ جس کام کو وہ نہ کر سکیں اُس کے لئے صاف طور پر انکار کر دیں۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ لوگ کسی سرکاری افسر یا کسی بڑے آدمی کے سامنے تو ہر ایک کام کے لئے ہاں بھر لیتے ہیں۔ لیکن بعد کو اُن کی آنکھ پھرتے ہی فوراً پھسل جاتے ہیں۔ یہ مرض دِنوں دِن بڑھتا جا رہا ہے اور مزہ یہ کہ اِس طرح زبان کر کے ہٹ جانے کو ہم لوگ کوئی بُرائی ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ تو ایک طرح کا فیشن سا بن گیا ہے :

◎

ناپسندیدہ لہجہ

ہم سنیما دیکھ کر باہر نکلے تھے، رات کا وقت تھا۔ سنیما ہال کا ایک چپڑاسی انعام حاصل کرنے کی اُمید پر ہماری گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اِتنے میں سائیکل سوار پیچھے سے آیا اور اس کی سائیکل چپڑاسی کی ٹانگوں میں ٹکرائی۔ چپڑاسی کو چوٹ لگی۔ وہ تلملایا۔ قصور بائیسکل والے کا تھا۔ کیونکہ گھنٹی کی آواز ہم نے بھی نہیں سُنی تھی۔ چپڑاسی گالیاں بکنے لگا۔ بائیو کو بھی غصّہ آیا تو اس نے بھی جواب میں دو چار صلواتیں سُنا دیں۔ چپڑاسی ہاتھا پائی پر آمادہ نظر آیا۔ تو مَیں نے اُسے روکا۔ لیکن بائیو صاحب نے شاید میرے دخل دینے کو اپنی حمایت سمجھا۔ اس لئے وہ طیش میں آکر کہنے لگا، کہ اس نے گھنٹی بہت بجائی تھی۔ لیکن چپڑاسی اندھا اور بہرہ تھا، جو سڑک پر کھڑا رہا۔ چپڑاسی کو یہ سُن کر بہت غصّہ آرہا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب ہاتھا پائی تک نوبت آنے والی ہے تو چپڑاسی کو سمجھایا کہ وہ میری خاطر صرف ایک آدھ منٹ کے لئے خاموش رہے۔ اُس نے میری بات مان لی۔ پھر مَیں نے بائیو صاحب کو نہایت آہستگی سے صاف اور سیدھے الفاظ میں کہا۔ "قصور آپ کا ہے یا اس کا۔ اس بات کو ایک لمحہ کے لئے بھول جایئے۔ اس کو چوٹ لگی ہے۔ اِس لئے شاید یہ اور بھی گالیاں دے۔ لیکن آپ چُپ چاپ بائیسکل پر سوار ہو کر تشریف لے جائیں۔ گھر پہنچنے پر آپ کو میرے مشورہ کی قدر ہوگی"۔

وہ بائیو صاحب شرمسار تو پہلے ہی تھے۔ میرے کہنے کا کچھ ایسا اثر ہُوا کہ انہوں نے میری بات مان لی۔ چپڑاسی نے دو چار نہایت ہی گندی گالیاں اُس کے پیچھے پھینکیں، بائیو موڑ پر سے لوٹتا ہُوا معلوم ہُوا۔ مَیں نے اُس کو پھر کہا۔ "بائیو صاحب، بائیسکل سے نہ اُتریں۔ چڑھے جائیں۔ ایک منٹ اور بائیسکل کو نہ روکیں"۔ وہ نہ اُترا، اور پھر غائب ہوگیا۔

یہ تکلیف ہرگز نہ ہوتی۔ اگر بائیو سچی ہمدردی کے ساتھ بائیسکل چھوڑ کر چپڑاسی کے پاس آکر کہتا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں۔ معاف کریں، معلوم ہوتا ہے، آپ کو بہت

"چوٹ آئی ہے"۔ اگر پھر کبھی چپڑاسی بُرا بھلا کہتا۔ تو وہ ایک مرتبہ پھر اظہارِ افسوس کرتا تو معاملہ یہ ناخوشگوار صورت اختیار نہ کرتا۔ نیز بابو صاحب کی عزت ہمارے دل میں بڑھ جاتی، اور ہم اس کے وطیرہ سے سبق حاصل کرتے؛

روزمرہ کی زندگی میں آپ دیکھیں گے کہ ایک خوشگوار کلمہ، ایک پسندیدہ لہجہ، ایک نیک وطیرہ، اور ایک دو شیریں الفاظ پر زندگی کے امن کا کتنا انحصار ہے؛

اپنی زبان



میں چند روز کے لئے باہر گیا تھا۔ ریل میں تین چار سٹوڈنٹ ملے۔ ان کی صورت کیسے بیان کروں، پونے پانچ فٹ سے زیادہ کوئی اونچا نہ تھا، دُبلے پتلے، نازک سی کمر، قدم قدم پر پتنگ کی طرح جھپ کھاتے تھے۔ سوٹ بوٹ سے لیس، منہ میں سگریٹ لگائے وہ سب میرے ہی ڈبے میں گھس آئے، آتے ہی پہلے انہوں نے تمام ڈبے پر نگاہ دوڑائی۔ ان کی نگاہ میں کتنا غرور اور تکبر بھرا تھا! اور جتنے مسافر بیٹھے ہوئے تھے، وہ ان کی نگاہ میں جاہل تھے۔ ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے وہ ایک طرف بیٹھ گئے اور لگے بات چیت کرنے۔ اب جو بولتا ہے وہ انگریزی میں —— ہندی اُردو کا نام نہیں۔ باتیں وہی کالج، پروفیسر، امتحان وغیرہ کی تھیں۔ دو گھنٹے تک وہ اس ڈبے میں بیٹھے رہے، مگر اُن کی باتیں ختم نہ ہوئیں اور کسی نے بھول کر بھی ہندی کا ایک لفظ اپنے منہ سے نہیں نکالا۔ ہندوستانی تھے۔ اس لئے شک سا پیدا ہو گیا کہ یہ ہندی اُردو ضرور جانتے ہوں گے۔ ورنہ انہوں نے یہ بات ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ وہ انگریزی کے علاوہ نہ کچھ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ باتیں بھی اُن کی ویسی ہی تھیں فلاں پروفیسر بالکل گدھا ہے۔ پرنسپل صاحب مٹی کے مادھو ہیں، فلاں سٹوڈنٹ کچھ

نہیں جانتا، فلاں کتاب بالکل فضول ہے، وغیرہ جس ڈھنگ سے وہ باتیں کر رہے تھے اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کے خیال میں اُس ڈبے میں کوئی شخص انگریزی سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اِس لئے وہ اپنی پرائیویٹ باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایسی باتیں جو کسی غیر آدمی کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔ جب انہیں گٹ مٹ کرتے دو گھنٹے سے بھی زائد ہو گیا تو مَیں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا —— "یہ لوگ ہندوستانی تو نہیں پڑھتے"۔

میری یہ بات اُنہوں نے سُن لی۔ میرا منشا بھی یہی تھا۔ اُن میں سے ایک بولا ——

کیوں جناب، یہ آپ نے کس طرح جانا ؟

مَیں بولا —— "آپ انگریزی میں اِس طرح بات چیت کر رہے ہیں کہ ہندی بول ہی نہیں سکتے"۔

دُوسرا سٹوڈنٹ بولا —— "واہ صاحب، ہندی تو ہم لوگوں کی مادری زبان ہے"۔

مَیں نے تعجب ظاہر کرتے ہُوئے کہا —— "مادری زبان ہندی ہے، تب تو کمال ہی کر دیا آپ نے۔ دو گھنٹے تک آپس میں انگریزی ہی بولتے رہے۔ دُنیا میں شائد ہی کبھی دو فرانسیسی ساتھ رہ کر فرانسیسی نہ بول کر انگریزی یا جرمن بولتے رہے ہوں۔ ایسا موقعہ شائد ہی کبھی آیا ہو، جب دو جرمن باہم دو گھنٹے تک کسی غیر ملکی زبان میں بات چیت کر رہے ہوں"۔

تیسرا —— کیوں، کیا انگریزی بولنا گناہ ہے ؟"

مَیں —— گناہ ! یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ اِس میں گناہ کیا ہوگا ؟ گناہ تو ہندی بولنا ہے !

ایک اور صاحب بول اُٹھے —— بات یہ ہے کہ پرائیویٹ باتیں ہو رہی تھیں۔ اِس لئے یہ لوگ انگریزی میں بات چیت کرتے رہے۔ ہندی بولتے تو ہم لوگ سب سمجھ لیتے۔ یہ سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔

اِس کے بعد پھر انہوں نے انگریزی میں بات نہیں کی، ہندی ہی بولتے رہے۔ مَیں نے سوچا —— چلو اِتنا کیا کم ہے، انہیں کچھ محسوس تو ہُوا۔

○

سنت موچی

اُس روز ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ چاروں طرف پہاڑوں کی اُونچی اُونچی چوٹیاں بادلوں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بارش کا موتی جیسا پانی جھرنوں کی شکل میں گر رہا تھا۔ کہیں اس کی آواز تیز تھی کہیں پر دھیمی۔ ہوا تیز تھی۔ ہم لوگ معمولی سے کپڑے پہن کر چلے تھے۔ ہوا اور پانی کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم لوگ سردی محسوس کرنے لگے۔

جس پہاڑی راستہ سے ہم سفر کر رہے تھے۔ اس پر کسی شخص نے پہاڑی کا کچھ حصہ کاٹ کر دو جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کچھ بڑی تھی اور دوسری بہت چھوٹی، جب ہم لوگ اس جھونپڑی کے نزدیک پہنچے تو وہاں سے ایک پہاڑی مہلا نے ہم لوگوں کو ٹھٹکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ہمدردی کے ساتھ کہا:-

"باہر پانی پڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ"۔

ہم لوگ تو پچاس قدم سے سوچتے آ رہے تھے کہ اس جھونپڑی میں کچھ دیر ٹھہر کر پانی سے اپنا بچاؤ کریں گے، اس مہلا کے خود دریافت کر لینے سے ہمارے لئے وہاں ٹھہر جانا اور بھی آسان ہو گیا۔ ویسے تو ان لوگوں میں شردھا اور پریم ان لوگوں کی بہ نسبت ہوتا ہی بہت زیادہ ہے جو شہروں میں رہتے ہیں۔ ہم سب لوگ چھپر کے نیچے کھڑے ہو گئے —— اس پہاڑی عورت نے ہمارے لئے اپنی چارپائی خالی کر دی، بڑی عزت کے ساتھ بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ہم سب لوگ کھڑے ہی رہے۔

ہمارے کچھ ساتھیوں نے اپنے رومال جیب سے نکالے اور اپنے اپنے منہ پر لگائے اس کی وجہ تھی۔ جھونپڑی میں بدبو تھی۔ چھوٹے چھوٹے چمڑے کے ٹکڑے کئی جگہ پڑے تھے۔ ان پر پانی پڑ چکا تھا، چمڑے کے کئی اور بڑے ٹکڑے پہلے سے پانی میں پڑے بھیگ رہے تھے۔ اس جھونپڑی میں سیلو کا سب کچھ تھا۔ وہ کانگڑے کی طرف کا رہنے والا ایک بڑا سجن پہاڑی موچی تھا، اپنی عادت کے مطابق ہم نے سیلو کا دل ٹٹولنے کے لئے پوچھا:-

"کہو بھائی سیلو، آج تو تمہارے گھر پر بہت سے مہمان آ گئے"۔

"پھر کیا فکر ہے!"

"اچھا بھائی، کیا کھلاؤ گے؟"

"گھر میں آٹا رکھا ہے، نمک کی روٹی بنوا دوں گا"۔

"اگر روٹی نہ کھائیں؟"

"تو مالک! ابھی ذرا سی دیر میں ہی چاول لے آؤں گا۔ تھوڑی دور پر بنئے کی دکان ہے۔ اُسی سے بُورا بھی لے آؤں گا"۔

"بُورا چاول کھلاؤ گے بھائی؟"

"مہاراج، یہاں تو یہی چیزیں مل سکتی ہیں"۔

"سیلو، تمہارا آٹھ روز کا کمایا پیسہ اِس پر خرچ ہو جائے گا۔ تم اپنا گذارہ چلانے میں تکلیف محسوس کرو گے"۔

مہاراج میری ایسی قسمت کہاں، جو آپ جیسے مہمان ملیں، داتا سب کچھ دیتا ہے"۔

اسی عرصہ میں سیلو کا چھوٹا بچہ رونے لگا۔ مسکراتی ہوئی سیلو کی عورت اپنے بچہ کو اُٹھا لائی۔ اسے چمکارا، پیار کیا۔ اور بات کی بات میں ہی اُسے چُپ کرا دیا۔ وہ ہمارے پاس ہی ہمارے ساتھ والی پروفیسرنی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہم لوگوں کو اپنی جھونپڑی میں بیٹھے دیکھ کر بہت خوش تھی۔

(۴)

ہم نے سیلو کی بابت کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کے ہاتھ کی وہ صفائی بھی دیکھی جو وہ پہاڑی جوتے بنانے میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے دِلی خیالات بھی معلوم کئے جو اس نے چاول اور بُورا کھلانے میں ظاہر کئے۔ اس نے ہمیں بھگتی رس کے کچھ پرانے شاعروں کے دوہے بھی سنائے۔

بارش بند ہوگئی۔ ہم نے آگے چلنے کی تیاری کی۔ سوچا کہ چھوٹے بچے کو کچھ پیسے دے دیئے جائیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور جیسے ہی لیشو دا کو پیسے دینے کی کوشش کی ویسے ہی سیلو کہنے لگا:-

"مہاراج ایسا نہ کرنا"

"بھائی سیلو، بچہ کو دو چار پیسے دے دینے میں کیا نقصان ہے، ہم تو تمہارا چاول پورا کھانے کو تیار تھے اور تم ہمارے پیسے دینے کو بھی بُرا سمجھتے ہو؟"

"آپ کے پیسے سر آنکھوں پر، لیکن یہاں تو بہت سے یاتری آتے جاتے ہیں، یہاں کبھی کبھی کچھ دیر بیٹھ جاتے ہیں باتیں کرتے ہیں، ہنس بول کر چلے جاتے ہیں۔ اگر ان کے پیسے لے کر رکھنے لگوں تو میرا دل بھکاری ہو جائے، مالک اپنے پیسے اپنے پاس ہی رکھو"۔

سیلو کی بات نے ہمارے دل پر گہری چوٹ لگائی۔ اس نے اپنے دل کو بھکاری نہ بننے دینے کے لئے نہ معلوم کتنے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہوں گے۔ ہم نے اس بات کو پکڑ لیا۔ کہ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کا دل غریب نہ تھا۔ (لشمبر سہائے)

سنسار ہمارا

میں تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ موٹروں کی بھیڑ کے باعث سڑک کی بائیں طرف تھوڑی دیر کے لئے کھڑا ہو گیا، اچانک میری نظر پاس والی دکان کے سائن بورڈ پر گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا

—— "ہندوؤں کے واہ سنسکار کے سامان کی پرانی دکان"۔

اسے پڑھنے کے لیے میں نے دکان کو دیکھا، مریل دکاندار کالا کمبل اوڑھے بیٹھا تھا، اس کے سامنے بانس کے ٹکڑے کے کئی گٹھے رکھے تھے۔ بغل میں کفن کے تھان، دکاندار نے مجھے پُر امید نگاہ سے تھوڑی دیر دیکھا پھر راستے کی طرف نظر دوڑا کر کسی کا انتظار سا کرنے لگا، دوسری طرف سے دو تین آدمی دکان کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے، انتہائی دُکھ اور غم نے اُن کی زبان چھین لی تھی، میں سمجھ گیا کہ یہ گاہک ہیں، بس وہاں سے چل پڑا۔

اب میں اُدھر سے آیا جایا کرتا اور اُس دُکان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچا کرتا۔ کچھ دِن بعد دکان دار چِنتا میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔ دو ایک بار اس کے منہ پر آنسو لڑھکتے ہوئے دِکھائی دیئے ؛

بس اب اِس راہ سے جب مجھے جانا پڑتا، تو بہت ہی دھیمے دھیمے چلتا۔ اس دکان اور دُکاندار کو دیکھنے کے واسطے ؛

چھُٹی کا دِن تھا، خوب فرصت تھی، اُدھر سے گھومتا پھرتا چلا جا رہا تھا، مالک دکان بہت مایوسی کی حالت میں بیٹھا تھا، اُس کی گود میں ایک تین چار برس کا بچّہ تھا، جو رو رو کر اس سے پیسے مانگ رہا تھا۔ دُکاندار اُسے اُمید اور لاچاری بھری آواز میں سمجھا رہا تھا۔ دیکھو بیٹا، ابھی پیسے نہیں ہیں۔ کل سے کچھ بِکری نہیں ہوئی۔ شام تک کوئی گاہک آ جائے گا، تو تمہیں جلیبیاں کھانے کو ملیں گی۔ اور پیسے بھی مِل جائیں گے" ؛

بالک کو اس سے تسلی نہ ہوئی، اُس نے پھر کہا۔ "آج تو روٹی بھی نہیں کھائی۔ ساگ نہیں تھا۔ مجھے ابھی پیسے لاؤ" ؛

اِتنا سُننے کے بعد مجھے اچانک رونے کی دردناک آواز سُنائی دی۔ مَیں نے اُدھر دیکھا پاس والے مکان میں ہی لوگ رو رہے ہیں۔ ایک آدمی چوک کی طرف سے ڈاکٹر کے ساتھ آیا، ڈاکٹر کو دیکھ کر دُکاندار بہت اداس ہُوا، لڑکے نے پھر مچل کر کہا —— "بولتے کیوں نہیں" ؛

"ایشور چاہے گا، تو تمہیں تھوڑی دیر بعد پیسے مِل جائیں گے" ؛

پھر دردناک چیخوں نے میری نگاہ اُدھر کھینچی۔ ڈاکٹر صاحب اُس گھر سے نکل رہے تھے، اُن کے چہرے پر نااُمیدی تھی ؛

تھوڑی دیر بعد اس دروازے کے سامنے عورتوں اور مردوں کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی، کچھ آدمی اندر گئے، کچھ دُکان پر آئے۔ لیکن میری نظر اُس غم سے بھرے ہوئے گھر کی طرف ہی لگی رہی ؛

ارتھی کو لئے "رام بولو رام"۔ "رام نام ست ہے"۔ بولتے ہوئے لوگ مرگھٹ کی طرف تیزی سے بڑھے۔ ایک عورت دردناک چیخ مار مار کر روتی ہوئی ارتھی کی طرف دوڑی، دوسری عورتوں نے اُسے سنبھال لیا ؛

وہ سب رو رہی تھیں، گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ آسمان میں چاندنی چھٹک رہی تھی، تارے ہنس رہے تھے۔ پہلی منزل پر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے دو بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ دکاندار کا لڑکا پیسوں کی خوشی میں اچھل اچھل کر ہنس رہا تھا۔



ایمان کا ترازو

میرے بچپن میں، میرے یہاں مٹھائی کی چھوٹی سی دکان تھی، جسے میری ماں چلاتی تھیں (پتاجی کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا) میری ماں دیوتاؤں میں بڑی عقیدت رکھتی تھی۔ اور صبح شام گنگا اشنان کر کے سورج کو جل دیتے وقت اور رات کو دیا بجھا کر سوتے وقت ہر روز منتر پڑھا کرتی۔ "ہے بھگوان! سب کا بھلا۔ اس کے پیچھے اس تو اناثی کا بھی بھلا۔ اس کی یہ نصیحت تھی، کہ کبھی کسی کو کوئی سودا کم نہ تولنا، مفلسی کی وجہ سے کافی مشکلات میں مبتلا رہنے پر بھی وہ اپنے اس عہد کو نبھاتی اور مشکلات سے بھی پار پا جاتی۔ ایک مرتبہ دیوی کے استھان میں میلہ لگا تھا۔ جہاں دوسروں کے ساتھ ہماری دکان بھی گئی تھی۔ کہیں کا ایک نامی زمیندار آیا جس نے دکانداروں سے نرخ بازار سے کم قیمت پر مٹھائیاں طلب کیں۔ دیگر دکانداروں نے اسی نرخ سے اپنی اپنی مٹھائیاں تول دیں۔ مگر میری ماں نے یہ کہہ کر مٹھائیاں دینے سے انکار کر دیا کہ میرا پڑتا نہیں پڑتا۔ زمیندار نے پوچھا۔ "دوسروں کا پڑتہ کس طرح پڑ رہا ہے؟" ماں نے جواب دیا۔ "میں کہہ نہیں سکتی۔" زمیندار چلا گیا۔ تمام دکاندار مٹھائی بیچ کر خوش ہونے لگے اور ماں کی عقل پر ہنسنے لگے۔ ماں کو افسوس ہوا۔ اس نے دیوی کے پجاری سے کہا ــــ "اندھیر دیکھتے ہیں بابا جی! پڑتہ کسی کا نہیں پڑتا۔ مگر سب نے ڈونی مار کر (ٹھونگا مار کر) یا کم بٹے سے تول کر زمیندار کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ اور مجھے ہنس رہے ہیں، کیونکہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ پجاری نے ماں کو تشفی دی۔ میری

ماں نے کہا ——— "مجھے تسلی ہے مہاراج! میری مٹھائی بکے خواہ نہ بکے۔ مَیں دَر بڑھاکر یا کم تول کر سودا نہیں بیچوں گی۔ ایک دو گھنٹے بعد۔ وہ زمیندار پھر آیا۔ اور ہماری دکان کی تمام مٹھائی میری ماں کے بتلائے ہوئے نرخ پر ہی تولا لے گیا۔ پھر تو ماں کو اتنی مسرت ہوئی کہ اُن کے منہ سے نکل پڑا۔ ایمان والے کا ایمان بھگوان رکھتے ہیں"۔

کم تول یا ناپ کی شکایت گاہکوں کی طرف سے اکثر سُننے میں آتی ہے۔ اِس کا ایک باعث گاہکوں کا خاص مول تول کرنا یا نرخ بازار سے زیادہ طلب کرنا بھی ہے۔ اُس دِن کاشی کی ایک کوئلہ بیچنے والی نے بات پڑنے پر کہا کہ میرا آدھ سیر ا سات چھٹانک کا اور میرا پاؤ تین چھٹانک کا ہے۔ یہ بٹے مَیں نے اس لئے نہیں رکھے ہیں کہ مَیں کسی کو ٹھگ لوں۔ مگر جو کوئی کوئلہ لینے آتا ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ مَیں اُسے زیادہ بھی تولوں اور دو ایک کوئلہ زیادہ بھی ڈال دوں۔ پورے باٹ سے تولنے پر ایسا کرنے سے گھاٹا لگتا ہے۔ نفع تو چولھے میں گیا۔ اور اگر نہ دوں تو گاہک دوسری دکان پر چلے جانے کی دھمکی دیتا ہے۔ لاچار ہو کر ایسا کرنا پڑتا ہے۔ (موہن بی اے)

عورت کی عزت

مَیں دہلی سے سری نگر جا رہا تھا۔ گاڑی میں اُس دن بہت بھیڑ تھی۔ ہمارا ڈبہ بھی چھوٹا تھا۔ بہت سے آدمی کھڑے تھے۔ غازی آباد سٹیشن سے ایک جاٹ عورت ایک ہاتھ میں گٹھڑی اور دوسرے میں بچہ اٹھائے ڈبے میں آ چڑھی اور دروازے کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ اگلے اسٹیشن پر دھکا لگنے سے بچاری بہت مشکل سے گرتے گرتے بچی۔

میری جگہ دروازے سے کچھ دور تھی مَیں نے ساتھی مسافر سے کہا "مَیں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ آپ میری جگہ پر آ جائیے، اور اس طرح سرک کر اس عورت کے لئے جگہ بنا دیں"۔ میرا حکم نہ تھا، درخواست تھی۔ مگر انہوں نے کچھ بگڑ کر لیکچر دینا شروع کر دیا۔

"نہیں صاحب آپ بیٹھے رہیں۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرتی ہوئی کو سانس نہیں آتا۔ کہیں دس منٹ کھڑی تھکنے تھوڑا لگی ہے"۔ اور بھی بہت کچھ کہا۔

میں نے پھر کہا۔ "اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ بچاری کبھی کی کھڑی ہے، ساتھ ہی اسے بالک ستا رہا ہے"۔

اس نے "اچھا" کہہ کر سر ہلایا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر معلوم نہیں وہ بھی کچھ سکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ کھلی جگہ دیکھ کر پھیل کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے:

"کھڑی رہنے دو صاحب! میری بھی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں"۔

یہ ہے ہمارے ملک کے مردوں کے دل میں عورتوں کی عزت!

انسانیت کا سبق

بات بہت پرانی ہے لیکن ذہن میں ابھی تک بالکل تازہ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں میں دہلی پولی ٹیکنک کالج میں پڑھتا تھا۔ جمنا یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ ایک دن ہم میں سے کچھ طلباء نے کشتی پر سیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ کشتی چلانے کا کام مجھے اور میرے ایک ساتھی راجندر کو سونپا گیا۔ ہم نے بخوشی یہ کام کیا۔ مگر ساتھ ہی مشقت زیادہ کرنے کے باعث بھوک بھی بہت زیادہ لگی۔ میں نے اپنے ہمراہیوں کو مشورہ دیا کہ جمنا کے کنارے کے تربوزوں اور ککڑیوں کے کھیتوں میں چل کر جی بھر کر دعوت اُڑائی جائے۔ قرارداد منظور ہوئی۔ اور ہم سب نے بندروں کی طرح تربوز اور ککڑی کے کھیت بُری طرح اُجاڑنے شروع کر دیئے۔ کھیت کے محافظوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ اور پانچ چھ آدمی پکڑنے کے لئے دوڑے۔ ہم بھاگ کر کنارے پر آ گئے۔ اور کشتی پر چڑھ کر بھاگنا چاہا۔ کشتی ریت میں دھنس چکی تھی، اس لئے مجھے اور راجندر کو دھکا لگانا پڑا۔ دھکا لگاتے ہی کشتی تو پہلے ہی چڑھے ہوئے دو ساتھیوں کو لے کر پانی میں بہہ کر لے چلی اور میں اور راجندر پانی میں گر کر ڈوبنے لگے۔ اب ہماری جان پر آ بنی تھی۔ مگر تھوڑی دیر پہلے جو ہمیں پکڑنے کے لئے دوڑے تھے۔ وہ ہی ہمیں بچانے کے لئے بھی دوڑ پڑے اور انہوں نے ہمیں سردی سے باہر نکال دیا۔

ہم دونوں کے چہرے پر خوف اور ندامت کے ملے جلے جذبات عیاں تھے۔ اُن اشخاص کی فراخدلی سے ہم ندامت سے گڑ گئے۔ شرم تھی اپنی بد اعمالیوں پر، اور خوف تھا کہ کہیں یہ سب مل کر

ہماری مرمت ہی نہ کر ڈالیں ۔

مگر جو ہم سوچ رہے تھے اُس کے برعکس ہی ہؤا۔کسان ہمارے پاس ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔سسکتے ہُوئے اُس نے کہا ــــ "تم لوگ نہیں جانتے کہ تمہاری اِس نادانی سے میرے بچّوں کو بُھوکا مرنا پڑے گا۔یہی تو ہماری روٹی کا سہارا ہے، جو کچھ تم نے اُجاڑا اُسے مَیں بازار میں بیچتا تو کم سے کم اِتنا تو کما لیتا کہ بال بچّوں کی رُوکھی سُوکھی روٹی کا بندوبست ہو جاتا"۔

یہ سُنکر ہماری ضمیر نے ہمیں لعنت ملامت کی ۔

اِنسانیت کے ناطے اَب ہمارا بھی کچھ فرض ہو گیا۔مَیں نے اُسے پانچ روپیہ دے کر معافی مانگی۔مگر بُوڑھے کسان نے کچھ عاجزانہ ڈھنگ سے کہا ــــ "نہیں بھیّا۔میری ککڑیاں اور تربُوز تو تین روپے کے تھے۔مَیں پانچ نہیں لے سکتا"۔

اِنسانیت کا اس سے اچھا سبق زندگی میں مجھے کبھی نہیں مِل سکتا ہے ۔ (گیانیندر سیو میرٹھ)

اُوپر والے کا خیال رکھو

مَیں یُونیورسٹی کا اِمتحان دینے گیا۔ریاضی میں اچھی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے ایک چھوٹے پُرزے پر مَیں باریک لفظوں میں فارمُولے لکھ کر لے گیا۔کچھ دیر چالاکی سے دیکھنے کے بعد پُرزہ کمپاس بکس میں رکھ دیا۔شاید ممتحن صاحب نے مجھے دیکھ لیا تھا۔وُہ میرے پاس آئے اور انہوں نے چُپکے سے بکس کھول کر پُرزہ اُس میں سے نکال لیا۔پُوچھا "آج تیاری نہیں کی ہے کیا؟" میرے مُنہ سے جواب نہیں نکلا ۔

پکڑے جانے کے ڈر سے مَیں گھبرا گیا، پرچہ کرنا بھاری ہو گیا۔میری حالت دیکھ کر ممتحن صاحب پھر آئے اور مجھے حوصلہ کے لفظ کہہ کر پرچہ پُورا کرنے کے لئے کہنے لگے۔اِتنے میں ہیڈ ماسٹر آ گئے۔میرا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔مگر مَیں نے دیکھا کہ اُن کے آتے ہی ممتحن نے وُہ پُرزہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا ۔

اِمتحان کے کمرے سے باہر نکلنے پر ممتحن صاحب نے مجھے پیار سے تھپتھپایا اور کہا

"اگر یہ عادت پڑ گئی، تو مستقبل میں بھی تمہیں تکلیف دے گی۔ زندگی کے امتحان میں تم کس پرزے پر جواب لکھو گے؟ اوپر والے کا خیال رکھو، جس سے تم کچھ چھپا نہیں سکتے"
وہ چلے گئے۔ میں سمجھ نہیں سکا، مگر انسانیت کے لئے میری عقیدت دگنی ہو گئی ؛
(نند کمار۔ بمبئی)

مشاہیر عالم کے ذاتی تجربے

مہاتما گاندھی، لوکمانیہ تلک، سر جگدیش چندر بوس، دادا بھائی نوروجی، سر سریندر ناتھ بینرجی، سر رمن، پروفیسر رام مورتی، سوامی وویکانند، سوامی دیانند، سوامی رام تیرتھ۔ دن رات کام کرنے کے باوجود اپنی صحت کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اور ہمارے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو لگاتار ۱۶ گھنٹے سے ۱۸ گھنٹے تک روز کام کرنے اور چوبیس گھنٹوں میں بیس بیس گھنٹے تک تقریریں کرنے کے باوجود اپنے جسم کو تندرست کس طرح رکھتے ہیں۔ خود ان کی زبان سے سنئے۔ علاوہ ازیں سینڈو، گلیڈ اسٹون، راک فیلر، ٹالسٹائی، مسولینی، ہٹلر، میکفیڈن، کارلائل، ایڈیسن، برنارڈ شا، کنگ ایڈورڈ، لائیڈ جارج، سٹالن، ہنری فورڈ، روز ویلٹ وغیرہ دنیا کے چیدہ سینکڑوں مہا پرشوں کے ذاتی تجربات کا نچوڑ، سائنس دانوں کی نئی نئی تھیوریاں اور یوگیوں کے حیرت انگیز معلومات۔ ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" کی شہرہ آفاق کتاب "رہنمائے صحت" میں پڑھیئے۔ صحت کے مضمون پر ایسی شاندار اور اتنی بڑی کتاب اس سے پہلے شاید ہی آپ نے دیکھی ہو۔ صفحات ۱۲، ۱۵۰ تصویریں، تیرھواں ایڈیشن۔ مضبوط جلد ؛

● ایڈیٹر ٹربیون لکھتے ہیں :۔ "اردو زبان میں رہنمائے صحت کے پایہ کی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ مصنف نے اس کی تیاری میں واقعی بہت محنت کی ہے" ؛ ● ایڈیٹر ملاپ لکھتے ہیں :۔ "رہنمائے صحت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اسے برسوں کے گہرے مطالعہ اور تجربات کے بعد لکھا ہے" ؛ ● قیمت صرف چھ روپے، محصول ڈاک ایک روپیہ پانچ آنہ لگتا ہے جو اصحاب قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجیں گے۔ ان کے لئے محصول ڈاک فری ہوگا ؛

کتاب کی لاش

ایک اتوار کی ایک "فارغ از کار" صبح تھی۔ مَیں عبادت کے بعد بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آج دفتر تو نہیں جانا ہے، اِس لئے کوئی ایسا کام سر انجام دیا جائے جو مصروفیتوں کے ہجوم کے باعث عرصہ سے معرض التوا میں پڑا ہو۔ تھوڑے فکر کے بعد مَیں نے طے کیا۔ کہ آج سب سے پہلے کتابی ڈاکوؤں کے قبضے میں گئی ہوئی ایک کتاب کو واپس لایا جائے۔ یہ کتاب خلیل جبران کی کتاب مسائل حیات تھی۔ اِس کا ابھی مَیں نے پہلا باب بھی نہیں پڑھا تھا، کہ ایک حضرت میٹھی میٹھی



باتیں بنا کر اُچک لے گئے تھے۔ جس کے بعد آج تک کتاب اَور کتاب لے جانے والے دونوں کا نیاز حاصل نہیں ہُوا تھا۔ مَیں نے اپنے عزیز شاگرد کے لئے باہر جانے اور عنقریب لَوٹ آنے کی اِطلاع ایک سلپ پر لکھ کر میز پر رکھ دی۔ اور چپل پہن، دھوتی باندھ اَور سر پر دوپٹہ رکھ کر باہر نکل آیا؛

کتاب لے جانے والا ایک سکھ نوجوان تھا۔ قصبے کے عین خاتمے پر میرے مکان سے پورے آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ مَیں اُس کے مکان پر پہنچا۔ باہر دو تین چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ ایک کو پاس بُلا کر اُس نوجوان کا حلیہ بتایا اَور کہا کہ ذرا اُبلوا دے۔ اُس پر بچّے نے اپنی تتلائی ہوئی زبان میں فرمایا۔ "وہ تو گوں گیا وا ہے۔ مَیں سوچنے لگا۔ مَیں نے پُوچھا۔ "گوں کہاں"؟ بچّے نے کہا۔ "دیل میں بیٹھ کر"۔ میرے لئے یہ معمہ ناقابلِ حل ہُوا جا رہا تھا کہ عقل مند بچّے نے کہا۔ "مَیں بھائی کو لاتا ہوں"۔ اور مکان کے اندر

دوڑ گیا۔ دوسرے بچے میری موجودگی سے بے پروا، ٹھنڈی ریت سے کھیلتے رہے۔ بچے گو اُوپر گئے منٹ پر منٹ گزرتے گئے، اور میرا انتظار بڑھتا گیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں کوڑا کرکٹ کا ایک چھوٹا سا انبار پڑا تھا۔ جسے صبح ہی صبح مکان صاف کر کے باہر ڈال دیا گیا تھا۔ اور جسے بھنگن ابھی تک اٹھا کر نہ لے گئی تھی۔ اِن میں چند کاغذوں کے پُرزے اور ورق پڑے تھے۔ انتظار میں کھڑے، اردگرد کی چیزوں کے ساتھ میری نظریں غیر ارادی طور پر ان پر بھی پڑی تھیں۔ یکایک میری آنکھوں میں حیرت کی چمک پیدا ہوئی۔ اور میں نے لپک کر ان کاغذ کے پُرزوں میں سے دو ورق اٹھا لئے۔ یہ میری زیرِ تلاش کتاب کے ہی ورق تھے۔ ایک تصویر تھی اور دُوسرا ورق ۷۹۔ ۸۰ صفحات کا حامل تھا۔ دونوں دھول اور گرد میں لتھڑے اور شکن آلود تھے۔ قابلِ قدر تصویر کے چہرے پر کسی بچے نے شیطان روشنائی سے لمبی لمبی مونچھیں بنا دی تھیں۔ اور آنکھوں میں اُس اندھے والدین کے گمراہ پسر نے پن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیئے تھے۔ مجھے اپنی پیاری کتاب کے اوراقِ پریشاں کی یہ حالت دیکھ کر ایسا غم اور قلق ہوا۔ جو کسی ایسی ماں کو ہو، جس کا بچہ گم ہو گیا ہو۔ اور کسی جنگل میں کسی بھیڑیئے یا چیتے کے بھٹ کے باہر جسے اپنے بچے کے پہچانے ہوئے کپڑوں کی دھجیاں، نچے ہوئے بال اور جسم کے خون آلود ٹکڑے یا ہڈیاں دستیاب ہوں۔ اور وہ فرطِ غم سے پاگل ہو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میرا جی رونے کو چاہا۔ میں نے اُس کوڑا کرکٹ کے انبار کو اور تلاش کرنا شروع کیا۔ تاکہ اگر کوئی اور ورق ہو تو مل جائے۔ مگر مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ مکان کے اندر سے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے جو کتاب اُچکنے والے حضرت کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ بچہ کے ساتھ آ کر کہا۔ فرمایئے! بھائی تو رنگون گئے ہیں"۔

میں نے اپنے غصے اور اضطراب کو دبا کر عرض کی: "وہ مجھ سے ایک کتاب لائے تھے۔ مسائلِ حیات۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ مہربانی فرما کر لا دیجئے"۔ لڑکا اپنے دماغ پر زور دیتا ہوا بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ کتاب میں نے اُن کے پاس دیکھی تھی۔ مگر شاید اُن سے مسٹر بنارسی داس لے گئے تھے۔ اُن کا مکان شاید آپ جانتے ہی ہوں۔ صدر بازار سے اس طرف کو ہے، مجھے فرصت نہیں، ورنہ ساتھ چلتا"۔ وہ یہ کہہ موڑ کر اندر جانے ہی کو تھا کہ میں نے کہا۔ "آپ کی ردی میں سے، مجھے میری کتاب کے یہ دو ورق ملے ہیں۔ یہ کس مصلحت سے علیحدہ فرمائے گئے تھے۔ اس پر وہ

مسکرا دیا۔ بولا۔ مصلحت کیا ہونی تھی، ویسے ہی نکل گئے ہوں گے۔ بھائی صاحب کے جانے کے بعد آج اُن کی بیٹھک کو صاف کیا ہے۔ ردّی کاغذات میں یہ بھی گرے پڑے تھے۔ ہو نا واقفیت کے باعث بچّوں نے کوڑا کرکٹ میں باہر پھینک دیئے۔" وہ اندر کو پلٹ گیا اور میں اپنی شرافت کو کوستا ہُوا نئے مہربان مسٹر بنارسی داس کے درِ دولت کی طرف چل پڑا ؂

مسٹر بنارسی داس کسی وکیل کے منشی تھے۔ حسنِ اتفاق سے مجھے اپنے مکان کے اندر سے باہر نکلتے ہُوئے ملے، وہ کسی کام کے لئے باہر جانے معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ رُک کر بولے۔ "آیئے جناب! آج بھول سے اِدھر کیسے آ نکلے؟" میں نے کہا "بھول کر نہیں جان بوجھ کر آیا ہُوں"۔ کیا آپ کے ہاں مسٹر سُندر سنگھ کی معرفت میری کتاب مسائل حیات بھی پہنچی ہے؟ وہ اپنے ذہن پر معمولی زور دینے کے بعد بولا۔ یہ کتاب؟ دیر کی بات ہے اُس نے یہ کتاب خود مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی اور کہا تھا کہ میری اپنی ہے۔ کتاب کی جلد ٹوٹی ہُوئی اور ورق علیحدہ علیحدہ ہے۔ میں لے آیا لیکن میں نے اُس کو پڑھا نہیں۔ کئی ہفتے میری تپائی پر پڑی رہی۔ بارہ یا شائد پندرہ دن ہُوئے ہوں گے۔ کہ برکت علی تصویر ساز کا لڑکا احمد، جو میٹرک میں پڑھتا ہے۔ میرے ہاں آیا تھا جو اس کتاب کو مانگ کر لے گیا لیکن کم بخت ایک جزو یہیں چھوڑ گیا۔ جو میرے ردّی دان میں پڑا ہے۔ ابھی لاتا ہُوں"۔ اور وہ اُلٹے پاؤں اندر چلا گیا۔ مارے غصّہ میں میری آنکھوں سے خُون اُتر آیا کہ کس طرح ان جاہلوں نے میری کتاب کو مالِ غنیمت سمجھ کر ورق ورق پھاڑا ہے۔ مسٹر بنارسی داس نے مجھے جزو لا کر دیتے ہُوئے کہا۔" ایک گلاس سکنجبین کا لاؤں؟

میں گرمی میں صبح کے وقت ہمیشہ دہی کی لسی پینے کا عادی ہُوں، مگر آج علی الصباح گھر سے مُنہ نہار نکل کھڑا ہوا تھا۔ لیکن میں نے کہا۔ "شکریہ، مجھے اتنا بتا دیجئے۔ کہ یہ احمد اپنی باپ کی دکان پر ملے گا یا گھر پر؟ گھر کی صورت میں مجھے اس کا پتہ بتا دیجئے۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ وہ کونسے محلے میں رہتا ہے۔ مسٹر بنارسی داس بولے۔ "آپ دکان پر جائیں۔ اس وقت عام طور پر وہ وہیں ہوتا ہے۔ اور اگر وہ وہاں نہ ہُوا تو اُس کا محلہ عالی میں ہے۔ وہاں تشریف لے جائیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کتاب آپ کی ہے تو میں اُسے احتیاط سے رکھتا۔ بلکہ آپ کے پاس بھجوا دیتا" ؂

مَیں ایک اضطراری شکریہ کے بعد برکت علی کی دکان کی طرف چل پڑا۔ وہ بزرگ تصویروں اور چوکھٹوں سے گھرا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ بولا۔ "آیئے۔ آپ کی پسند کی کوئی تصویر میری دکان پر نہ ملے گی۔ دیوالی کا آیا ہوا تمام سٹاک بک چکا ہے"۔ مَیں نے کہا۔ "بڑے میاں! اِس وقت مَیں کوئی تصویر خریدنے نہیں آیا۔ بلکہ آپ کے صاحبزادے مسٹر احمد سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس کے پاس میری ایک کتاب ہے۔ کہاں گیا ہے وہ"۔ برکت علی بولا "آپ تشریف رکھیں، مَیں نے خود کسی کام کے سلسلے میں اُسے گھر سے بلوایا ہے۔ وہ یہیں کہیں آتا ہوگا"۔

مَیں کُرسی لے کر بیٹھ گیا۔ اور ارد گرد کی تصویروں پر یونہی نظر ڈالنے لگا۔ احمد آگیا۔ برکت علی تصویر ساز نے میری طرف اِشارہ کر کے کہا۔ "یہ بابو تمہیں بلاتے ہیں"۔ مَیں نے کہا۔ "مسٹر بنارسی داس سے کچھ عرصہ ہوا، آپ ایک کتاب لائے ہیں، "مسائلِ حیات"۔ وہ میری ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے دے دیں۔ وہ فوراً کہنے لگا۔ "دیکھئے صاحب! مَیں اُس کتاب کو لایا ضرور تھا، مگر پرسوں مجھ سے میرا ایک کلاس فیلو نثار لے گیا ہے۔ منڈی میں اُس کے باپ کی دکان ہے جو لوہے کی بنی ہوئی عمارتی اور عام کاروباری چیزیں بیچتا ہے۔ مَیں سلپ لکھ دیتا ہوں، جسے دیکھ کر وہ کتاب آپ کو دے دے گا"۔

کتابی اُچکوں کے پیدا کئے ہوئے اس آوا گون کے چکر میں پھنسی ہوئی اس کتاب کی حالت کا احساس کر کے میرے دِل کو بڑا دکھ ہوا۔ تاہم مَیں نے اپنے جذبات کو دبا کر پوچھا۔ "کیا اسے آپ کے دوست نثار کے پاس سے تو آئندہ کوئی نہ لے گیا ہوگا؟" احمد بولا۔ "نہیں! نہیں! مَیں نے یہ کتاب کل اُسکے پاس دیکھی تھی۔ اُس نے ابھی اس کے پچاس صفحے پڑھے ہیں"۔ مَیں نثار کے نام رقعہ لکھ کر طوعاً و کرہاً منڈی کی طرف چل پڑا۔

آہن فروش کی دکان پر پہنچ کر مَیں نے ایک بڈھے مستری سے، جو ایک لوہے کے بکس پر روغن کر رہا تھا۔ پوچھا۔ "بڑے میاں! ہم مسٹر نثار سے ملنا چاہتے ہیں"۔ قریب بیٹھا ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا جو پیمانے سے ایک ٹین کی چادر سے ناپ رہا تھا۔ اُٹھ کر بولا۔ "یہ مَیں ہی ہوں فرمایئے"۔ مَیں نے جیب سے احمد کا پرچہ نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کتاب میری ہے۔ جس کو دیکھنے کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ براہِ مہربانی عطا فرماویں۔ بغیر کچھ کہے نثار اندر چلا گیا اور ایک لمحہ کے بعد کتاب لا کر مجھے دے دی۔ اسے کتاب کیا، کتاب کی لاش کہا جا سکتا تھا۔ جُزو ٹوٹے ہوئے، ورق پھٹے ہوئے، جلد اُکھڑی ہوئی، کنارے مڑے ہوئے، گتے پانچ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ مجھے کتاب کو اس حالت میں دیکھ

کہ اس قدر دُکھ ہوا کہ نثار کے فوراً کتاب لا دینے پر اُس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ اور پھر ایک مانگ کر کتابیں پڑھنے والا میرے نزدیک کسی شکریہ کا مستحق بھی نہیں تھا۔

مَیں اپنے مکان کی طرف پھرا۔ اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ دھوپ چہرے کو جلا رہی تھی۔ اور جسم پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔ اور مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسے کرم فرما سے تصادم ہؤا۔ جو ہمیشہ مجھ سے مانگ کر کتابیں اور رسالے پڑھا کرتے تھے۔ وہ نہایت اخلاق کے لہجے میں بولے۔ "آداب عرض! آج کوئی نیا رسالہ نہیں آیا؟" مَیں نے نہایت رُوکھے پن سے جواب دیا۔ "اب میرے پاس رسالے اور اخبار آنے بند ہو گئے ہیں۔ کیونکہ مَیں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے"۔

وہ صاحب حیرانی سے بولے۔ "ارے؟ یہ کیوں؟" مگر مَیں نے اُنہیں کوئی جواب دینے کی بجائے گھر کی طرف قدم بڑھا دیا۔

◉

ایسے ہی کرم فرماؤں نے میری تقریباً پچاس روپے کی بیش بہا کتابیں، جن کو مَیں نے اپنی دیگر خانگی اور لازمی ضروریات کو روک کر خریدا تھا۔ اور جن میں سے کئی ایک موجودہ سٹاک کے فروخت ہو جانے اور آئندہ ایڈیشن کے جلد چھپنے کی اُمید نہ ہونے کے باعث نایاب ہو گئی تھیں۔ نہ جانے اُنہیں اپنی قبروں میں دفن کر لیا تھا، یا دوست در دوست منتقل کر کے ملک بدر کر دیا تھا۔ مَیں بیان نہیں کر سکتا کہ اِن نادر تصنیفات کے گم ہونے کا مجھے کس قدر قلق ہؤا مگر پھر حماقت بر جان شرافت کہہ کر صبر کر لیا۔ اور آئندہ کے لئے اپنی نشست گاہ میں یہ سائن بورڈ لکھ کر لگا دیا۔ "ضروری اطلاع"۔ "کتابیں، رسالے اور اخبار مستعار مانگ کر شرمندہ نہ ہوں"۔ اور عہد کر لیا کہ خواہ مجھے کسی سے دُشمنی ہی کیوں نہ لینی پڑے۔ سوائے چند علم دوست، قدردان اور خوش معاملہ احباب کے اور کسی کو کوئی کتاب وغیرہ نہ دُوں گا۔ (سیّاح شامی)

●



یہ کالج سٹوڈنٹ

اپنے دوست روپ نارائن کے ساتھ آج ہم
آگرہ کے سینٹ جان کالج کے کولڈ ہوسٹل کے مختلف
مناظر دیکھتے ہیں۔ آپ بھی آجائیے، دبے پاؤں روم نمبر
۱۵ کی طرف۔ دیکھئے، ذرا بھی آہٹ نہ ہونے پائے۔ یہ
مسٹر امبا پرشاد کا کمرہ ہے، جو کہ تحصیل باہ ضلع آگرہ
کے ایک سرکردہ زمیندار کے اکلوتے فرزند ہیں۔ ابھی
آپ آرام فرما رہے ہیں۔ آپ کا رنگ آبنوس کی طرح بالکل
کالا ہے۔ شاید آپ اپنے پکے رنگ سے مطمئن نہیں۔ اسی
لئے تو آپ نے "ہمالی سنو" سے چہرہ چپڑ رکھا ہے۔ بے
فکری سے خراٹے لے رہے ہیں۔ رات کو شاید سنیما سے
دیر سے لوٹے ہوں گے۔ پلنگ پر ایک طرف "مسٹریز آف
لنڈن" نامی کتاب کھلی ہوئی پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے
کہ "حسین لنڈن کی رنگین راتیں" نامی اس کتاب کے
پانچویں باب کو آپ پڑھ رہے تھے، کہ نیند کے غلبہ کی
وجہ سے آپ سو گئے۔ پلنگ کے پاس جو میز پڑی ہے،
اس پر ایک خوبصورت آئینہ رکھا ہے اور ایک برش، ساتھ ہی "افغان سنو" ای۔ ایس پاٹن والا کریم
اور مارکولا ٹینڈ ویکس" کی ایک ویزلینوں کی تین شیشیاں الگ الگ پڑی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھئے، کشن
کے "روز پاؤڈر" کا ایک ڈبہ پڑا ہے، پاس ہی "پف" بھی رکھا ہے۔ ان کے پاس ہی سینٹوں اور
انگریزی ہیئر آئیل کی چند شیشیاں پڑی ہیں۔ مسٹر امبا پرشاد کو ہندوستان کی بنی ہوئی "حسن افزا"
اشیاء شاید پسند نہیں ہیں۔ اسی لئے تو اس کمرہ کی ہر ایک چیز پر "میڈ ان یو۔ ایس۔ اے" کی مہر

نسبت ہے ؛

اب کمرے کی آرائش اور سجاوٹ کی جانب دھیان دیجئے۔ آپ دیواروں پر حسین عورتوں کی تصویریں لٹکتی ہوئی دیکھ کر آنکھیں کیوں ملتے ہیں۔ آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے یہ تصاویر ویسے تو نامکمل سی ہیں، مگر یہاں آرٹ اور مصوری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ان سینما سٹاروں کی تصاویر کو جس نقطۂ نگاہ سے یہاں لٹکائی گئی ہیں، اس کا جواب یہ "محوِ خواب" صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں بوٹوں کے آٹھ جوڑے پڑے ہیں۔ ہر جوڑے کی اوسط قیمت پندرہ سے کیا کم ہوگی؟ اور شاید زیادہ ہی ہو۔ مختلف کھونٹیوں پر رنگا رنگ کے فیشن ایبل کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں دو بڑے بڑے ٹین کے بکس، چمڑے کے تین سوٹ کیس اور ایک چھوٹا ہینڈ بیگ پڑا ہے۔ اور یہ تمام بکس اعلیٰ ترین سوٹوں اور روزمرّہ کے استعمال کی دیگر چیزوں سے اٹے پڑے ہیں۔ ٹین کے بڑے بکس پر ایک ہیٹ اور ٹینس کا ایک ریکٹ پڑا ہوا ہے۔ بکس کے ایک کونے پر رکھا ہوا لیمپ اب تک ٹمٹماتا ہوا پھیکی سی روشنی دے رہا ہے۔ دیکھئے، مسٹر امبا پرشاد نے کروٹ لی۔ اب شاید اٹھنے ہی والے ہیں، اس لئے چلئے، ہم کھسک چلیں اور آگے بڑھ کر روم نمبر ۴ کے مناظر دیکھیں ؛

روم نمبر ۴ کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس میں مسٹر گردھاری لال رہتے ہیں۔ آپ ریاست دھول پور کے معزز پروہت کے لڑکے ہیں۔ لیکن ذرا کواڑ سے جھانک کر دیکھیں تو سہی، کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ ارے ارے، یہاں سے تو بدبو سی آرہی ہے۔ خیر! ناک پہ رومال رکھ کر دیکھیں تو سہی کہ کیا معاملہ ہے۔ ارے، کمرے میں دھواں اڑ رہا ہے، اور مسٹر گردھاری لال دیوار کے ساتھ سگریٹ کے کش لگا رہے ہیں ؛

ہمارے ہمراہی نے ہمیں کان میں آہستگی سے بتایا کہ جب تک یہ حضرت صبح سویرے ہی دو سگار نہ پھونک لیں، انہیں پاخانہ نہیں آتا ؛

اب کمرہ نمبر ۵ میں چلیں، مسٹر شمبھو ناتھ تیواڑی اپنے کمرہ میں موجود نہیں۔ نوکر جھاڑو

دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ بابوجی پاخانے گئے ہیں۔ ہمارے دوست کو ان سے کچھ کام تھا۔ اس لئے ہم سب نیواڑی بابو کی اِنتظار میں اُن کے کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں نوکر جھاڑو دے کر چلا گیا۔ میری ایک عادت ہے، اچھی ہے یا بُری، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ہے یہ کہ میں خاموشی سے کہیں نہیں بیٹھ سکتا، میں یا تو کتابوں کی اُلٹ پلٹ کرتا رہوں گا یا کچھ لکھنے لگ جاؤں گا یا "پاجامہ اُدھیڑ کر سیا کر" کے مصداق تصویریں دیکھنے لگ جاؤں گا۔ یا گانا ہی شروع کر دوں گا۔ غرضیکہ مجھ سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ چنانچہ میری اس چنچل طبیعت نے مجھے یہاں بھی چُپ چاپ نہ بیٹھنے دیا۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ الماری میں رکھی ہوئی پہلے خانے کی کتابیں تو تقریباً سبھی کی سبھی کورس کی کتابیں تھیں۔ اُن کی طرف میں نے سرسری نگاہ دوڑائی۔ نچلے خانے میں ٹوتھ برش، پالش کی شیشیاں، کچھ پنسلیں، فاؤنٹین پن، سائیکل پمپ، کینوس کے بُوٹوں کا سفید پالش، سوان اِنک کی ایک شیشی، اور پومیڈ اور ہیزلین کی دو چار خالی شیشیاں نہایت بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ الماری کے تیسرے خانے میں انگریزی کے کئی ناول پڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہندی کے ڈرامے وغیرہ بھی تھے۔ ساتھ ہی چند حسین عورتوں کی تصاویر بھی پڑی تھیں۔ جب میں نے ان تصاویر کو اُٹھایا تو نیچے تصاویر کا ایک البم پڑا ہوا تھا۔ میں نے ان تصاویر کو تو رکھ دیا، اور البم کو دیکھنے لگا۔ اس البم میں حسین عورتوں کی بالکل عریاں تصاویر تھیں، بالکل برہنہ۔ حسن اپنی پوری جلوہ سازیوں کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے جھٹ اس البم کو بند کر کے رکھ دیا۔ البم کو رکھتے وقت ایک اور کتاب میرے ہاتھ چڑھ گئی۔ اس کتاب کا نام پڑھ لینا میں نے کافی سمجھا۔ اس پر لکھا تھا "چوراسی آسنوں کے خوبصورت ترین فوٹو"۔ چنانچہ میں سب چیزیں جُوں کی تُوں رکھ کر اپنی جگہ پر آبیٹھا۔ معاً مسٹر نیواڑی کے گانے کی آواز آئی۔ آپ گنگنا رہے تھے :۔ "چھا رہی کالی گھٹا، دِل میرا گھبرا رہا!" تانیں اُڑاتے ہوئے آپ کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ کا بدن دُبلا پتلا، گورا گورا نسوانی چہرہ۔ ڈاڑھی مونچھ بالکل صفاچٹ، سر پر بھی لمبی زلفیں! ان میں سے زلف بنگال کی خوشبو آ رہی تھی، ٹیڑھی مانگ صاف صاف دکھائی دیتی تھی۔ آپ نے اس وقت سلک کی ایک پتلی سی قمیض اور تہمد پہن رکھی تھی، اور پاؤں میں خوب چمکدار پمپ شُو!

یہ ہے ہمارے ملک کی ایک مشہور یونیورسٹی کے کالج ہوسٹل کا ہلکا سا خاکہ، جہاں سے ہم وطن کے مایۂ ناز سپوتوں کے نکلنے کی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں :: (مقرا)

ٹھنڈے دل سے سوچئے



گرمیوں کا موسم تھا۔ ابھی میں سویرے سویرے کی نیند کی خماری چھوڑ اُٹھ کر بستر سے پر بیٹھا ہی تھا کہ کچھ لوگوں کا جھپٹ کر ایک سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے حیران ہو کر ایک آدمی سے پوچھا —— "اتنے سویرے ایسے جلدی میں کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ کیا کہیں آگ لگ گئی ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "آپ کو نہیں معلوم؟ خان صاحب کی بہو کنوئیں میں گر گئی ہے"۔

میں بھی فوراً بستر چھوڑ، جائے وقوعہ پر پہنچا۔ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ خان صاحب کی بہو کو کنوئیں سے نکال چکے ہیں۔ اُس کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا ہے۔ سر کٹ گیا ہے اور وہ بُری طرح لہولہان ہو رہی ہے، وہ ہوش میں آچکی ہے اور دو ایک بھلے آدمی اُسے سمجھا رہے ہیں —— "دیکھو، پولیس والوں سے کچھ ایسی ویسی بات نہ کہہ دینا۔ جب وہ تم سے کنوئیں میں گرنے کا سبب دریافت کریں۔ تب تم اُن سے کہہ دینا۔ "میں روزانہ فجر کی نماز پڑھتی ہوں۔ آج گھر میں پانی نہیں تھا۔ اس لئے میں منہ اندھیرے ہی میں پانی بھرنے آئی تھی۔ پاؤں پھسل جانے سے کنوئیں میں جا گری۔ خبردار! اس کے سوا اور کچھ نہ کہنا نہیں تو پولیس تمہیں پکڑ لے جائے گی اور تمہاری بُری حالت کرے گی"۔

اسی وقت کچھ لوگ کنوئیں پر پانی اُنڈیل رہے تھے۔ ایک آدمی نے کنوئیں کے ایک کنارے پر رسّہ اور گھڑا ابھی لا کر رکھ دیا۔ میں اُن لوگوں کا یہ فریب دیکھ دل ہی دل میں بُرا منا رہا تھا کہ پولیس آ پہنچی۔ ایک بھلے آدمی فوراً تھانے دار صاحب کو ایک علیحدہ کمرے میں، تخلیہ میں، لے گئے۔ تھوڑی دیر

کے بعد پولیس کچھ یونہی پوچھ تاچھ کر اور لڑکی کو ہسپتال بھجوانے کا حکم دے کر چلی گئی۔ پانچ چھ روز بعد ہسپتال میں ہی اُس لڑکی کا انتقال ہو گیا ۔۔۔ وہ بڑی ہی خوبصورت تھی۔ ابھی اُس کی عمر ۱۶۔۱۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اُس کا معصوم سا چہرہ بھلانے پر بھی نہیں بھولتا۔ خان صاحب امیر تھے۔ اُنہوں نے روپے کے زور سے حقیقت کو منکشف نہ ہونے دیا۔ انہی کے بہی خواہوں سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ خان صاحب کا صاحبزادہ نامرد ہے۔ کہیں بہو کا چال چلن نہ خراب ہو جائے۔ اسی خدشہ کو مدِ نظر رکھ کر اُن کے گھر کے لوگ اُسے ستاتے رہتے تھے۔ اُس شب کو خان صاحب کے اُس نامرد لڑکے نے اپنی بیوی کو بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ آخر میں بے چاری اُکتا اُٹھی۔ اور اس خوفناک کام کو کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔ اُس کا پھول جیسا خوبصورت جسم مٹی کے ڈھیر میں دبا دیا گیا۔ مگر خان صاحب کا وہ نامرد صاحبزادہ، اب بھی مزے سے گلچھرے اُڑا رہا ہے ؛

اُسی دن مَیں شام کے وقت اپنے دوست کے ہمراہ ہواخوری کے لئے نکلا۔ شہر کے وسط میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کنوئیں پر بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ تجسس نے مجھے بھی کنوئیں کی طرف کھینچا، اور میں نزدیک جا پہنچا۔ تھانے دار صاحب ڈٹے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہی کوئی بیس۲۰ برس کی حسینہ کی لاش کسی پژمردہ پھول کی مانند پڑی تھی۔ حقیقی واقعہ میرے ذہن میں آ گیا۔ تھانے دار صاحب پنچایت نامہ کرا کر لاش کو جلانے کا حکم دے کر چلتے بنے۔ حسینہ کی لاش پر نہایت میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر میں نے سمجھا تھا کہ کسی غریب آدمی کی بیوی ہو گی۔ مگر دریافت کرنے پر پتہ چلا، کہ وہ ایک دولت مند جینی کی بیوی تھی۔ جینی سیٹھ رنڈی باز ہیں۔ بیوی کی گود میں ۲ ماہ کی بچی تھی۔ آپ رنڈی کے عشق میں ایسے پاگل ہوئے کہ بیوی کی خبر لینا ہی بھول گئے۔ اُس دن آپ کی بیوی تین دن کی بھوکی پیاسی تھی۔ جب اُس نے آپ سے کھانا حاصل کرنے کی پرارتھنا کی، تب بے چاری پر مار پڑی۔ آخر بھوک سے نہایت بے قرار ہو کر، بچی کو روتی بلکتی چھوڑ کر بے چاری کنوئیں کی گود میں جا پڑی۔ اُس پاک دیوی کا انجام ایسے دکھ سے ہوا ! مگر روپیہ کے بل پر سیٹھ جی کا بال بھی بیکا نہ ہو سکا ؛

ایک پنڈت جی نمبر ایک کے جواری تھے۔ جواریوں کی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اُن سے کون سے پاپ نہیں ہوتے۔ آپ بیوی کی اور پیارے بچّوں کی فکر چھوڑ ہمیشہ جُوا بازی میں غلطاں رہتے تھے۔ کبھی کبھی آپ کی بیوی اور بچّوں کو بنا کھائے ہی رہنا پڑتا تھا۔ اگرچہ بد اہمتی سیدھی سادی عورت تھی۔ مگر بچّوں کا دُکھ کیسے دیکھ سکتی تھی؟ جب وہ پنڈت جی سے اپنے اور اپنے بچّوں کے دُکھوں کی شکایت کرتی تب آپ انہیں روٹی کپڑا دینے کے بدلے مار پیٹ کر مطمئن کرنا چاہتے۔ پنڈت جی کی بیوی روزمرہ کی بے عزتی اور بھوک کی تکلیف برداشت کرتے کرتے اُکتا اُٹھی۔ آخر ایک دن بچّے کو قسمت کے بھروسے چھوڑ افیون کھا کر سو رہی۔ پولیس کو پتہ چلا۔ اُس نے بد اہمتی کی لاش ہسپتال بھجوائی۔ ڈاکٹروں نے لاش کی چیر پھاڑ کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ لاش پنڈت جی کو دے دی گئی۔ وہ بے قصور ثابت ہوئے اور اب بھی عوام میں ہر دل عزیز بنے ہوئے ہیں ؎

یہ تین واقعات ایک جگہ کے ہیں اور تین دن کے اندر کے ہیں۔ بدقسمت بھارت کی چھاتی پر روزانہ نامعلوم ایسے کتنے واقعات رونما ہوتے ہوں گے۔ مردوں کی بے دردی سے عورتیں تو اپنی زندگی ختم کر دیتی ہیں مگر مردوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگرچہ قانوناً مردوں کو سزا ملنی چاہیئے۔ مگر کہنے کی ضرورت نہیں کہ موجودہ زمانہ میں انصاف کتنا مہنگا ہے!

اس وقت ہندوستان میں ٹکے کے ریٹ پر گواہ مل جاتے ہیں اور اُن کی جھوٹی گواہیاں مردوں کو بے گناہ ثابت کر دیتی ہیں۔ سارا الزام عورتوں پر ہی عائد ہوتا ہے۔ متذکرہ واقعات کے متعلق میں نے کسی کو مردوں کی بُرائی کرتے نہیں سُنا۔ سبھی عورتوں پر ہی دشنام طرازی کرتے دیکھے گئے۔ جب تک بے چاری زندہ رہیں، بدنام ہوتی رہیں اور مر گئیں تو بھی بدنامی نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اگر یہ بے چاری بدچلن ہوتیں تو کیوں اپنی زندگی کا حسرتناک انجام ہوتے دیتیں۔ کسی کے ساتھ بھاگ کر نہ چلی جاتیں۔ پھر نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا۔ جن میں نازک النفس ہونے کے جذبات موجود تھے جن میں عصمت و عفت کا مقدس جذبہ موجزن تھا، اُنہیں ہی اپنی تھوڑی سی عمر میں مردوں کے مظالم پر خود کو قربان کر دینا پڑا ؎

آج سماج کے سامنے مَیں یہ موضوع بہائے غور و خوض پیش کرتا ہوں۔ یہ موضوع ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ اگر ابھی سے عورتوں کی اس خودکشی کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس میں شک نہیں کہ مستقبل میں دیش کے لیئے اس کے نتائج نہائیت مہلک ہوں گے ؛ (جی۔بی ماتھر)

بُدھئی گوالا

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء تک میں انبالہ چھاؤنی رہا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سال کے اس طویل عرصہ میں زیادہ تو میرے ہاں دُودھ صرف ایک ہی گوالے کے ہاں سے آیا ؛

نام تھا اُس کا بُدھئی اور عمر ۵۰ سال سے اُوپر، میانہ قد، گٹھیلا جسم، رنگ گندمی اور سانولے کا درمیانی، اُس کے جسم پر صرف تین کپڑے ہی ہوتے تھے ——— دھوتی، کرتہ اور سر پر پگڑی۔ نہ بہت میلی اور نہ بہت صاف ہی ؛

اُن دنوں سب چیزیں سستی تھیں۔ گھی روپے کا تیرہ چودہ چھٹانک، گیہوں دو پونے دو روپے من، ادروپے میں چار پانچ سیر چینی اور پانچ چھ سیر باسمتی چاول۔ انگور چھ آنہ سات آنہ سیر، بادام آٹھ آنہ سیر اور بڑھیا مٹھائی سات آنہ، آٹھ آنہ سیر۔ پھر بھلا دُودھ ہی کیا مہنگا ہوتا۔ ڈیڑھ دو آنہ سیر تھا ؛

● بُدھئی کے ہاں ۵-۶ بھینسیں اور ۳-۴ گائیں رہتی تھیں۔ یہ مویشی بُدھئی کے چھوٹے سے کُنبہ کے افراد ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ سمجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ بُدھئی نے اپنی ہر ایک گائے بھینس کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ اور انہیں ناموں سے وہ اُنہیں بڑے پیار سے پکارتا تھا۔ اُس کی گائے بھینسیں اکثر اُس کی اپنی ہی گائے بھینسوں کی اولاد یعنی کٹیائیں اور بچھیائیں ہوتی تھیں۔ عموماً یہ کٹیا بچھیا زندگی بھر اُس کے ہی گھر رہتی تھیں، اس لئے اُن کے دُکھ سُکھ ہی بُدھئی کا دُکھ سُکھ ہوتا تھا۔ ماں باپ کی طرح ہی اُن کی دیکھ بھال اور پرورش کرتا تھا۔ "یہ بے زبان جانور ہیں۔ یہ اپنا دُکھ سُکھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ان کو سُکھ دینا تو ہمارا دھرم ہے۔" اور بات بھی یہ تھی کہ انہیں سُکھ دینے میں وہ کوئی کمی نہ رکھتا تھا ؛

انہی گائے بھینسوں کا دُودھ بیچ کر وہ اپنا، اپنے چھوٹے سے کُنبے کا اور اپنے مویشیوں کا

پیٹ پالتا تھا۔ اُس کا بہت سا دُودھ تو گھر پر ہی نکلتے نکلتے بِک جاتا تھا۔ میرے جیسے کاہل اَور مصرُوف آدمیوں کے گھر وُہ خود لے کر آتا تھا۔ کڑکڑاتا جاڑا ہو یا برسات۔ بُدھئی ہر ایک گھر خود دُودھ دینے آتا تھا۔ کیونکہ اُس کا بڑا اکلوتا لڑکا جوانی کے عالم میں ہی مر گیا تھا۔ صبح شام وُہ دونوں ہاتھوں میں دو ڈبے لے کر جب احاطہ میں دُودھ دینے آتا تھا، تب بچّوں میں مسرّت کی لہر پیدا ہو جاتی۔ کوئی اپنا لوٹا، کوئی گلاس اور کوئی دُوسرا برتن لے کر دوڑتا۔ جوان لڑکیاں اَور بہوئیں تک بھی اُس کے سامنے آتی نہ شرماتیں۔ سب کے پتا کی مانند جو تھا وُہ ؂

بڑے پریم سے وہ سب کو دُودھ دیتا۔ دُودھ تو اُس کا خالص ہوتا ہی تھا، مگر پاپ میں بھی وُہ سیر کا ، اچھٹانک ہی دیتا تھا۔ اُس پر بھی جب بچے اَور عورتیں ذرا اور دُودھ ڈالنے کو کہتے۔ تب وہ بنا جھنجھلائے، بِنا پیشانی پر شکن ڈالے۔ خُوشی خُوشی کچھ دُودھ اَور جھاگ ڈال دیتا۔ آجکل کے گوالوں کی طرح تین چار ماشے دُودھ ڈال کر ہی بہکاتا نہیں تھا۔ آج تو تولہ ڈیڑھ تولہ بھی ایک پیسے کا ہوتا ہے۔ بھلا سرمائے داری کے اس دَور میں اِتنا نقصان کون اُٹھائے !

بُدھئی کا طور وطریقہ اور مزاج اِتنا اچھا تھا کہ ہر گھر میں وہ اَیسے آتا تھا، جیسے اُس گھر کا وہ بھی اَپنا ہی آدمی ہو۔ دُودھ دینے وقت ۵-۷ منٹ میں وہ اَپنے دُکھ سُکھ کی باتیں کہہ لیتا اَور دُوسروں کی باتیں پُوچھ لیتا—چھوٹے بچّے کا کیا حال ہے؟ بڑے بابُو کی طبیعت کیسی ہے؟ بیٹی کب آئے گی؟ اِس طرح کے سوالات سے گھر کی خیر و عافیت کے حالات وہ دریافت کر لیتا تھا ؂

وُہ اپنے کام سے مطمئن اَور گھر سے سُکھی تھا۔ پیار بھری مُسکراہٹ اُس کے چہرے پر سدا دیکھی جا سکتی تھی ؂

جب بھی میری اُس کی ملاقات گھر پر یا باہر ہو جاتی، تب اَیسے مِلتا، جیسے میرے لیے اُس کے دِل میں وہ عزّت وعقیدت کافی حد تک ہے جو سیدھے سادھے عام ہندوستانی کو اُستادوں کے لئے ہوتی ہے۔ وُہ اپنے پوتے کی پڑھائی کا حال مجھ سے پُوچھتا۔ جب اُس کی تسلی کے اُس لڑکے کو گائے کا دُودھ پلانے کو کہتا، تب وُہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا۔ "ماسٹر جی

آج کل کے لڑکے تو دودھ کو منہ لگاتے ڈرتے ہیں۔ اُس کو تو سوڈا اور لیمن چاہیئے۔ میں اس بڑھاپے میں بھی سیر ڈیڑھ سیر دودھ روزانہ پی لیتا ہوں'' ؛

کبھی کبھی مجھ سے کہتا۔ ''ماسٹر جی! دودھ زیادہ لے لیا کرو۔ سیر سوا سیر میں کیا ہوتا ہوگا۔ اِتنا پیسہ جوڑ کر کیا کرو گے''؟ اُس وقت میں اپنی لاچاری کا اظہار کر دیتا۔ مگر اُسے میری بات کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ بے چارے بڈھئی کو کیا معلوم کہ ہندوستان کے ہائی سکولوں کے ٹیچر تو کیا، یہاں کے کالجوں کے پروفیسر بھی خود کو اور اپنے بال بچوں کو باقاعدہ دودھ پلانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ چائے پی کر یا گھر میں باری باری سے کبھی کبھی دودھ پی کر اُس کا مزہ چکھ لیتے ہیں۔ آج تو حالت اور بھی گئی بیتی ہے ؛

انہی دنوں ایک دن کلاس میں دودھ کی بات چل پڑی۔ میں بڑے تال کے خیال سے پوچھ بیٹھا کہ جو لڑکے روزانہ دودھ پیتے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ مشکل سے ۴۴-۴۲ طلبا میں سے ۱۰-۱۲ لڑکے یعنی ۲۵-۲۶ فیصدی ہی دودھ پیتے تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب دودھ کا نرخ ۲ آنہ سیر تھا۔ اور اُس کلاس کے طلباء عموماً اوسط طبقہ اور امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُس دن کی یہ بات مجھے آج تک یاد ہے ؛

انبالہ چھوڑے بھی پندرہ ۱۵ برس ہو گئے اور معلوم نہیں کہ بڈھئی زندہ ہے یا نہیں۔ مگر کاش آج آزاد ہندوستان میں بڈھئی کی طرح گائے بھینس کی پالنا کو دھرم سمجھنے والے گوالے ہوتے۔ آج تو یہ ایک روزگار بن گیا ہے، جس میں بے ایمانی اور مویشیوں کا خون چوسنے کے سوائے ہمدردی نام کو بھی نہیں ہے۔ گوپال کی طرح سب کو پریم سے دودھ پلانے والے بڈھئی کی یاد اِس زمانے میں بار بار آتی ہے ؛ (مائی دیال جین)

چھوٹے چھوٹے واقعات

لگن

ایک نئے بڑھئی کے لئے ایک لوہار نے ہتھوڑا بنایا۔ ہتھوڑا اتنا اچھا تھا کہ بڑھئی

نے اپنے ٹھیکیدار سے اُس لوہار کی تعریف کی۔ ٹھیکیدار نے اُس لوہار سے کہا کہ میرے لئے تم کچھ ہتھوڑے بنا دو۔ مگر وہ پہلے ہتھوڑے سے اچھے ہوں!

لوہار نے کہا ــــ "جب میں کوئی چیز بناتا ہوں، تو اُس میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔ میری بنائی ہر چیز میری پوری قابلیت کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کے لئے جو ہتھوڑے میں بناؤں گا وہ بھی ویسے ہی ہوں گے، جیسے میں پہلے بنا چکا ہوں"۔

○ اپنے ہر ایک کام کو اپنی پوری لگن اور قابلیت سے کرنا کیریکٹر کی بلندی کا ثبوت ہے۔

● بُرا ●

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ برلا بھون میں پرارتھنا کے بعد ایک لڑکی نے گاندھی جی کو پانچ روپے دیئے اور اُن کے دستخط مانگے۔ گاندھی جی نے دستخط کر دیئے۔ لڑکی نے اصرار کیا، کہ دستخط کے ساتھ کچھ لکھ بھی دیجئے۔ گاندھی جی نے پوچھا:-

"تم بتاؤ، کیا لکھ دوں"؟

"جو آپ کے جی میں آئے وُہی لکھ دیجئے"۔

گاندھی جی نے پوچھا ــــ "تمہارے پتا جی کیا کرتے ہیں؟"

وہ بولی ــــ "تمباکو کی دکان"۔

گاندھی جی نے جھٹ لکھ دیا ــــ "تمباکو پینا بُرا ہے"۔

● ٹوپی ●

شری رام نریش اپنی گاندھی ٹوپی اپنے کندھے پر رکھے مستی میں جھومتے لنڈن کی ایک سڑک پر جا رہے تھے کہ وہ ٹوپی گر گئی، مگر اُنہیں پتہ نہ چلا۔ وہ کچھ دُور گئے ہوں گے کہ کندھے پر کسی نے جھٹ ہاتھ رکھا۔ یہ پولیس کا سپاہی تھا۔ اشارے سے اُس نے ٹوپی کی بات کہی۔ رام نریش جی ٹوپی کے پاس آئے تو دیکھا کہ دُوسرا سپاہی اپنے پیر پھیلائے ٹوپی کے پاس کھڑا ہے تاکہ اُس پر کسی کا پاؤں نہ پڑ جائے۔

● قومی اخلاق ●

شری جگ جیون رام سابق لیبر منسٹر انگلینڈ گئے تو اُنہیں پٹرول اور کھانے کی

چیزوں کی ایک ایک کوپن بُک ملی۔ اُس میں جو کوپن بچ گئے وہ انہوں نے آس پاس کے لوگوں کو دینے چاہے، مگر کسی نے اُنہیں لینا منظور نہ کیا۔ حالانکہ انگلینڈ میں سخت کنٹرول ہے، مگر وہاں کے لوگ اپنے حصّے سے زیادہ ملنے پر بھی نہیں لینا چاہتے اور ہنس کر تکلیف برداشت کرتے ہیں ؛

کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت سچ مچ اُس کا مجموعی اخلاق ہی ہے! ہمارے مُلک کو اس کی کتنی ضرورت ہے۔

اپنے عیب

"تم چُپ چاپ اپنا سبق یاد کرو!" ماسٹر صاحب نے طلباء سے کہا۔ انہیں کچھ ضروری کام تھا۔ وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ طلباء بھی سبق پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ پڑھنے کا بہانہ کرنے کے لئے زیادہ تر طلباء کی نظر اپنی اپنی کتاب کی طرف تھی ؛



کچھ دیر بعد ایک لڑکا اُٹھ کر بولا۔ "ماسٹر جی! دیکھئے رمیش بڑی دیر سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا ہے! وہ کتاب پڑھتا ہی نہیں" ؛

"اور تم کیا کر رہے ہو؟" ماسٹر صاحب نے مُسکرا کر پُوچھا —— "تمہاری نظر کتاب کی طرف تھی، کہ رمیش کی طرف؟"

لڑکا کچھ جواب نہ دے سکا۔ شرما کر چُپ چاپ بیٹھ گیا، کلاس کے سب لڑکے ہنس پڑے ماسٹر صاحب پھر اپنے کام لگ گئے ؛

○ اگر ہم گہرائی سے سوچیں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لوگ اُس طالب علم کی طرح ہی ہیں۔ دوسروں کے عیب کی طرف نظر پھینکتے رہتے ہیں، لیکن اُنہیں اپنے عیب دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی ؛

پیار کا اشارہ

امریکہ کے مشہور مضمون نگار ایمرسن کو گائے پالنے کا شوق تھا۔ مکان کے پاس ہی گایوں اور اُن کے بچھڑوں کے لئے ایک جھونپڑا کھڑا کیا گیا تھا۔ ایک بار زور کی بارش آنے والی تھی۔ ساری گائیں تو جھونپڑے کے اندر چلی گئیں مگر ایک بچھڑا باہر ہی رہ گیا۔ ایمرسن اور اُن کا لڑکا دونو مل کر اُس بچھڑے کو کھینچنے لگے کہ وہ جھونپڑے میں چلا آئے۔ مگر جیسے جیسے اُنہوں نے اُنہیں زور سے کھینچنا شروع کیا اور ویسے ویسے وہ بچھڑا بھی ساری طاقت لگا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ بچارے ایمرسن بہت پریشان ہوئے ؛

اِتنے میں اُن کی بوڑھی خادمہ اُدھر سے گذری۔ اُس نے یہ تماشہ دیکھا تو دَوڑی آئی اور اپنا انگوٹھا بچھڑے کے مُنہ میں پیار سے ڈال کر اُسے جھونپڑے کی طرف لے چلی۔ بچھڑا چُپ چاپ جھونپڑے کے اندر چلا گیا ؛

○ وہ اَن پڑھ خادمہ کتابیں اور نظمیں لکھنا نہیں جانتی تھی، مگر ہر کسی سے پیش آنا یقیناً جانتی تھی۔ اور جب جانور بھی پیار کا اشارہ سمجھتے ہیں تو پھر انسان کیونکر نہ سمجھیں گے ؛

محنت کی کمائی

منزلِ مقصود پر پہنچ کر جب ٹانگہ والے کو کرایہ ادا کرنے لگا تو پانچ کا نوٹ دیا۔ اُسے تین روپے واپس کرنے تھے، مگر اُس کے پاس وہ نہیں نکلے۔ اُس نے مجھ سے نوٹ لیا اور بولا ــــ "ابھی تڑوا کر لاتا ہوں"۔ پھر ٹانگے پر بیٹھ کر چل دیا۔ میں سمجھا کہ اب پانچ کا نوٹ بھی گیا۔ پھر بھی انتظار کرتا رہا۔ لیکن ٹانگہ والا تمام رات نہ آیا ؛

صبح جب وہ سامنے آیا تو مجھے اُس پر بہت غصّہ آیا۔ لیکن میرے کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ بول پڑا۔ "کل میرا ٹانگہ ٹکرا گیا تھا۔ گھوڑے کو چوٹ لگی۔ بس اِسی سبب چکر میں رات کو نہیں آسکا"۔ اس پر میں فراخدل ہو کر بولا ــــــ "کوئی بات نہیں، تمہیں گھوڑے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوگی۔ پانچ کا نوٹ اپنے ہی پاس رکھ لو" ؛

ٹانگہ والے نے تین روپے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "جو محنت کی کمائی نہیں ہوتی، اُسے میں لینا حرام سمجھتا ہوں"۔ اور وہ واپس چلا گیا ؛ (ستیہ کمار)

● ووٹ کی قیمت ●

وہ انتخاب کا دِن تھا۔ ماں باپ ووٹ دینے جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اچانک، اُن کا بارہ برس کا بیٹا سیڑھی پر سے گر پڑا، اور کافی چوٹ لگی۔ لڑکا چُپ چاپ دُوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور خود ہی زخم پر پٹی باندھ لی۔

ماں باپ جب ووٹ دے کر واپس آئے تو بیٹے کو چوٹ لگی دیکھ کر پوچھا "تجھے چوٹ کیسے لگ گئی؟ کب لگی؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "جب آپ ووٹ دینے جا رہے تھے تبھی میں سیڑھی پر سے گر گیا تھا"۔

"تو تُو نے تبھی کیوں نہیں بتایا؟"

"اگر میں اُسی وقت بتا دیتا تو آپ میری مرہم پٹّی میں لگ جاتے اور ووٹ دینے نہ جاتے۔ اور اُس پارٹی کے دو ووٹ بیکار ہو جاتے"۔ (اکیرن ملہوترہ)

● شرافت کا نمونہ ●

میں کچھ مستورات کے ہمراہ ایک تقریب میں جا رہا تھا۔ ہم سبھی نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس دِن صبح بہت بارش ہوئی تھی اور سڑکوں پر جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ دُور دُور تک ہمارے سوا سڑک سنسان تھی۔ مجھے پیچھے سے ایک کار بہت تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں ہم جلدی سے جا سکیں اور کیچڑ کے چھینٹوں سے بچ سکیں۔ خوف کی وجہ سے ہمارا بُرا حال تھا۔

لیکن ہمارے پاس آ کر کار بہت آہستہ ہو گئی۔ ہم سے کچھ آگے نکل جانے پر کار پھر تیزی سے چلنے لگی۔ اُس نا واقف کار والے کی شرافت اب تک یاد ہے۔ (سنتوش ساندل)

● پولیس کا ڈر ●

گزشتہ ماہ اپریل کی بات ہے۔ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ ٹھاکر گنج کی سڑک پر حسبِ دستور ٹہلنے گیا تھا۔ قریب چھ بجے ہوں گے۔ واپسی پر ہم نے ۱۸-۱۹ برس کے ایک دُبلے پتلے نوجوان کو دیکھا جس کے سارے کپڑے خون سے لت پت ہو رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا

بہت مشکل سے جا رہا تھا۔ ہم سے پُوچھے بِنا نہ رہا گیا۔ اُس نے بتایا کہ رات کو آٹھ بجے ایک آدمی نے مار کر اس سے پچاس روپے اور سائیکل چھین لی۔ وہ ایک پنشن کار کا لڑکا تھا اور ایک شہر میں کسی رشتہ دار کے ہاں جا رہا تھا۔ ۸ بجے سے وہ وہیں پڑا اُٹھا تھا، ہوش آتے پر وہ چل پڑا۔ راستہ میں آتے جاتے تانگہ والوں سے اُس نے ہسپتال لے جانے کے لئے بہت منت وسماجت کی، مگر کوئی بھی راضی نہ ہُوا۔ اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ جان پڑتا تھا جیسے اب مرا۔ اُس نے ہم سے بھی کہا۔ "بھائی مجھے ہسپتال پہنچا دو"۔ میرا دِل جذبۂ رحم سے لبریز ہو گیا۔ مگر اندیشہ لاحق ہُوا کہ اگر وہ تانگہ میں ہی مر گیا تو گذشتہ زندگی کے تجربہ اور دیکھی سُنی نے مجھے سکھلا دیا تھا کہ ہندوستانی پولیس بے گناہ کو تنگ کرتی ہے، گنہگاروں کو چھوڑ دیتی ہے۔ اور غیر مُلکی عہدِ حکومت کی طرح آج بھی ظُلم وستم روا رکھتی ہے۔ مَیں نے سوچا کہاں تک مارا مارا پھروں گا۔ مَیں نے اُسے ایک روپیہ دِیا اور کہا، بھائی تانگہ کر لینا۔ اور مَیں گھر واپس آ گیا۔

زخمی آدمی آٹھ بجے سے وہاں بے یار ومددگار پڑا رہا۔ یہ کِس نظام کا قصور ہے؟ کسی تانگہ والے اور مَیں نے ترس کھانے پر بھی اگر اُس کی مدد نہیں کی تو وہ خوف کہاں سے پیدا ہُوا؟ ہندوستانی پولیس کا رویّہ ہی اُسے عوام کے تعاون سے محروم رکھنے کے لئے ذمہ دار سمجھا جانا چاہیئے۔ (استیش نرہی، لکھنؤ)

● دُودھ کا دُودھ، پانی کا پانی ●

قریب بیس برس پہلے کی بات ہے جب کہ چاندی کے سکّوں کی بہتات تھی۔ ہردوار میں آشرم پر مَیں رہتا تھا۔ ایک دِن میں گھاٹ پر نہا رہا تھا۔ کسی کے چلّانے کی آواز نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ پاس جانے پر پتہ چلا کہ ایک گوالا تھا۔ جو اپنے گاہکوں سے مہینے بھر کا حساب مِلا رہا تھا۔ روپوں کی تھیلی کپڑوں کے نیچے رکھ پاس ہی گنگا جل میں غوطہ لگا رہا تھا کہ ایک بندر اچانک روپوں کی تھیلی اُٹھا کر کنارے کے درخت پر چڑھ گیا۔ گوالا چلا رہا تھا۔ آخر واقف کار نے رائے دی کہ دُونے میں کچھ جلیبی لا کر دے، تب کہیں تھیلی واپس مِلے گی۔ درخت کے نیچے دُونے میں جلیبی رکھی گئی۔ لوگ ہٹ گئے۔ مگر بندر مٹھائی کے لالچ میں نہ آیا۔ اُس نے

روپؤں کی تھیلی کھولی۔ اور ایک روپیہ ہاتھ میں لے کر "اوں" کر کے گنگا میں پھینک دیا۔ دوسرا روپیہ ہاتھ میں لیا اور "اوں" کر کے گوالے کی جانب پھینک دیا۔ ڈر تھا کہ کہیں سارا روپیہ پانی میں نہ ڈال دے۔ مگر بنارنے دکھا دکھا کر کچھ روپے پانی میں، اور کچھ کنارے پر پھینک ہی دیئے۔ بیچارہ گوالا کنارے کے روپے اٹھا کر چلتا بنا۔ لوگوں نے کہا اور پانی ملاؤ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی یہاں ہی ہوگیا۔ (اسے پرکاش۔ دیولالی)

● سچائی ہو تو ایسی ●

ایک دن ایک دکان سے میں نے سیر بھر آلو خریدے، اور دکاندار کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ دکاندار نے چار روپے گیارہ آنے واپس کیئے۔ جن میں ایک روپیہ کھوٹا تھا۔ میں جلدی کے باعث گھر کی جانب چلا۔ کچھ دور چلا ہی تھا۔ اسی اثنا میں آواز سنائی دی۔ "بھائی صاحب ٹھہریئے"۔ میں نے سوچا، یہ کہے گا کہ آپ نے آلو کے پیسے نہیں دیئے۔ مگر وہ دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔ "بھائی صاحب آپ کے پاس ایک کھوٹا روپیہ پہنچ گیا ہے۔ لیجئے، یہ روپیہ بدل لیجئے"۔

جب میں نے روپیوں پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ایک روپیہ حقیقت میں کھوٹا ہی تھا۔ میں نے وہ روپیہ بدل لیا اور اس کا دلی شکریہ ادا کیا۔

اگر اسی طرح سب لوگ صداقت کے راستے پر گامزن رہیں تو ہمارا ملک ایک دن ضرور ہی ترقیوں کی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے۔ (ایشور دت پنڈت، لسبیت دنگور)

● پیسے کی قدر ●

میرے ایک بہت ہی گہرے دوست فضول خرچی کی بری عادت میں مبتلا ہیں۔ ایک دن میں نے انہیں سمجھایا، بھائی پیسہ فضول خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ کبھی کبھی ایک پیسہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ خوش قسمتی سے انہوں نے اسی دن شام کو میرے سامنے سینما جانے کی تجویز پیش کی، جسے میں نے بخوشی منظور کر لیا۔ جس وقت ہم لوگ سینما گھر پہنچے، اس وقت صرف اول درجے کا ٹکٹ ہی کھلا تھا۔ اس کے دو ٹکٹوں کیلئے دو روپیہ چار آنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس کے پاس ایک روپیہ پونے پندرہ آنے ہی نکلے۔ جب میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف پانچ آنے

ہی نکلے۔ اِس طرح ٹکٹ خریدنے کے لئے ایک پیسے کی کمی کے باعث ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ضائع کرنا پڑا۔ مگر اِس واقعہ سے اُن کی فضول خرچی کی عادت میں کافی کمی ہو گئی ⁂ (شیو پرساد چوربیا)

• کیلا کا چھلکا •

۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ ٹرین کے سفر میں فوجیوں کی کافی چہل پہل رہتی تھی۔ مَیں بھی ایک فوجی تھا اور بمبئی سے کلکتہ کی جانب سفر کر رہا تھا۔ جب ٹرین بھوساول سٹیشن کے وسیع پلیٹ فارم میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہی تھی۔ بُک سٹال پر میری نظر پڑی اور اِس ارادہ سے کہ وہاں سے کچھ خرید لیا جائے مَیں چلتی گاڑی سے نیچے کُودا۔ میرے پاؤں کے زمین پر پڑنے کی ہی دیری تھی کہ مَیں سر کے بل پتھر کے پلیٹ فارم پر گرا۔ آنکھ جھپکنے میں جتنا وقت لگتا ہے، اُس سے کہیں کم وقت میں یہ حادثہ رونما ہو گیا۔ پھر کیا ہُوا اور کیسے ہُوا، یہ جاننے کا مجھے ہوش ہی کہاں تھا؟ تقریباً نصف گھنٹہ بعد میری بے ہوشی کا خمار کچھ کم ہُوا۔ اور مَیں نے خود کو ڈاکٹروں اور نرسوں سے گھرے ہُوئے پایا۔ سارے کپڑے خون سے بُری طرح آلودہ تھے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ یہ ساری کرامات کیلے کے چھلکے کی تھی۔ اُس کی مہربانی سے مجھے چار ماہ بمبئی کے فوجی ہسپتال کا مہمان بننا پڑا ⁂

اب جب بھی کہیں مَیں کیلے کا کوئی چھلکا سڑک پر یا پلیٹ فارم پر پڑا ہُوا دیکھتا ہُوں تو اپنی شان یا اپنی خصوصی پوزیشن کا خیال چھوڑ کر فوراً اُسے اُٹھا لیتا ہُوں، اور ایسی جگہ پھینک دیتا ہُوں جہاں کوئی کبھی اُس کا شکار نہ بن سکے ⁂ (شیام کانت چودھری۔ ناگپور)

• ضروری اور غیر ضروری •

بس کے 'کیو' میں میرا آخری نمبر تھا۔ بس آئی تو میرے علاوہ دیگر تمام لوگ بس میں سوار ہو گئے۔ صرف مَیں ہی رہ گیا۔ مَیں بھی جب سوار ہونے لگا تو کنڈکٹر نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جگہ نہیں ہے۔ مَیں نے بتایا کہ مجھے اِسی بس سے اسٹیشن پہنچنا ضروری ہے۔ نہیں تو گاڑی چھُوٹ جائے گی۔ مگر کنڈکٹر نہیں مانا۔ اِتنے میں ایک شوہر اور بیوی بس سے اُترتے ہُوئے بولے" لیجئے، آپ جائیے۔ آپ کا جانا ضروری ہے۔ ہمیں تو صرف بازار تک جانا ہے۔ اگلی بس سے چلے جائیں گے ⁂ (سنتوش کمار جین۔ رڑکی)

● حِصّہ دار ●

ہماری کتابوں کی دُکان میں دو حِصّہ دار تھے - ہمارے یہاں کی چھپی کتاب کورس میں لگ گئی تھی - سوال اُٹھا کہ کتاب کی کتنی کاپیاں چھپوائی جائیں - مَیں نے کہا "پانچ ہزار کافی ہوں گی - میرے حِصّہ دار نے دس ہزار کی رائے دی - کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اتنی کتابیں ضرور بِک جائیں گی - مَیں نقصان کا خطرہ (رِسک) اُٹھانے کو تیار نہیں تھا ــــ کہیں اتنی کتابیں نہ بکیں تو لاگت بیکار جائے گی - لہٰذا ۵ ہزار چھپوانا ہی طے پایا :

سال کے آخر میں جب حساب ہُوا تو میرے حِصّہ دار نے مجھے دس ہزار کتابوں کے منافع کا آدھا حِصّہ دِیا - اُس نے کہا، کہ ۵ ہزار زیادہ کتابیں اُس نے اپنی ذِمّہ داری پر چھپوائی تھیں - اگر گھاٹا ہوتا تو وُہ خود اُسے بَرداشت کرتا - لیکن جب منافع ہُوا ہے تو میرا آدھا حِصّہ اس نے مجھے دے دِیا : (رمیش گپتا - متھرا)

وُہ بیش قیمت کتاب، جس کی ہر شادی شُدہ مَرد کو ضرورت ہے

آپ خواہ کتنی ہی کتابیں پڑھ جائیں، جو راز کی باتیں آپ جاننا چاہتے ہیں، وہ سوائے ہماری کتاب "گرہست شاستر" کے کہیں نہ ملیں گی - اِس کی مَدد سے آپ بیوی کی خاموش زبان، اُس کے دِلی اِرادوں اَور خُفیہ اِشاروں کی تہہ تک پہنچ کر ایک کامیاب خاوند بن سکتے ہیں :

● سب سے بڑا ساتواں سپیشل ایڈیشن مجلّد با تصویر، قیمت صرف چار روپے، ڈاک خرچ ایک روپیہ دو آنہ - صرف چار روپیہ دس آنہ کا منی آرڈر بھیجکر کتاب بذریعہ رجسٹری منگائیے :

● ایڈیٹر روزانہ اخبار "ویر بھارت" لکھتے ہیں :- "شری مہانند ضخیم اور لاجواب کتابیں لکھنے کیلئے مشہور ہیں - اپنی تازہ تصنیف "گرہست شاستر" میں لائق مصنّف نے نہایت دِلچسپ پیرایہ میں ذاتی معلومات، سالہا سال کے مشاہدات اور مشرق و مغرب کی سینکڑوں فنی کتابوں کی تمثیلات کی بنا پر ازدواجی زندگی کے ایسے قیمتی گُر، مخفی راز، علمی نکتے اور مجرّب قاعدے بتائے ہیں - اُن پر اگر عمل کیا جائے تو اس کو یقیناً سورگ کا نمونہ بنایا جا سکتا ہے" :

○

جگ بیتی کہانیاں



دو خُدا

(۱)

شام کا وقت تھا۔ ایک خدا پرست فقیر بازار سے گزر رہا تھا۔ دُکانوں کے چراغ جل چکے تھے۔ اور اُن کی مصنوعی روشنی میں دُنیا کے فانی چہرے اِس طرح چمک رہے تھے۔ جس طرح عہدِ شباب میں چند روزہ حُسن چمکتا ہے۔ معاً ایک بالاخانہ سے کسی عیاش امیر کی پری چہرہ محبوبہ نے باہر سر نکالا۔ اور فقیر کے جُبہ پر پان کی پیک تھوک دی ؂

(۲)

فقیر نے اُوپر دیکھا، اور یہ دیکھ کر عورت اپنی غلطی پر نادم ہونے کی بجائے ابھی تک مسکرا رہی ہے۔ اُسے حیرت ہوئی۔ اور اُس نے مجذوبانہ انداز سے چلّا کر کہا۔ اے فانی اِنسان! خدا کے بندوں کی یُوں تحقیر نہ کر۔ اُس کی نگاہوں میں تیرا حُسن اور تیرا شباب، دونو بے حقیقت ہیں ؂

گنہگار حسینہ کا لال چہرہ اور بھی لال ہوگیا۔ اور اُس نے عالمِ آزردگی میں پیچھے مڑ کر



اپنے عاشق سے کہا "تم نے دیکھا۔ ایک ناچیز گداگر بھرے بازار میں حسن و شباب کی توہین کر رہا ہے۔ اور عیّاش امیر جو عورت کے فانی رنگ و روغن کے نشہ میں دین و دنیا سے اندھا ہو رہا تھا۔ لاٹھی لے کر تیزی سے نیچے اترا، اور خدا پرست فقیر پر پل پڑا۔ اپنے ہاتھوں۔ پاؤں اور لاٹھی کی پوری قوت سے اسے اس کی "زبان درازی" کے لئے زدوکوب کیا۔

فقیر کی چیخیں آسمان میں گونج رہی تھیں۔ لیکن زمین والوں کے کان اس کی طرف سے بالکل بند تھے۔

(۳)

رات کو قدرت کا غیبی ہاتھ حرکت میں آیا اور دوسری صبح کم نگاہ امیر اپنے گناہ آلود بستر پر بے جان پڑا تھا۔

اس عورت نے دل کی آہ کا یہ جیتا جاگتا معجزہ دیکھا اور اس کا خون اس کی رگوں میں سرد ہو گیا۔ وہ برہنہ پا برہنہ سر شہر کے باہر گئی اور فقیر کے کھردرے پاؤں پر اپنا نازنین سر رکھ کر رونے لگی۔

فقیر نے اسے دیکھا اور کہا "مائی اٹھ! میرا خدا اپنے کسی بندے کو ایسی بے بسی کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا"۔

لیکن عورت نے پاؤں نہ چھوڑے۔ اس نے شدّتِ گریہ سے رک رک کہا "میں اندھی تھی، میں اندھی تھی، مجھے ماریئے، میری کھال ادھیڑ دیجئے، لیکن اپنے غضب کی آگ سے بچا لیجئے"۔

فقیر نے اُس کے عاشق کے انجام کی خبر سُنی، اور زار و قطار روتا ہوا بولا۔ مائی، یہ تیرا اور میرا جھگڑا نہیں تھا، میرے اور تیرے خدا (؟) کی جنگ تھی۔ تیرے خُدا کو غصّہ آیا، اُس نے مجھے مارا، میرے خدا کو غصّہ آیا، اُس نے تیرے خُدا کو مارا، کیونکہ تیرا خدا (؟) اُس کے رُوبرو کمزور و بے حقیقت تھا۔ وہ مارا گیا ؞

یہ کہتے کہتے فقیر یکایک ایک تیسرے آدمی کی طرف مڑا۔ اور اپنے سر کو ایک عجیب انداز سے جنبش دے کر بولا۔ تیرا خدا کون ہے؟

وہ آدمی اور عورت دونوں اِس سوال کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، مگر نہ سمجھ سکے ؞
فقیر اُٹھا اور اُن کو اِسی حالت میں چھوڑ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکل گیا ؞



جنّت اور جہنّم



ایک محلّے میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک چھوٹا تھا دُوسرا بڑا۔ بڑا شادی شدہ تھا۔ اور چھوٹے کی ابھی تک سگائی بھی نہ ہوئی تھی۔ دونوں میں بے حد محبّت تھی۔ بھاوج دیور کو اپنا بچّہ سمجھتی تھی۔ اور دیور بھاوج کو اپنی ماں۔ دونوں بھائی ایک ہی مکان میں سُکھ سے رہتے تھے۔ لوگ کہتے تھے، اِن کا گھر جنّت ہے ؞

ایک دن چھوٹے بھائی کی شادی ہوئی اور کچھ دِنوں بعد اِس کی بیوی بھی وہاں آ گئی ؞
چند ہفتے دونوں گھُل مِل کر رہے۔ اور پھر ایک دن جب چھوٹا بھائی روٹی کھانے لگا۔ تو

اس کی بیوی سبزی کو دیکھ کر بولی۔ "یہ کیا گھاس آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ کی سبزی میں گھی نام کو نہیں ہوتا"۔

چھوٹے بھائی نے اس کو کوئی توجہ نہیں دی اور کھانا کھا کر چلا گیا۔

اور رات کو جب بڑا بھائی سونے لگا تو اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا۔ "سرلا کا خرچ بے حد بڑھ رہا ہے۔ روز دکاندار سے آپ کے حساب میں چیزیں منگا لیتی ہے۔ ہم گھر کا کام تو چلا لیں گے مگر یہ فالتو خرچ کیسے برداشت کریں گے۔

روز ایسا ہی ہوتا رہا۔ چھوٹے بھائی کو اس بات کی شکایت ہو گئی کہ اس کو جو کھانا دیا جاتا ہے۔ وہ بے حد خراب ہوتا ہے۔ سبزی میں گھی اور دودھ میں بالائی نہیں ہوتا۔ اور بڑا بھائی چھوٹی بھاوج کے خرچ سے تنگ آ گیا۔

چند روز بعد بڑے بھائی نے دکاندار سے کہا۔ "میرے نام پر گھر میں کوئی چیز نہ دی جائے"۔ اسی دن شام کو چھوٹے بھائی نے کھانے پکانے کا الگ انتظام کر لیا۔

ایک ہی محلے میں یہ دو بھائی رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ بھاوج کو دیور ایک آنکھ نہیں بھاتا، اور دیور بھاوج کو زہر سمجھتا ہے۔ دن رات لڑائی ہوتی ہے۔ دونوں اس بات کی تاک میں ہیں کہ سستا مکان ملے تو جدا ہو جائیں۔

لوگ کہتے ہیں، ان کا گھر جہنم ہے!

کئی لوگ دین جیسی پیاری چیز کو دنیا پر قربان کر دیتے ہیں، مگر صحت ایسی چیز ہے جس پر دنیا بھی قربان کی جا سکتی ہے۔ کوئی شخص انواع و اقسام کے عیش کے سامان لے کر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے بدلے میں اس کو چارپائی کا مہمان کر دیا جائے۔ صحت ہے تو جہان ہے، صحت ہے تو ایمان ہے۔ اگر آپ کی صحت ٹھیک ہے تو آپ بلاشبہ بہشت کا مزہ پا رہے ہیں۔ اگر بدقسمتی یا غلطی سے آپ کی صحت خراب ہو گئی ہے تو ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" کی شہرۂ آفاق تصنیف "رہنمائے صحت" کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔ بے شمار لب گور مریضوں نے اس کی وساطت سے دوبارہ زندگی حاصل کر لی ہے۔ سرکاری ہسپتالوں کے رجسٹرڈ مریضوں تک نے رہنمائے صحت کا سہارا لیا ہے۔



اپنی کمائی

صبح کے وقت امیر باپ نے اپنے کاہل اور آرام طلب بیٹے کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "جا کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملے گا"۔

لڑکا بے پرواہ، کمزور اور مغرور تھا۔ اور اسے محنت و مشقت کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس گیا۔ اور رونے لگا۔ ماں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو، اس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار دیکھے تو اس کی محبت سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا صندوق کھول کر ایک اشرفی لی اور بیٹے کو دے دی۔

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا۔ آج تو نے کیا کمایا؟

لڑکے نے جیب سے اشرفی نکال کر باپ کے سامنے رکھ دی۔ باپ نے کہا۔ اسے کنوئیں میں پھینک آ۔

لڑکے نے بلا تامل تعمیل کی۔ دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اسی دن بیوی کو میکے بھیج دیا۔

●

تیسرے دن پھر اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا جا! کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملے گا۔

لڑکا اپنی بہن کے پاس جا کر رونے لگا۔ بہن نے اپنا سنگار دان کھولا۔ اس

میں سے ایک روپیہ نکالا اور بھائی کو دے دیا ؛

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا آج تو نے کیا کمایا ؟

لڑکے نے جیب سے روپیہ نکال کر باپ کے سامنے رکھ دیا۔ باپ نے کہا۔ اِسے کنوئیں میں پھینک آ ؛

لڑکے نے بلا تامل تعمیل کی۔ دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس نے دُوسرے دن بیٹی کو اُس کے سسرال بھیج دیا۔

اس کے بعد ایک دن اُس نے پھر اپنے بیٹے کو بُلایا اور کہا جا کچھ کما کر لا۔ ورنہ رات کو کھانا نہ ملے گا ؛

لڑکا سارا دن غمگین رہا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ لیکن انہیں دیکھنے والی محبت کی آنکھیں گھر میں نہ تھیں۔ مجبوراً شام کے وقت وہ اُٹھا اور بازار میں جا کر کوئی محنت مزدوری کا کام تلاش کرنے لگا اور آخر اُسے کام مل گیا۔ ایک سیٹھ نے کہا۔ میرا صندوق اُٹھا کر گھر پر لے چل۔ میں تجھے دو آنے کے پیسے دے دوں گا ؛

امیر باپ کے امیر بیٹے نے صندوق اُٹھایا اور اُسے سیٹھ کے مکان پر پہنچا آیا۔ لیکن اس وقت اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اُس کے پاؤں کانپتے تھے۔ اور اس کی گردن اور پیٹھ میں درد ہوتا تھا ؛

رات کے وقت باپ نے بیٹے سے پوچھا۔ آج تو نے کیا کمایا ؟

لڑکے نے اپنی جیب سے دوانی نکال کر باپ کے سامنے رکھ دی۔ باپ نے کہا۔ اِسے کنوئیں میں پھینک آ ؛

لڑکے کی آنکھوں سے غصّے کے شعلے نکلنے لگے۔ بولا میری گردن ٹوٹ گئی ہے اور آپ کہتے ہیں کنوئیں میں پھینک آ ؛

دانشمند باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ دُوسرے دن اس نے اپنا کاروبار بیٹے کے سپرد کر دیا

(شدرشن)

دَولت کی لاتیں

مُدّت گُذر گئی - ایک شہر میں ایک غریب کنگال فقیر صبح و شام سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرتا نظر آیا کرتا تھا - قحط کے باعث پیٹ بھر روٹی بھی اُسے بمشکل نصیب ہوتی تھی - لیکن یہ غریب عاجزی کر کے رو کر اور پیٹ کر روٹی مانگ ہی لیا کرتا تھا - حسنِ اتفاق سے اس غریب کو کسی جگہ سے دَولت کا ایک خزانہ مِل گیا اور وہ لاکھا پتی بن گیا ؛

اگلے روز جب لوگوں نے اُس غریب کو دیکھا تو زرق برق پوشاک پہنے اکڑتا ہُوا سڑک پر ٹہل رہا تھا - لوگ اُس کی شان دیکھ کر حیران رہ گئے - دَولت کا گھمنڈ اس کی اکڑ فوں کو بڑھاتا ہی چلا جاتا تھا - ایک دن اس کے ایک فقیر ساتھی نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا کیوں جی! یہ آج آپ کی گردن کیوں سیدھی نہیں ہوتی؟ اور اِتنے اکڑے ہُوئے کیوں ہو؟ اُس دَولت مند غریب نے جواب دِیا - "دَولت کی ایک لات لگی ہے" ؛

یہ دَولت مند غریب اب روز مرّہ ویسے ہی اکڑے ہُوئے پھرتا اور دَولت کو بے دریغ خرچ کرتا ، لیکن دَولت کے پاؤں کبھی ایک جگہ نہیں ٹِکتے - آج یہاں ، کل وہاں ، پرسوں کسی اَور جگہ ، ملک میں قحط پڑا ، غلہ گراں ہو گیا - چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنی کارروائی شروع کی - یہ دَولت مند غریب بھی اِن کا شکار ہو گیا - اُس کی تمام دَولت لُوٹ لی گئی - مکانات جلا ڈالے گئے - اَور اُس کے رشتہ دار قتل کر دیئے گئے - وہی دَولت مند اب برسوں کا بیمار ہو گیا - چہرے پر زردی چھا گئی ، کمر ٹیڑھی ہو گئی - چلنے کے لئے ہاتھ میں لاٹھی لینے کی ضرورت محسوس ہُوئی ؛

یہ دَولت مند غریب ایک دِن اُس سڑک پر جہاں وہ بھیک مانگا کرتا تھا - اور جس جگہ اُس کے ایک فقیر ساتھی نے اُس سے اکڑ فوں کا حال پُوچھا تھا - پُرانا فقیر ساتھی اُسے مِلا - اُسے ٹیڑھی کمر چلتا دیکھ کر فقیر نے پُوچھا - "کیوں جی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" غریب نے گردن نیچی کر کے جواب دِیا - "یہ دَولت کی دُوسری لات ہے" ؛

فقیر نے اُسے روکا، اور پوچھا۔ پہلے بھی تم نے مجھے کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا، اور اب پھر وہی۔ اِس کا مطلب ذرا سمجھاتے جاؤ“ ؎

غریب نے کہا ”دولت کی دو لاتیں ہوتی ہیں۔ جب یہ کسی کے پاس آتی ہے، تو چھاتی پر لات مارتی ہے۔ جس سے آدمی اکڑتا جاتا ہے۔ گردن سیدھی ہی نہیں ہوتی۔ اور جب یہ دولت چلی جاتی ہے، تو کمر پہ لات مار کر ٹیڑھی کر جاتی ہے“۔ فقیر نے کہا، تو بہتر ہے۔ نہ یہ کسی کے پاس آئے اور نہ کسی کے پاس سے جائے ؎

قانون کے محافظ

سپاہی نے ایک دم اپنا ہاتھ اُونچا کر دیا ؎

موٹروں، تانگوں اور سائیکل سواروں کا بہتا ہُوا دریا فوراً رُک گیا۔ گویا کسی نے بند دے دیا ہو۔ جس تانگہ میں مَیں سوار تھا۔ اُس کے کوچوان نے اپنی پوری طاقت سے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا مزاحمت کے طور پر ایک بار ہنہنایا، اور اپنی گردن ٹیڑھی کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے اگلے دو پاؤں سفید لائین سے چند اِنچ آگے نکل گئے تھے۔ سپید لائن تارکول کی سیاہ سڑک پر کسی شخص کے چہرے کے کوڑھ کی طرح چمک رہی تھی۔ اور اس کا مطلب تھا۔ ”یہاں ٹھہرو“ ؎

دُور کھڑے ہُوئے سپاہی نے اپنی عقابی آنکھوں سے گھوڑے کے پاؤں لائین سے آگے دیکھے۔ اور سیٹی بجا کر کوچوان کو اِشارہ کر دیا، کہ تانگہ راستہ سے نکال کر ایک طرف کھڑا کرے۔

تانگہ والے نے اپنا تانگہ ایک درخت کے نیچے کھڑا کر لیا ؎

سپاہی نے کٹھ پتلی کی طرح پھر گھوم کر باقی ٹریفک کو گزر جانے کا اِشارہ کر دیا۔ اور خود تیزی سے تانگے کے پاس آ کر کوچوان سے بولا ”اندھا ہو کر تانگہ چلاتا ہے؟“

”نہیں حضور“۔ تانگہ والے نے نہایت انکسار سے جواب دیا ؎

”نہیں حضور کا بچّہ“۔ سپاہی نے چلّا کر کہا۔ ”دوسروں کو اندھا سمجھتا ہے کیا؟“

"سرکار مائی باپ ہیں"۔

"سپاہی نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہُوئے کہا۔" تانگہ چلانا نہیں آتا، اور گھر سے چل کھڑا ہؤا کمانے۔ تیرا گھوڑا لائین سے آگے بڑھ گیا تھا۔ نکال اپنا نمبر۔ چالان کیا جائے گا۔" اور اتنا کہہ اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی کتاب اور پنسل نکال لی۔

کوچوان گڑگڑا کر بولا۔ "حضور اب معاف کر دو، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی"۔

"غلطی کا بچّہ" سپاہی نے اُس کے ایک تھپّڑ جماتے ہُوئے دو چار اور سُنا دیں۔

مُجھے دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ مُعاملہ ختم کرنے کے لیئے مَیں نے سپاہی سے کہا۔

"اِس بار معاف کر دیجیئے۔ آئندہ احتیاط سے کام لے گا"۔

سپاہی نے کہا۔ "آپ اِن لوگوں کو نہیں جانتے صاحب! جب تک اِن پہ دس پندرہ رُوپیہ جُرمانہ نہ ہو، اِن کا دماغ ٹھیک نہیں ہوتا"۔

"غریب آدمی ہے، مُعاف کر دیجیئے"۔ مَیں نے سپاہی سے پھر کہا۔ مگر میرے لہجہ میں جتنی نرمی تھی۔ اُس نے اُتنی ہی تُرشی سے جواب دِیا۔ "مَیں مجبور ہُوں، قانون کے مطابق اِس کا چالان ہی کروں گا"۔

"مَیں خاموش ہو گیا"۔

سپاہی نے پھر جھلّا کر کوچوان سے کہا۔ "ابے بہرہ ہے کیا؟ —— نکال اپنا نمبر"۔

کوچوان اپنی انٹی کو ٹٹولتے ہُوئے تانگہ سے نیچے اُترا، اور سپاہی کی جیب میں کچھ ڈال کر دونوں ہاتھ باندھتے ہُوئے بولا۔ "بس اِس بار معاف کر دو حوالدار صاحب! پھر ایسی غلطی نہ ہو گی"۔

سپاہی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولا، اور پھر یکلخت نرم ہو کر بولا۔ "اچھّا، اِس بار معاف کرتا ہُوں۔ اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو چالان کیئے بغیر نہ چھوڑوں گا"۔

کوچوان نے مسکراتے ہُوئے جواب دِیا۔ "آپ مائی باپ ہیں حوالدار صاحب" اور تانگہ پر سوار ہو کر گھوڑے کی لگام ہاتھ میں سنبھال لی۔ سپاہی اپنے موٹے موٹے بُوٹوں سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتا ہُوا چوراہے کی طرف چل دِیا۔

میں نے کوچوان سے پُوچھا۔ "کیا دیا اُسے؟"

میرا خیال تھا کہ سپاہی دو روپے لئے بغیر نہ ٹلا ہو گا، لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے کوچوان سے سُنا۔ "اجی صاحب! دینا کیا تھا۔ بس ایک چوّنی" ٭

چابک لگتے ہی گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا، اور میں اسی فکر میں غرق ہو گیا۔ کہ ایسے لوگ قانون کی حفاظت کر سکتے ہیں جو اِسے چند آنے میں نیلام کر دینے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں!

یہ کُتّے!

"ماسٹر جی آپ انسپکٹر آف سکولز کو لکھ دیجئے کہ سکول کا سالانہ معائنہ دیوالی کے دو دن بعد تک ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ ان کا معائنہ کے متعلق خط ہمیں لیٹ پہنچا ہے۔ ہم نے کچھ تیاری نہیں کی۔" ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہا ٭

"لیکن آپ کو اس وقت معائنہ دینے میں کیا حرج ہے۔ ابھی لڑکوں کو کہہ کر سکول کی صفائی کروا دیں۔ اور کسی چیز کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔" میں نے کہا ٭

"نئے شکاری ہو ماسٹر صاحب! شکار پھانسنا نہیں آتا۔ خیر! آہستہ آہستہ سمجھ جاویں گے۔ آپ لکھ تو دیجئے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا حکم تھا، میں نے خط لکھ دیا۔ معائنہ دیوالی کے دو دن بعد تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ دیوالی کے دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بُلایا کہ ہم نے ضروری کام کے لئے کہیں باہر جانا ہے۔ میں تیار ہو کر اُن کے مکان پر پہنچ گیا۔ دیکھا ہیڈ ماسٹر صاحب پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں کو ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم انسپکٹر آف سکولز کی کوٹھی پر جا رہے ہیں ٭

ہم تانگہ میں سوار ہو کر بمعہ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں کے انسپکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے دونوں ٹوکرے انسپکٹر صاحب کو دیتے ہوئے کہا۔ "بچوں کے لئے دیوالی کا تحفہ ہے، اُمید ہے آپ قبول فرمائیں گے" ٭

انسپکٹر صاحب نے دِکھاوے کی ہچکچاہٹ سے کہا۔ "اجی ماسٹر صاحب کیوں تکلیف کر رہے ہیں"۔

اِس کے بعد نوکر دونوں ٹوکروں کو اُٹھا کر لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس آگئے۔ راستہ میں جب ہم واپس آ رہے تھے، تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھ سے پُوچھا۔ "کچھ سمجھے ماسٹر صاحب؟"

مَیں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا، مَیں کچھ نہیں سمجھا"۔

"کُتّے کے آگے روٹی کا ٹکڑا ڈالا ہے، تاکہ بھونکے نہ۔ کل سکُول کا مُعائنہ ہو رہا ہے نہ؟ اِس لیئے یہ پھل اور مٹھائی دی ہے کہ کل کو سکول میں کوئی نقص نہ نکالے"۔

"ہوں"۔ اب مَیں سمجھ گیا۔ مَیں نے دِل میں کہا "ہاں! ہاں! یہ کُتّے اور دینے والے بھی اُنہوں سے کم نہیں ہو سکتے"۔ (ماسٹر جیون داس)

بے ایمان

ایک ہندوستانی افسر لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں۔ اِن کی ماہانہ آمدنی شاید دس لاکھ سے بھی زیادہ ہوگی۔ انہیں ریل کے سفر میں سیلون ملتا ہے۔ لیکن جب وہ ڈیوٹی پر ہوں۔ تو اس سیلون میں صرف وہ اور اُن کے سٹاف کے دس آدمی سفر کر سکتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر اُن کے کُنبے کا کوئی فرد اُن کے ہمراہ سفر کرے تو اُس کے لیئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا جائے اور اُس ٹکٹ کا نمبر رجسٹر میں درج کیا جائے۔

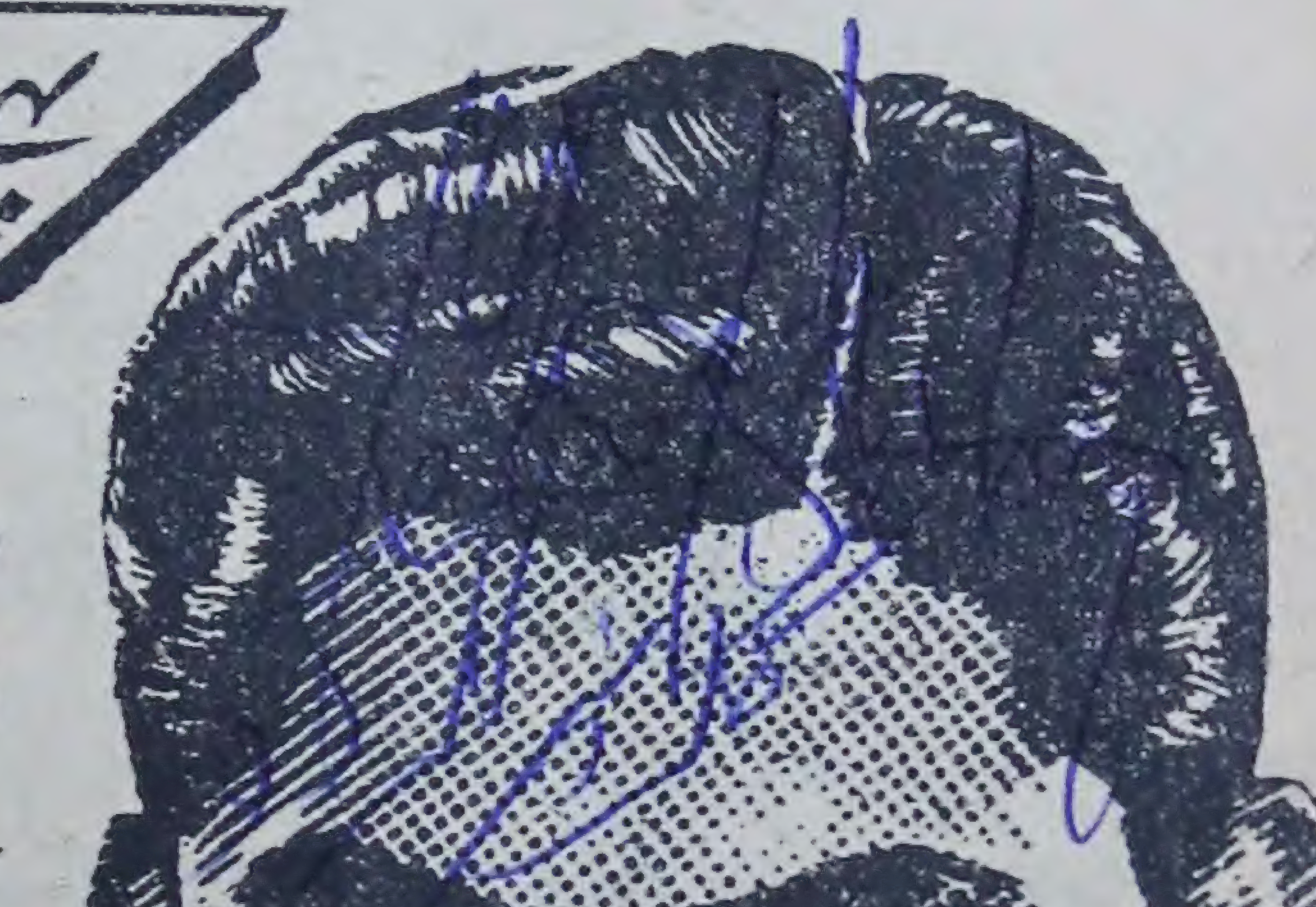
ایک مرتبہ اُن کا رشتہ دار سیلون میں اُن کے ہمراہ جا رہا تھا۔ اُن کے سیکرٹری نے اس رشتہ دار کے لیئے ٹکٹ خرید لیا، اور نمبر رجسٹر میں درج کر دیا۔ جب صاحب بہادر کو معلوم ہُوا تو اُنہوں نے کہلا بھیجا کہ چونکہ وہ خود ٹکٹ خرید چکے ہیں۔ اِس لیئے دوسرا ٹکٹ واپس کر دیا جائے۔ سیکرٹری نے ٹکٹ واپس کر دیا۔ لیکن گاڑی کے چلنے کے وقت رجسٹر میں درج کرنے کے لیئے ٹکٹ کا نمبر دریافت کیا، تو صاحب بہادر نے نہایت سادگی سے کہہ دیا۔ "کوئی اندیشہ

نہیں۔ جو نمبر آپ نے لکھا ہے، وُہی لکھا رہنے دیں"۔

ٹکٹ واپس کیا جا چکا تھا، اور دُوسرا ٹکٹ اُنہوں نے ابھی کوئی لیا نہ تھا معاملہ صرف ساٹھ روپیہ کا تھا۔ اور کئی سو ساٹھ روپے، وُہ صاحب بہادر کبھی کبھی دان کے طور پر بھی دے دیا کرتے تھے۔

ٹھیک ہی کہا ہے ——— بددیانتی کبھی عادت بن جاتی ہے۔

پہلے جیب دیکھئے



مَیں ایک بار ایک دُکان پر کچھ خریدنے گیا۔ وہاں میرے سے پہلے ایک اور گاہک اپنی ضرورت کی چیزیں لے رہے تھے۔ اُن کے ساتھ تھی اُن کی بیوی، بیٹا اور بیٹی۔ باہر بجلی کی روشنی میں کالے رنگ کی اُن کی بڑی موٹر چمچما رہی تھی۔ ایسے گاہکوں کو اپنی دُکان پر پاکر کون خوش نہ ہوگا؟ اِس لئے وہ دُکاندار بھی بہت خوش تھا، اُن کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔

جب سامان بندھ گیا، تو دکاندار نے سب چیزوں کے دام جوڑ کر بڑے ادب سے اُنہیں بل دیا۔ اُن صاحب نے بڑی شان سے روپے دینے کو فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا، مگر وہ ہاتھ پھر باہر ہی نہ نکلا۔ ڈرے ہوئے سانپ کی طرح بل میں اندر ہی سہم کر بیٹھ گیا۔

بڑے ہی پریشان تھے وہ۔ ایسا معلوم دیا کہ جیسے اُنہوں نے بجلی چھولی ہو، اور اُس کے جھٹکے سے اُن کے ہوش اُڑ گئے ہوں۔

مَیں اور دکاندار کچھ دیر دیکھتے رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اُن کی بیوی اور بچے خریدے ہوئے سامان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ چکے تھے، مگر وہ بچارے وہیں کھڑے ایکٹنگ کر رہے تھے۔ اُنہیں آتا نہ دیکھ کر بچوں نے اُنہیں بُلایا۔ "کم آن ڈیڈی! وی ہیو فنشڈ، وی ڈو ناٹ وانٹ اینی تھنگ مور"۔

بچوں نے جو کہا۔ وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ وہ کہہ رہے تھے ۔۔۔ "پتاجی! آ جاؤ۔ ہم جو خریدنا تھا خرید چکے ہیں۔ اب ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے"۔ اُن بچاروں کو کیا معلوم کہ آنا پتاجی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ اُن کے پیر اُٹھائے نہیں اُٹھتے تھے۔ لینا ختم ہوتے ہی دینا جب شروع ہوا، تو وہ خود ہی ختم ہو گئے۔ چھوٹی سی غلطی سے اُن پہ جو بیت رہی تھی اُسے وہی جان رہے تھے۔

مَیں ڈر رہا تھا کہ کہیں دکاندار داموں کے لئے اَڑ گیا تو یہ مصیبت موٹر میں بیٹھی اُن کی بیوی اور بچوں پر بجلی بن کر گر پڑے گی۔ رکھا ہوا سامان موٹر سے اُترے گا، اور پتہ نہیں پھر آگے کیا ہوگا۔ اِس ڈر سے میرا کلیجہ بیٹھا جا رہا تھا، مگر دکاندار سمجھدار تھا۔ وہ تاڑ گیا کہ گاہک گھر سے چلتے وقت روپے لینا بھول گیا ہے۔

اُس نے بڑی ہمّت سے بات سہارلی ۔۔۔ "آپ فکر نہ کریں۔ روپے گھر سے بھیج دیں۔ یہ آپ کی ہی دکان ہے"۔

اُن صاحب کا تب کہیں چہرہ کھلا، پیر ہلکے ہوئے، مُنہ کھلا اور وہ چلتے چلتے پسینہ پونچھ کر بولتے گئے ۔۔۔ "ساری! میرا پرس گھر ہی رہ گیا۔ تھینک یُو"۔

۲

ایک گاہک نے اُس دن پنساری کی دکان پر چھٹانک بھر چکنی سپاری تُلوائی، جب پیسے دینے کی باری آئی، تب بدقسمتی سے اُس نے اپنی جیب خالی پائی۔

صبح کا وقت تھا۔ دکاندار کو یہ برداشت نہیں اور جب گاہک نے کہا کہ "مَیں ابھی آتا

ہوں"۔ تو جل بھن کر اُس نے کہا ــــــ "بڑا آیا ہے سپاری کھانے والا۔ گھر میں نہیں دانے اور امّاں چلی بھنانے"۔ اور بس بات یُونہی بڑھ گئی کہ نوبت مار پیٹ تک پہنچی ؛

بات تو وُہی کہ چلتے وقت جیب نہ دیکھی تھی۔ مگر وہاں دونوں سمجھ دار تھے، تو نبھ گئی اور یہاں دونوں بے سمجھ تھے تو بھڑ گئے ؛

مَیں آپ سے یہی کہنا چاہتا ہُوں کہ آپ گھر سے اکیلے چلیں یا کسی کے ساتھ اور دُکان میں کچھ خریدنے کے لئے بیوی کے ساتھ جائیں یا کسی دوست کے ساتھ، اپنی جیب سے ضرور پُوچھ لیجئے کہ خریدنے کی چیز کے لئے آپ نے پیسے لئے ہیں یا نہیں؟ ایسا نہ ہو سَودا طے ہو جانے پر پیسے دیتے وقت پیر سے زمین کھسک جائے، اور سر پر مصیبت آپڑے، یعنی بے مطلب بے عزّتی ہو ؛

اچھّا بولنے والا



میرے دوست جے۔ ایس۔ برٹن نے ڈیپارٹمنٹ سٹورز سے ایک سُوٹ خریدا۔ وُہ مایُوس کُن ثابت ہُوا۔ کوٹ کا رنگ، رگڑ سے نکل کر اُس کی قمیض کی کالر کو رنگتا تھا۔ وہ سُوٹ لے کر واپس اُسی دکان پر پہنچا اور جس سیلز مَین نے وہ سُوٹ دیا تھا اُسے اپنی ساری کتھّا سُنائی۔ مُعاف کیجئے یہ مُبالغہ ہے۔ بات اصل میں یُوں ہے کہ اُس نے اپنی کتھّا سُنانے کی کوشش کی، لیکن وُہ سُنا نہ سکا۔ اُسے بیچ میں ہی روک دیا گیا۔ سیلز مَین نے کڑک کر جواب دیا ــــــ "ہم ایسے ہزاروں سُوٹ بیچ چکے ہیں۔ آپ کی ہی پہلی شکایت آئی ہے"؛

اُس کے اِلفاظ یہی تھے، مگر اُس کے کہنے کا ڈھنگ اس سے بھی بُرا تھا۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ مَیں سمجھتا ہُوں، تُم ہم پر بوجھ ڈالنا چاہتے ہو"۔

یہ بحث بڑے زور سے چل رہی تھی کہ ایک دُوسرا سیلزمین بیچ میں آ کُودا۔ وہ بولا "رگڑ کھانے سے سب ہی کالے سُوٹ پہلے پہلے تھوڑا بہت رنگ دیا ہی کرتے ہیں۔ اِس کا کوئی عِلاج نہیں ہے۔ سستے کا یہی حال ہے۔ یہ رنگ میں نُقص ہے"۔

اس وقت تک مسٹر برٹن کو کافی غصّہ آچکا تھا۔ پہلے سیلزمین نے اُس کی ایمانداری پر شک کیا۔ دُوسرے نے اِشارہ کیا کہ برٹن نے گھٹیا درجے کی چیزیں خریدی ہیں۔ وہ غصّہ سے اُبلنے لگا۔ وہ اُنہیں کہنے کو ہی تھا کہ یہ لو اپنا سُوٹ اور بھاڑ میں جاؤ۔ مگر اُس وقت دُکان کا مینجر گھومتا ہُوا اُدھر آ نکلا۔ وہ اپنے کام میں ہوشیار تھا۔ اُس نے برٹن کا جذبہ بالکل بدل دیا۔ اُس نے ایک بہت ناراض آدمی کو بدل کر ایک مطمئن خریدار بنا دیا۔ اُس نے یہ کیسے کیا؟ تین باتوں سے:-

پہلے اُس نے برٹن کی ساری کتھا شروع سے آخیر تک بغیر ایک بھی لفظ مُنہ سے نکالے غور سے سُنی۔

دُوسرے جب وہ اپنی کتھا سنا چُکا اور سیلزمینوں نے پھر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا، تو وُہ اُس کے زاویہ نگاہ سے اُن کے ساتھ بحث کرنے لگا۔ نہ صرف اُس نے یہی بتایا کہ اُس کے کالر کو سُوٹ سے ہی رنگ لگا ہے بلکہ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ اُس دُکان سے کوئی بھی ایسی چیز نہ بیچی جائے جو خریدار کی پُوری تسلی نہیں کرتی۔

تیسرے اُس نے قبول کیا کہ اُسے خرابی کی وجہ معلوم نہیں۔ اُس نے بہت ہی سادگی کے ساتھ برٹن سے کہا ـــــ "آپ کیا چاہتے ہیں کہ مَیں سُوٹ کو کیا کر دُوں؟ جو کچھ بھی آپ کہیں گے مَیں ویسا ہی کرُوں گا"۔

اِس سے کچھ ہی منٹ پہلے برٹن اُن سے کہنے کو تیار تھا کہ اپنا اوٹ پٹانگ سُوٹ اپنے پاس ہی رکھو۔ لیکن تب اُس نے جواب دیا ـــــ "مَیں صرف آپ کا مشورہ چاہتا ہُوں۔ مَیں جاننا چاہتا ہُوں کہ اِس کا رنگ کیا ہمیشہ ہی اِس طرح دُوسرے کپڑوں کو لگتا رہے گا یا کچھ دیر بعد بند ہو جائے گا۔ اور اِس کا کیا علاج کرنا چاہیئے"۔

مینیجر نے برٹن کے سامنے تجویز رکھی کہ اس سُوٹ کو ایک ہفتہ اور پہن کر دیکھیے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ "اگر یہ تسلی بخش نہ ہُوا تو اسے ہمارے پاس لے آیئے۔ ہم اس کے بجائے کوئی دُوسرا دے دیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہُوئی"؛

برٹن صاحب مطمئن ہو کر دکان سے باہر آئے۔ ہفتہ کے خاتمہ پر سُوٹ بالکل ٹھیک ہو گیا اور اُس دُکان پر اُس کا پُورا پُورا اعتبار بنا رہا؛

●

میں ایسے بیوپاریوں کو جانتا ہوں، جو دُکان کے لیے بڑی مہنگی جگہ کرایہ پر لیتے ہیں۔ مال بڑی کفایت سے خریدتے ہیں۔ دُکان کی کھڑکیوں کو بہت خوبصورت ڈھنگ سے سجاتے ہیں۔ اشتہار پر سینکڑوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ لیکن ایسے کلرک اور سیلزمین نوکر رکھتے ہیں۔ جو بات کرتے ہُوئے خریداروں کو بیچ میں ٹوک دیتے ہیں، اُن کی بات کاٹتے ہیں، اُنہیں چڑا دیتے ہیں، اور اُنہیں دھکے مار کر دکان سے باہر نکال دینے کے سوا اور سب کُچھ کرتے ہیں؛

فرق تو ہے!

اکبر نے تان سین سے پُوچھا: "تمہارا اُستاد کون ہے؟ ما بدولت اُس کا گانا سننا چاہتے ہیں"؛

تان سین نے ادب سے سر جھکایا اور بولا ——— "وہ مہا پُرش ہیں۔ اُن کے لئے چاندی اور سونے میں کوئی کشش نہیں۔ نہ اُن کا دل بادشاہوں کی عظمت سے مرعوب ہونا جانتا ہے۔ اگر آپ ان کا گانا سننا چاہتے ہیں تو آپ کو اُن کی کٹیا میں جانا ہوگا"؛

اکبر نے شاہانہ لباس اُتار دیا اور معمولی آدمی کا بھیس بدل کر تان سین کے گورو سوامی ہری داس کی کٹیا میں داخل ہُوئے۔ گورو نے گایا۔ بادشاہ نے سُنا اور بے خود ہو گئے۔ ایسا گانا اُنہوں نے اپنی زندگی میں آج تک نہ سُنا تھا۔ بار بار جھومتے تھے اور تعریف کرتے تھے؛

واپسی پر بولے ۔۔۔ "تان سین! تمہارے گورو کے گانے میں عجیب تاثیر ہے، اُسے سُن کر ہم کسی دُوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ تمہارے گانے میں یہ کیفیت کیوں نہیں؟"

تان سین نے مُسکرا کر جواب دیا ۔۔۔ "گانا ایک ہی ہے، فرق صرف دربار کا ہے۔ میں چھوٹے بادشاہ کے دربار کا راگی ہُوں، وہ کائنات کے سب سے بڑے بادشاہ کی خوشی کے نوکر ہیں۔ میرا بادشاہ خوش ہوتا ہے تو روپیہ اور مرتبہ دیتا ہے۔ اُن کا بادشاہ خوش ہوتا ہے، تاثیر بخشتا ہے۔"

اپنے آپ کو سزا دیجیے

چند سال گذرے، پیرس کے نزدیک کسی گاؤں میں ایک پنشن یافتہ فوجی افسر رہا کرتا تھا۔ اُس کے پاس دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔ اِتنے پر بھی وُہ اوّل درجہ کا کنجوس تھا۔ علاوہ اِس کے اُس میں ایک سخت عیب تھا جس کی وجہ سے اُس کی شریف بیوی کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ یعنی جب اُس پر غصّے کا بھوت سوار ہوتا تھا تو دیوانوں کی طرح آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اور ایسی ایسی بیہودہ باتیں کہہ دیتا تھا کہ سُننے اور دیکھنے والے دانتوں تلے اُنگلیاں کاٹتے تھے۔ جب جن سر پر سے اُتر جاتا تھا تو وہ سخت پشیمان ہوتا تھا۔ اور ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتا تھا۔

اُس کا ایک دِلی دوست اُس کے اِس برتاؤ پر اکثر اسے لعنت ملامت کیا کرتا تھا۔ اور وہ بے چارہ بھی بار بار اقرار کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی بات پر اُسے طیش آ گیا اور خوب جھلّایا۔ جب ذرا ہوش آیا، تو فوراً اپنا بکس کھول کر ایک ہزار فرانک کا نوٹ نکالا اور دیا سلائی لگا کر پھونک دیا۔ دوست نے کہا "ارے بے وقوف، اِس سے کیا حاصل ہُوا؟" فوجی افسر نے کہا۔ "مَیں نے اپنے آپ کو سزا دی ہے۔ جو چیز مجھے نہایت پیاری تھی۔ مَیں نے اُسے اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دیا ہے"۔ وُہ اسی طرح اپنے آپ کو سزا دیتا رہا۔ تقریباً دس ہزار پونڈ کے نوٹ جلانے کے بعد آخر اُس نے اپنے مزاج پر قابو پا کر غصّہ کے دیو کو مغلوب کر لیا۔

ہمیں بھی اپنے آپ کو سزا دینے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ مثلاً اگر زبان سے کبھی سخت

چند غیر مُلکی واقعات



سیوا کی زندگی

(۱)

مَیں نیٹال (افریقہ) کے شمالی اضلاع میں دَورہ کر رہا تھا، کہ میری آنتوں میں شدّت کا دَرد پیدا ہُوا۔ ایک ڈاکٹر نے بتلایا کہ میرے پیٹ میں اپنڈے سائیٹس کی شکایت پیدا ہو گئی ہے اور اِس کا واحد علاج ہے آپریشن۔ مجبوراً ڈسٹرکٹ سرجن کو بلایا گیا۔ اُس نے بھی آپریشن کرانے کا مشورہ دِیا۔ ازاں بعد اَور ڈاکٹروں کی صلاح لی۔ سب آپریشن کے حق

لفظ یا غلط بات نکل جائے تو دو تین گھنٹے خاموش رہنے کا ارادہ کر لیا کریں یا جو چیز بہت مرغوب ہو، وہ نہ کھایا کریں۔ اگر کوئی اور قصور ہو گیا ہو تو اپنے خرچ کے پیسے کسی غریب محتاج



کو دے دیا کریں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بد عادتیں ایک ایک رفع ہو جائیں، تو اپنے آپ کو ہر غلطی کے لئے سزا دیجئے، ایسی سزا جس سے آپ کے دل کو چوٹ لگے، اور آپ اُس غلطی کو دور کرنے کے لئے سخت بے قرار ہو جائیں۔ بہت سے لوگوں نے اس طریق سے اپنی بہت سی بُری عادتوں کو ترک کر دیا ہے اور نیک عادتیں حاصل کی ہیں ؛

میں تھے ؂

آخر کار میں ڈربن کے سینٹ ایڈینس ہسپتال میں داخل ہُوا۔ یہ ہسپتال ہمدرد عیسائیوں کا جاری کردہ ہے۔ میرے لئے الگ کمرے کا بندوبست ہُوا تھا۔ یہ کمرہ بہت چھوٹا مگر خوشنما اور صاف ستھرا تھا ؂

آپریشن کے دن بہت سویرے سسٹر ہرپاٹ میرے کمرے میں آئیں۔ اُنہوں نے مجھے ننگا ہونے کو کہا۔ لیکن مَیں تو شرم میں ڈُوب گیا۔ سسٹر نے میرے دِلی جذبات کو بھانپ لیا، اور بولیں ــــــ "مسٹر وِیال! یہ شرم کرنے کی جگہ نہیں ہے، آپ مجھے اپنی بہن سمجھیں اور کوئی پس و پیش نہ کریں"۔ مَیں نے حکم کی تعمیل کی۔ سسٹر نے میری جائے پاخانہ میں جلاب کی پچکاری لگائی، اور میری آنتیں دُھل کر صاف ہو گئیں۔ اِس کے بعد اُسترے سے اُنہوں نے میری پیٹھ کے بال بنائے اور وہاں کوئی دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ میری زندگی میں یورپین بہنوں کی سیوا کا تجربہ کرنے کا یہ پہلا ہی موقعہ تھا۔ پاخانہ و پیشاب سے انسان کو فطرتاً نفرت ہوتی ہے، لیکن اِن بہنوں نے سیوا کا عہد کرتے وقت جیسے نفرت اور حقارت کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ انسان کی خدمت اِن کی زندگی کا مقصد اولین بن چکا ہے ؂

ٹھیک وقت پر ڈاکٹر گولڈ برگ آئے اور اُن کے ساتھ ڈاکٹر سمتھ بھی۔ سسٹر نے مجھے آپریشن کی کھاٹ پر اُلٹا لِٹا دیا۔ چیر پھاڑ کے سب ہتھیار تیار تھے۔ میری ناک پر ایک ٹوپ رکھ کر اُس پر ڈاکٹر نے کلوروفارم ڈالنا شروع کیا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ اور بس۔ مَیں گہری بے ہوشی میں ڈُوب گیا۔ دو گھنٹے تک مَیں بالکل بے ہوش رہا۔ اِس دوران میں میرا پیٹ چیرا گیا۔ بیماری کی جڑ کاٹ کر نکالی گئی، اور زخم کو سی دیا گیا۔ جب میری آنکھیں کھُلیں تو دیکھا۔ مَیں اپنی کھاٹ پر پڑا ہُوا ہُوں۔ ڈاکٹر سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے پُوچھا ــــــ "کیوں، آپریشن ہو گیا؟" اُنہوں نے کہا ــــــ "آپریشن کامیاب رہا" ؂

ڈاکٹر کا کام ختم ہو گیا اور اب سسٹر کی سیوا شروع ہُوئی۔ انجکشن دینا، چلانے پلانا، بدن پر تیل ملنا، گرم پانی میں کپڑا بھگو کر غسل کرانا، کپڑے پہنانا وغیرہ سب کام سسٹر کے ہاتھ سے ہونے لگے۔ اِن بہنوں کی سیوا میں مجھے مسیح کی تعلیم کی جھلک دکھائی دی

(۲)

ایک دِن میری موجودگی میں ایک مدراسی عورت ہسپتال میں لائی گئی۔ وُہ حاملہ تھی۔ ڈلیوری کا وقت قریب تھا۔ پیٹ میں بچّہ اُلٹ گیا تھا۔ اُسے ناقابِلِ برداشت درد ہو رہا تھا۔ اُس کو تڑپتے اور چلّاتے ہُوئے دیکھ کر مَیں ایک دَم کانپ اُٹھا۔ لمحہ بھر کے لئے بھی اُسے چین نہیں تھا۔ اُس کا ہاتھ پَیر مارنا دیکھ کر پتھر دِل بھی ایک بار پگھل جاتا۔ سسٹر نے اُسے فوراً چارپائی پر لِٹایا اور کسی چیز کا انجکشن دے دیا۔ بس پانچ منٹ بعد اُس عورت کو قدرے چین نصیب ہُوا، اور وہ سو گئی۔ لیکن سسٹر کو چین کہاں؟ وُہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھی۔ کبھی وُہ گرم پانی لاتی تھی۔ کبھی رُوئی کا پھاہا اور کوئی دَوا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دو دِن میں اُسے اِتنا آرام پہنچایا گیا کہ تیسرے دِن اُس نے آسانی سے بچّہ جنا۔ سسٹر نے فوراً زچّہ کو گرم پانی سے دھویا، کپڑے بدلے، بستر بدلا۔ بچّہ کو بھی غسل دِیا، پوڈر لگایا اور گرم کپڑے میں لپیٹ کر ایک کھٹولے میں سُلا دیا۔ ایک ہفتہ بعد عورت گود میں بچّہ لے کر گھر گئی۔ مَیں نے یہ سب دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ ایک یورپین دایہ بھی ایک ہندوستانی عورت کی اِس طرح سیوا کر سکتی ہے، اِس بات کا مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار تجربہ ہُوا۔

●

نرس کی زندگی سیوا کی زندگی ہے۔ سیوا کی زندگی اختیار کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، اِس کے لئے سیلف کنٹرول، ہمدرد دِل، کوشش اور محنت کی ضرورت ہے جس کے دِل میں ہمدردی اور اُنس کا چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ صِرف وُہی سیوا کا عہد کر سکتا ہے۔

● ہسپتالوں اور نرسنگ ہومز میں ہزاروں مائیں اور نوزائیدہ بچّوں کی دیکھ بھال جن کے ذریعے ہوتی ہو، گھر بار سے دُور جنگی چھاؤنیوں میں گھائل سپاہی کو جن کی دو میٹھی باتوں سے چین نصیب ہوتا ہو۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نازک آپریشنوں کی کامیابی کا دار و مدار جن کی چُست سیوا پر منحصر ہو، جن کی ذرا سی بے احتیاطی سے ایک مریض کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہو، ایسی نرس کی ضرورت اور اہمیت کو بھلا کون تسلیم نہ کرے گا۔

● اگر سیوا کی سچی لگن ہو، وقت بھی ہو تو ایسی بہنیں نرس کی شکل میں دلیش اور جاتی کی قابلِ قدر سیوا کر سکتی ہیں۔ اس کے لئے ہمیں بہنوں اور بیٹیوں کے دل میں یہ جذبہ بھرنا ہوگا کہ نرس کا دھندہ ایک اعلےٰ، معزز اور شریفانہ دھندہ ہے۔ بلکہ انسانی خدمت کے لحاظ سے کئی دوسرے معزز دھندوں سے زیادہ افضل ہے ؛ (بھوانی دیال سنیاسی)

انگلستان کا بھنگی

مَیں پہلے پہل انگلینڈ میں اُترا ہی تھا کہ مجھے تھوڑے ہی دِنوں بعد ایک ایسے مکان میں جانا پڑا جو بالکل نیا تھا، اور سچ پوچھا جائے تو جس وقت اُس میں پہنچا وہ پُورے طور سے بن کر تیار بھی نہیں ہؤا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد بھی اُس میں کچھ دنوں تک کام ہوتا رہا۔ ایک مستری جس کا نام ہیری تھا اُس کو ٹھیک کر رہا تھا، اُسی نے اُس میں پتھر لگائے، سفیدی کی، رنگ چڑھایا اور فرش بچھایا۔ کام ختم ہی ہونے والا تھا کہ اُس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایک دِن مَیں نے مالک مکان سے پُوچھا کہ ہیری کا کیا ہُوا ؟

اُس نے کہا۔ " ہیری، ارے، اُسے تو ایک بڑھیا کام مِل گیا ہے۔ اب تو وہ میونسپلٹی کے لئے کام کرنے لگا ہے۔ مَیں اُسے جو تنخواہ دیتا تھا، اُس سے وُہ کہیں زیادہ پانے لگا ہے ؛

مَیں نے پُوچھا — " میونسپلٹی کا کیسا کام ؟"

مالک مکان نے کہا — وُہ سڑکوں کو صاف کرنے کا کام کرنے لگا ہے۔ اگر آپ کسی دِن ڈیوِیچ گاؤں کی طرف جائیں گے تو وہ آپ کو ضرور مِلے گا، کیونکہ وہ اُسی طرف لگایا گیا ہے۔ میونسپلٹی میں نوکری مِل جانے سے اُس کی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے مَیں اُس کو اِتنا زیادہ کبھی نہیں دے سکتا تھا ؛

کچھ دِنوں بعد مَیں نے ہیری کو سڑک پر جھاڑو لگاتے ہُوئے دیکھا۔ مالی حالت بہتر ہو جانے کے باعث اُس کا چہرہ کھِلا ہؤا تھا۔ مستری ہوتے کے بجائے جھاڑو دینے کا کام مِل جانے سے کوئی اپنے کو خوش قسمت سمجھ سکتا ہے، یہ مَیں نے پہلے پہل وہیں دیکھا۔ میری آنکھیں کھُل گئیں ؛

کوڑا اُٹھانے والوں یا سڑک پر جھاڑو لگانے والوں کا کام اگرچہ گندا ہوتا ہے، مگر جب یہ لوگ نہا دھو کر اور اپنی بڑھیا پوشاک پہن کر باہر نکلتے ہیں، تب وہ ویسے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کہ معزز لوگ! ؁

(۲)

ایک دن کی بات ہے۔ مجھے ٹھیک یاد ہے کہ ہم لوگ اپنے ہی مکان کے پاس ایک چھوٹے سے پارک میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اِتنے میں میری عورت نے پوچھا۔ —"جس بھلے مانس نے ابھی ہم لوگوں کو سلام کیا ہے وہ کون ہے؟" (انگلینڈ میں ٹوپ اُتارنے کا مطلب ہی سلام کرنا ہوتا ہے) ؁

مَیں نے ہنس کر کہا —"اُسے مَیں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتی ہو۔ کوڑا اُٹھانے والا، وہی جو ہر ہفتے میں ایک بار اپنے پچھلے آنگن میں کوڑا اُٹھانے آیا کرتا ہے"؁

میری عورت نے کہا —"ہاں ٹھیک ہے۔ اَب مَیں بھی اُسے پہچان گئی۔ اِسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ جو اسے نہ پہچانتا ہوگا وہ شائد یہی کہیگا کہ حضرت کسی بنک کے مینجر ہوں گے یا کسی آفس کے سپرنٹنڈنٹ۔ یہ تو کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ یہ آدمی بھی ہفتہ بھر تک اُس گندے کام کو کرتا ہوگا، جو ہم لوگوں نے دیکھا ہے"؁

مَیں نے کہا —"نہیں یہ بات نہیں ہے یہ ہندوستان تھوڑے ہی ہے یہاں جھاڑو والا اچھوت نہیں سمجھا جاتا۔ وہ سب لوگوں کے ساتھ برابری سے ملتا جلتا ہے۔ وہ سڑکوں پر جھاڑو دیتا ہے یا ہمارے گھروں میں کوڑا کرکٹ اُٹھا لے جاتا ہے، محض اِسی وجہ سے کوئی اُس پر اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ وجہ یہی کہ وہ لوگ اُن لوگوں کو جھاڑو دینے کے باعث نفرت اور حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، وہاں ننانویں سے ننانوے فیصدی لوگ کبھی اِس بات کو سوچتے ہی نہیں کہ کوڑا اُٹھانے والے یا جھاڑو دینے والے جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ حقیر ہے ؁ (نہال سنگھ)

●○●



ماں کا دل

پچھلے کرسمس کے دنوں میں، شام کے وقت لندن کے ایک تھیئٹر سے اپنی بیوی اور اپنے پانچسال کے بیٹے کے ساتھ میں نکلا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہُوا تھا، اور ٹھنڈک بہت سخت پڑ رہی تھی لیکن بڑے دنوں کی وجہ سے شہر میں غیر معمولی طور پر رونق تھی۔ تمام دکانیں بیش قیمت سامان سے خوب سجی ہوئی تھیں، اور ان گنت مرد، عورتیں اور بچے دکانوں میں اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے اور سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

بیوی تو سردی سے بچنے کے لئے زمین کے نیچے چلنے والی انڈر گراؤنڈ ٹرین سے گھر چلی گئی۔ میں اور میرا بچہ اولڈ دچ محلے سے دکانوں کی کھڑکیوں میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اُورن کی طرف چلے۔

راستے میں ایک خوب سجی ہوئی دکان کی کھڑکیوں میں ہم دونوں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ کچھ ہی منٹوں کے بعد میں نے دیکھا۔ کہ میرا بیٹا نہیں ہے! اس جگہ اس وقت عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ راستے میں تِل رکھنے کی جگہ نہیں تھی، اور میرا بیٹا بہت کمسن تھا۔

اُس کی عمر صرف پانچ سال تھی ؛

مَیں تڑپ اُٹھا، میرا کلیجہ خوف سے کانپنے لگا۔ خوف اِس بات کا تھا کہ اِتنی بھیڑ میں وُہ کیسے ملے گا، اَور سڑک پار کرتے ہُوئے کہیں کسی "موٹر کار" یا "بس" کے نیچے آ کر پِس نہ جائے۔ سڑک کے اُوپر نیچے اُسے ڈھونڈتا ہُوا میں دوڑنے لگا، اَور سڑک پر اخبار بیچنے والوں سے پُوچھتا کہ بھائی، کہیں پانچ سال کے سانولے رنگ کے ایک بچّے کو دیکھا ہے؟ لیکن کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ سڑک کے نیچے ایک پولیس مَین سے پُوچھا، تو اُس نے پاس والے تھانے میں جانے کی صلاح دی ؛

تھوڑی دُور جا کر تھانے میں داروغہ کو خبر دی۔ اُس نے مجھے تسلی دے کر کہا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ تُمہارا بچّہ اس لنڈن شہر میں کھو نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے، وہ ابھی کسی پولیس مَین کے ساتھ ہوگا، نہیں تو تھوڑی دیر میں ہو جائے گا اور اگر تم آدھ گھنٹے کے بعد پھر یہاں آؤ، تو ممکن ہے، اُسے یہاں کھیلتے ہُوئے پاؤ گے ؛

یہ سُن کر مجھے کسی قدر اطمینان ہُوا، اَور مَیں پھر اُسی سڑک پر آیا، جہاں میرا بچّہ کھویا تھا۔ ایک اخبار والے سے پھر پُوچھنے لگا۔ اُس نے کہا، "ابھی تک بچّے کا پتہ نہیں لگا؟ آپ گھبرائیں نہ، بچّہ مِل جائے گا" ہماری باتیں ایک عورت سُن رہی تھی۔ جب مَیں آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوئے آگے بڑھا، تو وُہ دَوڑی ہُوئی میرے پاس آئی، اَور بولی ـــــ "معاف کیجئے، مَیں نے آپ کی باتیں سُن لی ہیں۔ آپ کا بچّہ کھو گیا ہے، گھبرائیے نہیں، چلئے مَیں بھی آپ کی کچھ مدد کر دُوں۔ ایک طرف آپ ڈھونڈتے جائیے اَور دُوسری طرف مَیں۔ لیکن دونو اسی جگہ پر ملیں گے۔ اَور اگر بچّہ نہ مِلا، تو پھر مشورہ کریں گے، اس کے بعد کیا کرنا چاہیئے" ؛

مَیں نے دیکھا، کہ عورت کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان ہے۔ اِس لئے مَیں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے کہا ـــــ "آپ زحمت نہ کریں۔ مَیں تھانے میں خبر دے آیا ہُوں اَور اُنہوں نے مجھے آدھ گھنٹے میں بُلایا ہے"۔ اُس نے کہا ـــــ "نہیں، کچھ بھی ہو، مَیں بچّے کے ڈھونڈنے میں آپ کا ساتھ دُونگی"۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل دی، اَور مَیں دُوسری طرف ڈھونڈنے چلا۔ قریب آدھ گھنٹہ کے بعد مَیں مایُوس ہو کر اپنی بتائی ہُوئی جگہ پر آ کر کھڑا ہُوا

ہی تھا۔ کہ وہ عورت دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی، اور ہنس کر بولی ——— "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کا بچہ مِل گیا۔ وہ اس وقت اوورن کے تھانے میں کھیل رہا ہے"۔

مَیں خوش ہو کر بولا ——— "مہربانی کر کے بتایئے وہ تھانہ کہاں ہے؟"

وہ بولی ——— "مَیں خود آپ کے ساتھ چل کر بتاتی ہُوں"۔

مَیں نے کہا ——— "یہ زحمت مَیں آپ کو نہیں دینا چاہتا، آپ صرف راستہ بتا دیں، اور یہ بتائیں کہ آپ کو بچّے کا پتہ کیسے لگا؟"

عورت نے کہا ——— "مَیں سڑکوں پر کھڑے ہُوئے تمام پولیس مینوں سے پُوچھتی گئی۔ ایک نے مجھے بتایا کہ بچّہ بھُولا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ جسے مَیں نے اپنے ایک دُوسرے ساتھی کے ساتھ پولیس سٹیشن پر بھیج دیا ہے"۔

وہ عورت زبردستی مجھے ٹرام گاڑی پر لے گئی۔ اور اس کے کنڈکٹر کو مجھے تھانے پر اُتارنے کو کہہ کر چلی گئی۔

دس منٹ میں مَیں ٹرام سے اُتر کر تھانے میں پہنچا، دیکھا، میرا بچّہ ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہُوا طرح طرح کے کھلونوں سے کھیل کھیل کر ہنس رہا ہے۔ مَیں پولیس کا شکریہ ادا کرتا ہُوا بچّے کو لے کر گھر آیا۔

مَیں سوچنے لگا۔ مَیں نے کتنے مردوں سے اپنے بچّے کے بارے میں پُوچھا ہے، لیکن صرف زبان سے چند الفاظ کہہ دینے کے سوا کسی نے عملی طور پر میری مدد نہیں کی ——— لیکن اُس عورت نے بغیر کہے ہُوئے اپنا کام چھوڑ کر بچّے کی تلاش میں میری مدد کی اور اس کا پتہ لگایا۔ وہ اس کی ماں نہ تھی، لیکن عورت تھی۔ اُس کے پہلو میں ماں کا دِل تھا۔

(جگن ناتھ (پروفیسر) بی۔ ایس سی

تیسرے درجہ کا سفر

پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہُوا۔ انگلستان میں اسّی برس سے زیادہ عمر کا ایک بُوڑھا

وزیرِ اعظم تھا، جس کا نام گلیڈسٹون تھا۔ اس نے اِتنا نام پیدا کیا کہ انگریز قوم تو کیا ساری دُنیا اس کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وہ ایک غریب پادری کا لڑکا تھا۔ حد درجہ کا سادگی پسند۔ ریل کا سفر کرتے وقت وُہ ہمیشہ تیسرے درجہ کا ٹکٹ لیتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ اگر پبلک کے سُکھ دُکھ کا حال معلوم کرنا ہو، تو تیسرے درجے میں سفر کرنا چاہیئے۔

اُن دِنوں وکٹوریہ رانی تھیں۔ اور وُہ ٹھاٹھ باٹھ، ٹیپ ٹاپ کو بہت پسند کرتی تھیں اُنہیں گلیڈسٹون کی سادگی پسند نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وزیرِ اعظم ٹھاٹھ سے رہیں۔

ایک دِن گلیڈسٹون کسی کام کے لئے رانی کے پاس اُن کے دیہاتی محل میں ریل کے ذریعے گئے۔ رانی نے پُوچھا ——— "آپ کس درجہ میں سفر کر کے آئے ؟

گلیڈسٹون ——— "میں تیسرے درجے میں آیا ہوں"۔

رانی ——— "آپ تیسرے درجے میں کیوں آئے" ؟

گلیڈسٹون ——— "کیونکہ چوتھا درجہ تھا ہی نہیں"۔

رانی ——— "مگر آپ کا لڑکا تو اوّل درجہ میں سفر کرتا ہے" ؟

گلیڈسٹون ——— ملکہ معظمہ! وُہ تو انگلستان کے وزیرِ اعظم کا بیٹا ہے۔ میں تو ایک غریب دیہاتی پادری کا بیٹا ہوں، میری کیا حیثیت ہے کہ اس کی برابری کروں۔

اچھی پولیس

قریب پچیس برس کی بات ہے میں امریکہ کے کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ کالج میں چھُٹی تھی، اور ریلوے کے ٹکٹ کے دام میں رعائیت ہو گئی تھی، اس لئے میں نے نیاگرہ آبشار کی بہار دیکھنے کا ارادہ کیا۔ پٹسبرگ سٹیشن سے رات کی گاڑی پکڑ کر دُوسری صبح بفلیو سٹی پہنچا اور سویرے کا ناشتہ کر آبشار کو دیکھنے نکلا۔ اِس نرالے منظر کو دیکھ قُدرت کی کاریگری پر حیرت ہوتی ہے۔ کیسا خوشنما نظارہ اِس آبشار کا ہے! پانی کا زبردست بہاؤ، اِتنے زیادہ پانی کا اِتنی اُونچائی سے گرنا اور پھر چٹانوں سے ٹکرا کر بھاپ کی شکل اختیار کر بادلوں کی طرح اُوپر آنا کتنا اچھا لگتا ہے!

اِس کی بہار دیکھنے کو بہت بھاری بھیڑ جمع ہوتی ہے، میلہ سا لگ جاتا ہے۔ قدرت کی اِس کاریگری سے صرف دِل کو شانتی اور سُکھ ہی نصیب نہیں ہوتا بلکہ اِنسان نے اُس سے مالی مشینیں بھی لگا رکھی ہیں۔ بجلی کی کتنی ہی طاقت اُس سے پیدا کی جاتی ہے۔

دِن بھر آبشار کے نزدیک گزار کر شام کی گاڑی سے فلاڈلفیا شہر آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ رات بھر فلاڈلفیا کے کسی ہوٹل میں گزار کر دوسرے دِن شہر کی سیر کر کے لوٹ جاؤں۔

اِس اِرادہ سے اپنا ہینڈ بیگ ہاتھ میں لے کر سٹیشن سے باہر آیا اور ایک ہوٹل میں گھسا۔ ہوٹل کے بابو سے کہا کہ مجھے ایک کمرہ چاہیئے۔ اُس نے کہا ——— "افسوس! اِس وقت تمام ہوٹل بھرا ہوا ہے اور کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ خیر، اُس ہوٹل سے نکل تھوڑی دُور ایک اور ہوٹل میں گیا۔" کیوں بھائی! رات بھر سونے کے لئے مہربانی کر ایک کمرہ دیجیے؟"

"بڑا افسوس! کوئی کمرہ خالی نہیں ہے"۔

اِس طرح لگاتار چار گھنٹے ——— ساڑھے دس بجے رات تک ——— تمام شہر میں چکر لگاتا رہا کہ کہیں بھی سونے کے لئے ایک کمرہ مِل جائے، مگر جہاں جاتا، بس ہوٹل بھرا مِلتا۔

آدھی رات ہو چکی تھی، سردی کافی تھی، گھومتے گھومتے پاؤں تھک گئے تھے اور بدن ٹوٹ رہا تھا کیا کریں، کہاں جائیں؟ اپنے مُلک کی طرح وہاں دھرم سالہ نہیں تھیں، نہ وہاں قدرت ہی رحم دِل ہے کہ کھلے آسمان کے سایہ میں کہیں لیٹ جائیں۔ موسم سخت، لوگ سخت، سبھی باتیں اپنے ناموافق۔

راستے میں ایک لمبا چوڑا پولیس مین گشت لگاتا ہوا مِلا۔ نزدیک جا کر مَیں نے کہا ——— براہِ مہربانی کیا آپ کہیں اِس رات تک ٹھہرنے کی جگہ بتلا سکتے ہیں؟ مَیں ایک پردیسی انجان مُسافر ہوں۔ تمام شہر میں گھوم پھر چکا ہوں کہ کسی ہوٹل میں ایک کمرہ مِل جائے مگر شائد کالا ہونے کے سبب مجھے کوئی ٹھہرانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اُس نے کہا ——— "کیا تم نے فلاں فلاں ہوٹل میں کوشش کی؟"

مَیں نے کہا ——— "تمام ہوٹل چھان ڈالے مگر کامیابی کہیں نہیں ہوئی"۔

کچھ سوچ کر وہ بولا ——— "اچھا، آپ میرے ساتھ آیئے، مَیں پولیس تھانہ میں چل کر اپنے

انسپکٹر سے صلاح لُوں گا ؎

مَیں اُس کے ساتھ ساتھ پولیس سٹیشن پر آیا، جہاں انسپکٹر صاحب سے مُلاقات ہُوئی۔ وہ بیچارے بہت پریشان ہُوئے کہ کیا کیا جائے۔ آخر ہیں بولے ——— "دیکھئے، رات زیادہ ہوگئی ہے۔ مَیں ایک صلاح آپ کے سامنے پیش کرتا ہُوں۔ آپ سوچکر بولیں کہ آپ کو منظور ہے یا نہیں میری رائے میں سب سے اچّھا یہ ہَے کہ تھانہ میں کئی کوٹھڑیاں خالی ہیں۔ وہ سب صاف سُتھری ہیں اور اُن پر سپرنگ دار گدّے پلنگ لگے ہُوئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے کمرے دِکھانے لے گیا۔ گو وہ کمرے قیدیوں کے لئے تھے، تو بھی اُس آزاد ملک میں قیدی بھی اِنسان سمجھے جاتے ہیں، اور اُن کے بھی آرام کا خیال کیا جاتا ہے۔ اِس کے عِلاوہ ایک سونے کا کمرہ مجھے مُفت مِل رہا تھا اور پیسے کی میرے پاس سخت کمی تھی، اِس لئے مَیں نے شکریہ کے ساتھ انسپکٹر صاحب کی پیشکش کو قبول کیا، اور ہینڈ بیگ میں سے اپنا سونے کا کپڑا نکال کر کپڑے بدلے، پھر اُس قیدی کے کمرے میں مُلائم پلنگ پر، جس پر پتہ نہیں کتنے مجرم سوچکے ہوں گے، لمبی تانی اور ایک غیر مجرم کی گہری نیند کی ترنگیں لیں ؎

دُوسرے دِن آٹھ بج چکے تھے، جب ایک سپاہی نے کمرے پر کھٹ کھٹ کرنا شروع کیا۔ اُٹھ کر کمرہ کھولنے پر معلوم ہُوا کہ انسپکٹر صاحب نے سلام بھیجا ہے۔ داڑھی مونچھ بنا، ہاتھ مُنہ دھو، کپڑے بدل۔ انسپکٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اُنہوں نے بڑی مسرّت کے ساتھ میری آؤ بھگت کی اور پُوچھا کہ کھٹملوں نے تو رات کو نہیں ستایا۔ مَیں نے کہا ——— "مَیں اِتنا تھکا تھا کہ پلنگ سے پیٹھ لگتے ہی نیند نے ایسا قبضہ کیا کہ مجھے دین دُنیا کا کچھ بھی پتہ نہ رہا۔ اور اگر سپاہی نے اُٹھایا نہ ہوتا تو چند گھنٹے اور بھی سوتا رہتا۔ اِس پر وہ ہنس کر مجھے اپنے کھانے کے کمرے میں لے گیا، اپنے پریوار سے تعارف کرایا۔ اور ناشتہ کرنے کو کہا۔ شکر گذاری کے ساتھ مَیں نے پیٹ پُوجا کی اور پھر شہر گھومنے نکلا۔ دِن بھر چاروں طرف کی سَیر کر رات کو گاڑی سے اپنے یُونیورسٹی کے شہر ہیمبرگ واپس آیا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا ؎

(جگن ناتھ الیکٹریکل انجینئر)

جاپانیوں کا اِخلاق

گرمی کا موسم تھا۔ مَیں "کوبے" شہر کی سر سبز پہاڑیوں سے گزر کر چھ سات میل دُور دیہات میں چلا گیا۔ راستہ میں ایک گاؤں کے ننھے ننھے بچے کھیل کُود میں مصروف تھے۔ ایک تین سالہ دیہاتی لڑکا کھیلتے کھیلتے زمین پر گِر گیا۔ مَیں نے اُس کو زمین پر سے اُٹھایا۔ گرد جھاڑا، اور عام فہم جاپانی زبان میں چند لفظوں سے اس کو دِلاسا دِیا۔ اِتنے میں اس لڑکے کی بڑی بہن جس کی عُمر پانچسال سے متجاوز نہ تھی۔ گھر سے باہر آ گئی۔ پہلے اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بھائی کے بائیں شانہ پر رکھا۔ اس کو پیار و محبّت کے رَس میں سموئی ہُوئی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر میری طرف مخاطب ہُوئی۔ تین دفعہ نہائت ادب سے جُھک کر اس علاقہ کی دیہاتی زبان میں کہا ــــ "مَیں آپ کی اِس بے اِنتہا مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہُوں"۔ یہ معمُولی سا واقعہ جاپانیوں کے بے نظیر اخلاق کا مظہر ہے۔ ناظرین اِس امر کو فراموش نہ کریں کہ وہ کمسن لڑکی کِسی بڑے شہر میں رہنے والے کسی اعلےٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلّق نہ رکھتی تھی، وُہ ایک معمُولی دیہاتی کِسان کی لڑکی تھی۔ اور مَیں ایک غیر جاپانی شخص تھا ؛

(۲)

ستمبر ۱۹۲۴ء میں مَیں "کوبے" شہر کے ایک چھوٹے سے جاپانی طرز کے بنے ہُوئے گھر میں رہا کرتا تھا۔ اِس اثناء میں میری جاپانی ماما رخصت پر اپنے گھر چلی گئی اور چند روز بعد میں بیمار ہو گیا۔ اُن دِنوں میری حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میرے گھر میں پانچ چھ روز سے جھاڑو نہیں دِیا گیا تھا۔ برتن بے ترتیبی سے بکھرے ہُوئے تھے۔ ایک دِن بیماری کی حالت میں مَیں اُٹھا اور اپنے گھر کو صاف و شفاف اور برتنوں کو قرینے سے آراستہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ کچھ دِنوں کے بعد جب مَیں تندرست ہو گیا تو مَیں نے اپنی بُوڑھی پڑوسن سے اِس معاملہ کا ذِکر کیا، اور پُوچھا: کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ مجھ پر یہ مہربانی کِس نے کی تھی۔ جب مَیں نے بہت اِصرار کیا تو میری پڑوسن نے کہا کہ یہ کام میری لڑکی نے کیا تھا۔ یہ جاپانیوں کے اِخلاق کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے ؛ (امر سنگھ بمرال)

صفائی کا شوق

ہندوستان کے ایک گریجویٹ جاپان گئے۔ ایک دن وہاں کی ریل میں سفر کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنے دونوں پیر بوٹ سمیت سامنے کی سیٹ پر رکھ لئے۔ یہ ایک معمولی بات تھی، کیونکہ ہمارے ملک میں سب ہی ایسا کرتے ہیں۔

اُن کے پاس ہی بیٹھے تھے ایک اسّی سالہ بزرگ، اُنہوں نے اپنی جیب سے اخبار نکالا، اور ہندوستانی گریجویٹ سے کہا۔ "براہِ مہربانی ذرا پیر اُٹھایئے گا۔" اُنہوں نے پیر اُٹھائے، تو اُس نے پیروں کی جگہ وہ اخبار بچھا دیا اور حلیمی سے کہا۔ "اب آپ پیر رکھ لیجئے۔ اِس طرح آپ کے آرام میں بھی خلل نہیں پڑے گا، اور میرے ملک کی یہ چیز، سیٹ کی گدّی، بھی خراب نہ ہوگی"۔

"تھینک یو" کہہ کر ہندوستانی نے کاغذ پر پیر رکھ لئے۔ تھوڑی دیر بعد بزرگ جاپانی نے اپنی ٹوکری سے نکال کر کچھ پھل کھائے اور اُن کے چھلکوں کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔

ہندوستانی گریجویٹ سے نہ رہا گیا اور پوچھ ہی لیا۔ بزرگوار! یہ چھلکے آپ نے جیب میں کیوں رکھ لئے ہیں؟ —— جواب ملا۔ "یہاں انہیں کہاں ڈالتا؟ اب اسٹیشن پر اُتر کر وہاں کوڑا ڈول ملے گا، اُس میں ڈال دوں گا"۔

اپنے ملک کی صفائی کے لئے کتنا محتاط تھا وہ بوڑھا!

گئو بھگت

تقریباً پانچ بجے میں لنڈن پہنچا۔ دو گھنٹے کے بعد جب گھومنے کے لئے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں، سڑک کے دونوں کناروں پر دودھ کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر گھر کے

سامنے پانچ دس بوتلیں ضرور تھیں۔ ضرورت کے مطابق وہاں دُودھ والے ہر گھر کے سامنے صبح سویرے دُودھ کی بوتلیں رکھ دیتے ہیں۔ اور دُوسرے دن صبح جب وہ دُودھ دینے آتے ہیں تو خالی بوتلیں لے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی یہ شکایت سُننے میں نہیں آئی کہ ان میں سے کچھ بوتلیں کم ہو گئی ہیں یا کسی نے انہیں چرایا ہے ؛

مَیں نے جب ہوٹل کے آدمی سے اپنے لئے ہر روز دُودھ کی بوتل لینے کے لئے کہا۔ اور یہ ہدایت کی کہ دُودھ اچھا ہونا چاہیئے۔ تو اُس نے مجھ سے پُوچھا "اچھے دُودھ کا کیا مطلب ہے"؟

مَیں نے کہا۔ "وہ دُودھ جس میں پانی نہ ملایا گیا ہو" ؛

یہ سُن کر جیسے ہوٹل والے کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے میرے چہرے کی جانب ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے وہ کسی عجیب آدمی کو دیکھ رہا ہو۔ اُس نے مجھ سے پُوچھا۔ "کیا دُودھ میں پانی بھی ملایا جا سکتا ہے"؟

"ہاں"

یہ سوال کرتے وقت وُہ مجھے عجیب آدمی سمجھ رہا تھا، وہ اِس پر یقین ہی نہیں کر سکتا تھا، کہ دُودھ میں پانی بھی ملاتے ہیں۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر مَیں اپنے دِل میں کہنے لگا یہ شخص نہیں جانتا کہ ہندوستان میں دُودھ میں ہی پانی نہیں ملایا جاتا بلکہ پانی میں دُودھ ملایا جاتا ہے اور دُودھ کے نام سے اُسے فروخت کیا جاتا ہے ؛

اِنگلینڈ میں دُودھ بھارت سے سستا ملتا ہے۔ ایک پونڈ کی بوتل کے پانچ یا چھ آنے لگتے ہیں اور یہ گائے کا خالص دُودھ ہوتا ہے۔ پانی اِسے چھُو بھی نہیں پاتا۔ مَیں نے مغربی یورپ کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی۔ لیکن وہاں مجھے کہیں بھینس نظر نہیں آئی۔ حقیقی معنوں میں اِنگلینڈ وغیرہ ممالک ہی مجھے گؤ بھگت نظر آئے ؛ (کاشی ناتھ سیتارام وید)

قانون کی اطاعت

ایک بار شہنشاہ رُوس معہ اپنی پیاری ملکہ کے ہوا خوری کرتے ہُوئے اُس وقت

ریل کے پھاٹک پر پہنچے، جبکہ گاڑی کے آنے میں کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ محافظ پھاٹک بند کر چکا تھا۔ شاہ نے پھاٹک کھولنے کو کہا۔ محافظ نے عرض کیا کہ میں ریلوے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

اس پر شاہ نے کہا۔ "تمہیں میرے حکم کی تعمیل کرنا چاہیئے کہ میں تمہارے ملک کا بادشاہ ہوں"۔ محافظ نے ادب سے کہا کہ آپ ضرور بادشاہ ہوں گے، مگر میں جس قانون کا پابند بنایا گیا ہوں، اس کے خلاف عمل کرنے سے مجبور ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی آئی اور چلی گئی، محافظ نے پھاٹک کھولا۔ شاہ نے محافظ کا نام اور نمبر وغیرہ لکھ لئے۔

دوسرے روز اس قانون پابندی کے صلہ میں اس کو اعزاز و اکرام کے طور پر فوج کے کرنل کا اعلےٰ عہدہ دیا گیا۔

(۲)

ایک بار شاہ انگلستان ایڈورڈ مرحوم کی ملکہ کے کسی عزیز کے بچہ پیدا ہوا۔ ملازمین کی غفلت سے پولیس اسٹیشن میں اطلاع نہیں ہوئی۔ جب ملکہ کو اس قانونی خلاف ورزی کی خبر ہوئی، تو آپ نے فوراً ایک چٹھی کے ساتھ زرِ جرمانہ قریب کے پولیس اسٹیشن میں بھیج دیا۔

ٹھیک ہے، دنیا میں جو قومیں عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں، اُن کو لازم ہے کہ وہ مروجہ قوانین کی سچے دل سے فرمانبرداری اور اطاعت کریں۔

نہایت قیمتی مشورے

ہندوستان میں دوائیوں اور دواخانوں کی کمی نہیں۔ پھر بھی یہاں کے لوگوں کی عمر دوسرے ملکوں کی نسبت بہت کم کیوں ہے۔ اور دوائیوں کا خاص رواج نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے بزرگوں کی عمر سینکڑوں برس کیسے ہوتی تھی؟ بات اصل یہ ہے کہ ہمارے روز کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے متعلق کچھ ایسے اصول ہیں، جنہیں ہم بھول گئے ہیں۔ ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" نے اپنی کتاب "رہنمائے صحت" میں سینکڑوں قیمتی مشورے دیئے ہیں۔ جن کے مطابق چل کر آدمی سکھ سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔

● کبھی آپ نے سوچا ہے کہ بعض لوگ کیوں بہت ہر دلعزیز نہ ہوتے ہیں ؟ کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ آسانی سے اِتنی جلدی دُوسروں کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں اور دیر عرصہ تک دوستی کا رشتہ قائم رکھ سکتے ہیں ؟ کیوں بعض لوگ کوشش کرنے پر بھی دُوسروں کو متاثر نہیں کر پاتے اور کہ ان کی دُوسروں سے نہیں بنتی ؟

● کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کئی بار آپ سوچنے لگتے ہیں کہ کیوں دُوسرے لوگ، جو کہ قابلیت اور تجربے میں آپ سے کہیں پیچھے ہیں، آپ سے اُونچے رُتبے کے مالک ہیں اور زیادہ دولت پیدا کر رہے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ کئی بار آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کیونکر بعض لوگ اِتنی جلدی ترقی کر پاتے ہیں جبکہ کوشش کرنے پر بھی آپ سے ایسا نہیں ہو پاتا ؟

● کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ زندگی کے ہر شعبہ میں اور عمر کے ہر دور پر یہی چاہتے ہیں کہ خوشحال اور کامیاب رہیں۔ اسی طرح آپ یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ آپکی گھریلو زندگی خوشگوار ہو، بیوی آپ سے خوش رہے، گھر والے آپ سے محبت کریں۔ آپ قومی لیڈر ہیں تو عوام سے آپ محبت، احترام اور اطاعت کے خواہاں ہیں —— غرضیکہ آپ کو زندگی کے ہر دور میں اور ہر شعبہ پر ایک کامیاب آدمی بننے کی تمنّا ہے۔ —— گھبرائیے نہیں، رہنمائے زندگی کا سپیشل ایڈیشن "جینا سیکھو" آپ کے لئے بہتر زندگی کے پیغامات لئے ہوئے ہے۔ ہم نے اس سپیشل ایڈیشن کو اس یقین اور اِس اعتماد کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ اگر اِس پر عمل کیا جائے تو آپ کی زندگی میں حیرت انگیز تغیرّات ہو سکتے ہیں۔ ایسے تغیرّات کو شاید آپ کو خود ہی یقین نہ آئے کہ آپ کیا سے کیا ہو گئے ہیں !

● ایسی شاندار اور لاجواب تصنیف کو ایسے موزوں وقت پر، جبکہ آج ہم ادھوری، اُکھڑی اُکھڑی، اور بے چینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، پبلک میں پیش کرتے ہوئے ہم بجا طور پر فخر اور اطمینان محسوس کرتے ہیں !!

● ڈاکٹر اوم پرکاش لکھتے ہیں :۔ "سپیشل نمبر" جینا سیکھو" سچ مچ اِسم بامسمّٰی ہے۔ اِسے پڑھ کر عمل میں لانے والا اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے سماج کے لئے بھی ایک آدرش نمونہ بن سکتا ہے، اور زندگی کا سچا سُکھ پراپت کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں ایک اچھی قومیت پیدا کرنے کے لئے اور قومی اخلاق کو بلندیوں پر لے جانے کے لئے اِس سے اچھا اور دُور اندیش رہبر مشکل سے ہی ملے گا۔ یہ خاص نمبر یقیناً بہت سے بھولے بھٹکے کو راہِ راست پر لائے گا۔ اِسے پڑھ کر ہر آدمی اپنے آپ کو پہلے سے کچھ نہ کچھ بہتر خیال کرے گا "!

چُٹکیاں

کار آمد ... ... اشارے

میاؤں

رات کا وقت تھا۔ مَیں اپنی خواب گاہ کی کوٹھڑی میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اور اُونگھ رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور دیوار پر سایہ بھوت بَن بَن کر ناچ رہا تھا۔ ابھی تک کھانا تیار نہ ہُوا تھا۔ اس لئے میں آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا تھا۔ معاً ایک آواز آئی —— "میاؤں"۔ تب میں نے آنکھیں مَل کر دیکھا ایک چھوٹی سی بلّی تھی۔ میرے سرہانے جو پینے کے لئے دُودھ کا کٹورا رکھا ہُوا تھا۔ وہ اسے بڑے اطمینان سے پی چکی تھی۔ اور اب سیر ہو کر زبان ہونٹوں پر پھیر رہی تھی، اور کہہ رہی تھی "میاؤں"۔ میں ثابت نہیں کر سکتا، مگر میرا خیال ہے کہ بلّی کی میاؤں میں طنز پوشیدہ تھی۔ شائد وُہ میری طرف دیکھ کر ہنستی تھی اور کہتی تھی کہ کوئی کماتے، کوئی کھاتے۔ تمہارا دُودھ تو مَیں پی گئی۔ اب تم کیا کرو گے؟



کرتا کیا؟ مجھے تو کوئی پتہ نہیں لگتا تھا کہ کیا کہتا اور کیا کرتا۔ دُودھ میرے باپ کا نہیں تھا، دُودھ تھا گائے کا، اور اُسے دوہنے والی تھی گوالن، اِس پر جیسا حق میرا ہے، ویسا ہی بلّی کا بھی ہے۔ اِس باعث سے مَیں اِس پر اِظہارِ غم و غصّہ نہ کر سکا۔ مگر عرصہ دراز سے رسم جاری ہے کہ بلّی دُودھ پی جائے تو اُسے مارا جاتا ہے۔ اِس رسم کو توڑ بدنام ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا، کہ اگر مَیں خاموش رہا، تو ممکن ہے، بلّی اپنی برادری میں جاکر مجھے بُزدِل کہے۔ اِس خیال سے مَیں نے یہی فیصلہ کیا کہ مردانگی کو ہاتھ سے نہ جانے دُونگا۔ پس تلاشِ بسیار کے بعد ایک ٹُوٹی ہُوئی لکڑی لے کر بلّی کو مارنے کے لئے اُٹھا۔

بلّی مجھے پہچانتی تھی۔ لکڑی دیکھ کر بھی ٹھہری رہی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ایک جمائی لی، اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ مَیں نے لکڑی پکڑ کر کہا ——— "تاڑوں تیری کمر میں ایک، دو، تین۔ کم بخت میرا دُودھ پی گئی ہے۔ بلّی نے پنجہ چاٹنا شروع کیا، مجھے ملائی والا دُودھ یاد آگیا۔ مَیں افسوس کرتا ہُوا چارپائی پر جا بیٹھا اور حُقّہ پینے لگا"۔

بلّی نے کہا "میاؤں" مجھے ایسا معلُوم ہُوا گویا بلّی کہہ رہی ہے، مارتے کیوں ہو؟ ذرا آرام سے حُقّہ پیو اور غور کرو۔ کیا دُنیا کی تمام اشیاء ——— دُودھ، دہی، مکھن، ملائی، حلوہ، بھات، محفل تمہارے ہی لئے ہے۔ کیا ان اشیاء میں ہمارا حِصّہ نہیں ہے؟ تم آدمی ہو۔ ہم بلّیاں ہیں۔ مگر ہم میں اور تم میں فرق کیا ہے۔ کیا ہم کو بھُوک نہیں لگتی؟ کیا ہم کو پیاس کا احساس نہیں ہوتا؟ تم کھاتے ہو۔ ہم خاموش رہتے ہیں، مگر جب ہم ذرا پیٹ پُوجا کرتے ہیں تو تم لاٹھی اُٹھا لیتے ہو۔ اِس بد تہذیبی کے کیا معنی ہیں؟ ہم سے سبق حاصل کرو، وَرنہ مر کر تمہاری نجات حاصل نہ ہوگی۔ تمہارے سکُولوں اور کالجوں کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ تُم لوگوں کو ہم سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

"دیکھو! پلنگ پر بیٹھ کر حُقّہ پینے والے آدمی! دھرم کیا ہے؟ دُوسروں کو فیض پہنچانا دھرم ہے۔ اِس دُودھ سے میری بھُوک مٹی۔ دُودھ تمہارا تھا۔ لہٰذا تُم نے دھرم کمایا ہے۔ مَیں نے چوری کی یا ڈاکہ ڈالا۔ لیکن تم اِتنا یاد رکھو۔ کہ تمہارے اس دھرم کی کمائی کا حقیقی ذریعہ مَیں ہُوں۔ اس لئے بجائے اِس کے تم مجھے لاٹھی دِکھاتے، گالیاں دیتے۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ میری

تعریف کرتے کہ مَیں نے تمہیں دھرم کا راستہ دِکھایا ہے، تم سے دھرم کا کام کرایا ہے ؟

"تُم کہو گے۔ مَیں نے چوری کی۔ ٹھیک، لیکن یہ تو بتلاؤ۔ یہ چوری کیا مَیں شوق سے کرتی ہُوں۔ جسے کھانے کو بآسانی تمام دستیاب ہو سکتا ہو وہ چوری نہیں کر سکتا۔ اور نہیں کرتا۔ بڑے بھاری سادھو مہنت ایماندار سمجھے جاتے ہیں جو چوری کا نام سُن کر لرز جاتے ہیں۔ وُہ چوروں سے بھی بڑھ کر مجرم ہیں ـــــ اِنہیں چوری کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اِس لئے وُہ چوری نہیں کرتے لیکن ضرورت سے زیادہ اشیاء ہونے پر بھی وُہ غریبوں کی طرف دِھیان نہیں کرتے۔ اِسی لئے چور چوری کرتے ہیں۔ گویا گناہ کا مرتکب چور نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایماندار ہوتا ہے جو آپ کھاتا ہے مگر دُوسروں کو کھانے نہیں دیتا۔ اِس کی ایمانداری ہی دُوسروں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ چور پکڑا جاتا ہے اُسے سزا ہو جاتی ہے۔ لیکن چوری کی جڑ کنجُوس کو کوئی نہیں پُوچھتا کہ تم نے یہ کیا فساد ڈال رکھا ہے۔ جو دِن رات چوریاں کراتے رہتے ہو ؟

مَیں ایک گھر سے دُوسرے گھر میں میاؤں میاؤں کرتی پھرتی ہُوں، مگر تم لوگ مجھے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیتے۔ لوگ بچی ہُوئی خوراک کُتّوں کو ڈال دیتے ہیں۔ نالی میں پھینک دیتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہی نہیں کرتے۔ تمہارا پیٹ بھرا ہُوا ہے۔ تم فاقہ کشی کا عذاب کیا جانو۔ افسوس! غریب سے اِظہارِ ہمدردی میں کیا تمہاری شان کم ہو جاتی ہے۔ اِسے دو روٹیاں دے دِیا کرو۔ کیا ہرج ہے ؟ رات کو اگر کھاٹ تک چور لے جائیں تو دبک کر پڑے رہو گے۔ لیکن بِلّی دُودھ کا کٹورا پی لے تو لکڑی ڈھونڈتے ہو۔ یہ کیوں ؟

دیکھو۔ اگر رائے صاحب دیوی داس یا خان صاحب کریم بخش تمہارا دُودھ پی جاتا تو تم اُسے مارنے کو تیار ہو جاتے ؟ نہیں ہاتھ باندھ کر کہتے۔ "جناب کیا کچھ اور لاؤں"۔ پھر حضرت! میرے لئے لکڑی کیوں ؟ تم کہو گے وُہ بڑے آدمی ہیں، عالم فاضل ہیں، مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا ان کو ہم سے زیادہ بھُوک لگتی ہے۔ نہیں۔ تو پھر تم لوگ کرتے کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جِسے ضرورت نہیں اُنہیں دینے کو اِنسان کی عادت ہے۔ غریب مفلس کو کوئی نہیں دیتا۔ جو نہیں نہیں کرتے ہیں، اُن کو کہتے ہیں۔ "تھوڑا سا کھا لو"۔ "چلو یار کیا ہرج ہے، آج ہمارا کچن پاکیزہ کرو"۔ مگر جو مانگتے ہیں، جن کے پیٹ خالی ہیں، اُن کو دیتے وقت تمہارا دِل چھوٹا سا ہو جاتا ہے۔ اور اگر

وہ بے تکلّفی سے خود ہی لے لیں تو لاٹھی اُٹھا لیتے ہو۔ اِس کا کیا سبب؟

ہماری حالت دیکھو۔ وہ بدر مانگتی پھرتی ہیں۔ میاؤں میاؤں کرتی رہتی ہیں ـــــ کوئی روٹی کا ٹکڑا انہیں دیتا۔ جب بھوک زیادہ چمکتی ہے تو پکار پکار کر کہتی ہیں۔ میاؤں (یعنی مَیں آؤں؟) کھانے کو کچھ نہیں مِلا۔ میاؤں! بھئی ہمارا سیاہ جھڑا دیکھ کر ہم سے نفرت نہ کرو۔ دنیا کی برکات پر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔ اِس لئے یا تو خود بخود کھانے کو دے دو۔ ورنہ مجبوراً "چوری کریں گے۔ حیرت تو اِس بات کی ہے کہ ہمارا خشک چہرہ، خالی پیٹ اور سوالِ مجسّم آنکھیں دیکھ کر بھی تمہارے دِل میں ہمدردی کی لہر نہیں اُٹھتی۔ چور کے لئے قانون ہے تو کیا سنگ دِل بخیلوں کے لئے قانون نہیں ہے؟ غریب آدمی زندہ رہنے کے لئے روٹی کھاتا ہے تو یہ جُرم ہے، لیکن امیر بخیل غریبوں کا خیال نہیں کرتا، تو یہ جُرم نہیں ہے؟ کیا تم پر یہ امر واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ چوروں کی چوری کا حقیقی باعث امیروں کا بخل ہے۔ تم حُقّہ کی نے مُنہ سے نکال کر مجھے جواب دے دو کہ ایک امیر کو کیا حق ہے کہ وہ پانچ سو غریبوں کو بھوکا رکھ کر آپ اِس فخر سے گرم رہے کہ میرے حساب کا بینک میں اتنے ہزار روپیہ جمع ہے۔ اگر اُس کے پاس زائد روپیہ ہے تو غربا میں تقسیم کیوں نہیں کر دیتا۔ ورنہ بھوکے فاقہ مست ضرور چوری کریں گے۔ کیونکہ قدرت نے کسی کو بھوکا مرنے کے لئے پیدا نہیں کیا"۔

بلّی کی یہ تقریر سُن کر مَیں سنّاٹے میں آگیا۔ مَیں نے کہا "تمہاری باتیں سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کر دینے والی ہیں۔ اگر دنیا کے عیش و آرام پر اور برکتوں پر سبھی کا حق یکساں ہے کہ وہ اپنا روپیہ غربا میں تقسیم کر دیں۔ تو اِن کو کیا ضرورت ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے روپیہ کمائیں۔ کیوں نہ وہ بھی تمہاری طرح دُوسروں سے حصّہ طلب کرنے پر کمر کس لیں۔ بلّی! تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم قوم کو تباہ و برباد کر دو گی"۔

بلّی نے جواب دِیا ـــــ "یعنی ترقی نہ ہوگی۔ ٹھیک میرا یہی مطلب ہے، مگر اس سے ہم کو کیا غرض؟ اگر اُمراء کے پاس روپیہ نہیں رہتا تو اِس میں غربا کا کیا نقصان ہے؟"

مَیں نے غصّہ سے جواب دِیا ـــــ "قومی دولت کی زیادتی کے بغیر قوم شاہراہِ ترقی پر نہیں چل سکتی"۔

"مگر مجھے کھانے کو نہ ملے تو مَیں تمہاری ترقی کو کیا کروں"؟

بلّی کو سمجھانا مشکل ہو گیا۔ جو غور و فکر کرنے والا ہوتا ہے اور جس کا دماغ منطق کی دلایل ڈھونڈتا ہے۔ اِس کے کوئی بات ذہن نشین کرنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بلّی معلوم ہوتا ہے منطق کے اصول جانتی تھی۔ اِس لئے میرے قابُو میں نہ آئی۔ تب مَیں نے مصلحت دیکھ کر کہا۔ ہو سکتا ہے کہ قومی ترقی سے غُربا کو خاص فائدہ حاصل نہ ہو۔ لیکن اُمراء کو اِسی میں بہتری و بہبُودی مُضمر ہے۔ لہذا چور کو چوری کی سزا دینا عین انصاف ہے"۔

بی بی بلّی نے پھر کہا ——"آپ چوروں کو پھانسی دے دیجئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی ایک اور قاعدہ بھی وضع کر لیجئے۔ جو مُنصف چور کے مقدمہ کی سماعت کرے، پہلے اُسے تین دِن بھوکا رکھا جائے۔ اِس پر بھی اگر وہ کسی کی رسوائی سے چوری کرتا ہُوا نہ پکڑا جائے یا کسی حلوائی کی دُکان پر جھپٹا مارنے کی خواہش اِس کے دِل میں نہ پَیدا ہو، تو چور کو پھانسی دے دِیا جائے۔ تم مجھے مارنے اُٹھے تھے۔ تو تم ہی سے شروع کرتی ہُوں۔ آج سے تین دِن تک فاقہ کرو۔ اور اِس کے بعد اگر تم سے پُوچھوں گی کہ کیوں بھُولی بلّی کو روٹی کا ٹکڑا کھانے پر لکڑی سے پیٹنا چاہیئے یا نہیں۔ یقیناً اُس وقت تک تمہاری رائے بدل گئی ہوگی"۔ (بنکم چندر)

یہ آدمی!

پَیدا ہونے کے بعد ابھی اُس نے کل ہی آنکھیں کھول کر پہلی بار روشنی دیکھی تھی۔ اور آج ہی اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں صبح ہوتے ہی کہیں اُڑ گئی ہے۔ وہ اس کو اُڑتے ہُوئے ننھی ننھی اور کچی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

دُوسرے دِن اُس کی ماں اُس کے پاس ہی رہی۔ وہ گاہے بگاہے ہلتا رہا۔ اُس نے گردن نکال کر گھونسلے سے باہر بھی دیکھا۔ اُوپر کچھ نیلی نیلی چیز پھیلی ہوئی تھی۔

جھالریں یہ سب چیزیں اُس کے دِل کو بہت بھاتیں، اَور کئی بار اُس کا دِل وہاں اُترنے کو چاہتا۔ لیکن باپ کے ڈر سے چُپ رہتا۔ ایک دِن وُہ ماں کے ساتھ اکیلا ہی آیا۔ اَور ضِد کر کے وہاں اُتر گیا۔ ننھے بچّے خوبصُورت کپڑے پہنے اِدھر اُدھر کھیل رہے تھے۔ نفیس اَور جھلمل کرتی ہُوئی ساڑھیاں پہنے عورتیں پھر رہی تھیں۔ بچّے بہت خوش تھے۔ ناچتے، گاتے، بھاگتے۔ اُس نے ماں سے پُوچھا —— "یہ کون ہیں؟"

ماں نے کہا۔ "یہ آدمی ہیں بیٹا" اُس نے سوچا۔ آدمی کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ عیش کرتے ہیں۔ اُس نے ماں سے پُوچھا —— "یہ یہاں کھیلتے ہیں ماں۔ یہ کھیتوں میں اناج کھانے کیوں نہیں جاتے؟"

ماں نے جواب دیا —— "اُن کو گھر بیٹھے بٹھائے ہی کھانے کے لئے مِل جاتا ہے" ؛

اَب تو اُس کو پُختہ یقین ہو گیا، کہ آدمی بہت خوش قسمت ہیں۔ اَور تب سے صبح و شام وہ آدمی بننے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وُہ ہر وقت دست بدُعا رہتا۔ "کاش۔ مَیں بھی آدمی بن جاؤں" ؛

اِسی طرح کئی دِن بیت گئے۔ اَور آدمی بننے کی خواہش اُس کے رُوم رُوم میں بس گئی۔ ایک دِن اُس کی ماں اُسے کسی اَور طرف لے گئی۔ راستے میں چند ٹوٹی پھُوٹی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ اَور وہاں سے بدبُو کا ایک اَبر سا اُوپر کو اُٹھ رہا تھا۔ وہاں سے اُترتے ہُوئے اُسے بہت تکلیف ہُوئی۔ اَور اُس پر سِتم یہ کہ اُن جھونپڑوں کے نزدیک ہی کہیں اُس کی ماں اُتر پڑی۔ اُس نے چند چھوٹے چھوٹے بچے بھی جھونپڑوں میں سے نِکلتے ہُوئے دیکھے۔ اُن کے کپڑے پھٹے ہُوئے تھے اَور نہائیت غلیظ تھے۔ اُن کے چہرے مَیلے تھے۔ اَور بال بکھرے ہُوئے تھے۔ محل والے لڑکوں کے مقابلہ پر اُسے یہ لڑکے بہت بُرے معلوم ہوئے۔ بہت سے لڑکے ایک لڑکے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اگلا لڑکا بھاگتا ہُوا چیخ بھی رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہُوا اِن کے قریب ہی آ کر گِرا۔ دُوسرے لڑکوں نے فوراً اُس کو دبوچ لیا۔ وہ بیچارا روٹی کے ایک ٹکڑے کو چھُپا رہا تھا۔ دُوسرے اُسے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اَور وہ چِلاّ رہا تھا ؛

اُس نے اپنی ماں سے پُوچھا۔ "ماں یہ کون ہیں؟"

ماں نے کہا۔ "یہ بھی آدمی ہیں" ؛

اُس نے کہا۔ "ماں آدمی تو اَیسے نہیں ہوتے۔ وُہ رو کیوں رہا ہے؟ اُس سے یہ لوگ



پھر اُس نے نیچے دیکھا۔ اور اتنی اونچائی سے نیچے کی زمین کی طرف دیکھ کر چکرا سا گیا۔ شاید گر بھی پڑتا۔ لیکن اُس کی ماں نے جھٹ چونچ سے اُس کی ننھی سی اُگتی ہوئی پونچھ کو پکڑ لیا۔ اور میٹھی زبان میں کہنے لگی۔ "میرے لال گھبراتے کیوں ہو۔ تم بڑے ہو کر اس سے بھی زیادہ اونچائی سے کود جایا کرو گے"۔

ماں کی باتوں کو سُن سُن ننھے پرندے کے دل میں نہ جانے، کتنے ولولے پیدا ہوئے۔ اُس نے اپنے ننھے پر کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ بالآخر وہ دن بھی آیا، جب وہ پہلے پہل اپنی ماں کے ساتھ درخت سے نیچے اُترا۔ رفتہ رفتہ وہ تھوڑی دور تک جانے لگا۔ اور آخر کار وہ باہر کھیتوں میں بھی جانے لگا۔ راستے میں وہ محلوں کے اوپر سے گزرتے تھے۔ وہاں باغات تھے۔ خوشنما پھول۔ فوارے۔ شاندار عمارتیں۔ رنگا رنگ کے پردے۔ فینسی

روٹی چھین رہے ہیں؟ وہ اور کیوں نہیں لے لیتے؟ اور ہو گی ہی نہیں؟"

اتنے میں ہی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ایک بڑا سا آدمی کھیتوں میں سے دوڑتا ہُوا آیا۔ اس کے سر سے لے کر چوٹی تک پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ اُن کے قریب آ کر لڑکوں کو مارنے لگا۔ اور اُس لڑکے سے روٹی لے کر اُس نے سب کو بانٹ دی۔ وہ لڑکا روتا ہی رہا ؎

اُس نے پھر اپنی ماں سے پُوچھا ــــ "ماں یہ کون ہے؟"

ماں نے کہا ــــ "یہ بھی آدمی ہیں!"

وُہ حیران ہو گیا۔ اُسکے تو کپڑے پھٹے ہُوئے ہیں۔ اس نے جھلمل کُرتی ساڑھی بھی نہیں پہن رکھی۔ یہ چھوٹے آدمی بھی رو رہے ہیں۔ ہنستے ہُوئے کھیلتے نہیں۔ ان کو روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ اِن کے گھر بھی ہمارے گھونسلوں کی طرح تنکوں سے بنے ہُوئے، پھر بھی یہ آدمی کیسے ہُوئے؟ آدمی تو وُہ بھی تھے۔ جہاں خوبصورت باغیچے ہیں، جہاں خوبصورت نہریں ہیں، جہاں فوارے ہیں، اگر یہ آدمی ہیں، تو وہاں کیوں نہیں جا بستے؟ ماں نے کہا: "بیٹا یہ غریب آدمی ہیں، کہاں ہیں، وہ امیر ہیں، راجہ ہیں۔ یہ کٹیوں کے رہتے ہیں۔ وُہ اِنکے خُون اور پسینے کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ اِن آدمیوں کی دُنیا ہی ایسی ہوتی ہے۔" اِتنا سُننے کے بعد اس ننھے پرندے کے معصوم دِل پر سخت چوٹ لگی۔ آدمی بننے کی خواہش اسکے دِل سے جاتی رہی۔ اور اُسے آدمیوں کی بے مزہ زندگی پر رحم آنے لگا ؎

بڑ کا لیکچر

میں نے کبھی بھنگ نہیں پی۔ نہ کبھی کسی نشی شے کا اِستعمال کرتا ہُوں۔ مگر ایک دن کالج کے لڑکوں نے لسی پلا کر کہہ دیا۔ کہ "بھنگ تھی۔ اور اب تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں"۔ مجھے بہت غصّہ آیا۔ اور میں لال پیلا ہو کر وہاں سے چلا آیا ؎

راہ میں بڑ کا درخت تھا۔ گرمی کی بہار تھی، جولائی کے دِن تھے، دوپہر کا وقت تھا۔ اسے دیکھا، تو جان میں جان آئی۔ فرضی بھنگ کے فرضی نشے میں ایسا معلوم ہُوا، گویا بڑ کا درخت کہہ رہا ہے۔ "ایسی گرمی میں کہاں پھر رہا ہے۔ میرے نیچے آ۔ اور آرام کر۔

تو مہمان بن، مَیں میزبان بنُوں گا، سُورج کی کرنوں کو اپنے سر پہ لوں گا، مگر تجھ تک نہ پہنچنے دُونگا
مَیں نے کہا۔" تو بہت اچھا درخت ہے۔ ایسے نیک فرشتوں پر دُنیا کا مدار ہے۔
زندگی تو چار دِن کی ہے۔ نام ہی رہ جاتا ہے۔ مگر آجکل تو خود غرضی کا زمانہ ہے۔ تو ایسا فیاض کیوں ہے؟"

"کیونکہ مَیں اس زمانہ کا نہیں ہُوں۔ میری پیدائش خود غرضی کی صدی سے پیشتر کی ہے"
مَیں نے تعجب سے پُوچھا۔" تمہاری عُمر کتنی ہے؟"
"کوئی ڈیڑھ سو سال"
"ڈیڑھ سو سال"؟
"ہاں ڈیڑھ سو سال"

بڑے خوش قسمت ہو۔ جو اتنی عمر تک زندہ ہو۔ ہم لوگ تو چالیس پچاس کے ہُوئے اور بیماریاں شروع۔ کاش میری عمر سو سال تک پہنچ سکے"
بڑ نے کہا۔" پہنچ سکتی ہے"
"کیسے؟"

"پرماتما نے جو جسم تمہیں دیا ہے۔ وہ چالیس برس کے لئے نہیں کم از کم سو سال کے لئے ہے۔ میرا پردادا کہتا تھا کہ اس نے آدمیوں کی معمولی عُمر سو سال کی دیکھی ہے"
"جھُوٹ"

بڑ کے درخت نے غُصّے سے کانپتے ہُوئے کہا۔" سندھیا عبادت کیا کرتے ہو؟"
"ہاں"

"بہت خُوب! ایک بھگت میرے پاس رہا کرتا تھا۔ وُہ ہر صبح شام پرماتما سے پراتھنا کیا کرتا تھا:۔

کہ ہے پرماتما مجھے سو سال کی زندگی دے۔ وہ زندگی نہیں، جس میں آخر وقت ٹھوکریں کھانا نصیب ہو، اور پانی کے گھُونٹ کے لئے بھی ترسنا پڑے۔ بلکہ وُہ زندگی جس میں آنکھیں آخر تک دیکھیں، کان آخر تک سُنیں۔ زبان آخر تک گمراہوں کو اُپدیش کرے۔ اور آزادی سو

سال تک قایم رہے، بلکہ اِس سے بھی زیادہ" ؛

"آزادی کے کیا معنی۔ ہوم رول ؟"

"نہیں نہیں۔ آزادی کے یہ معنی نہیں۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اِنسان سو سال تک آزادانہ زندگی گذار سکے۔ دُوسروں پر بوجھ نہ بنے۔ آپ دیکھے، آپ سُنے، آپ سوچے، آپ بولے، آپ اُٹھے، آپ بیٹھے۔ آج کل کے بُڈھے کو دیکھا ہے۔ بات بات میں دُوسروں کے ماتحت ہیں۔ پانی ملے تو پئیں۔ اُٹھ کر گلاس نہیں لے سکتے۔ روٹی چارپائی پر آئے تو کھائیں۔ آپ اُٹھ کر تھالی نہیں پکڑ سکتے۔ یہ غلامی ہے ؛

مزہ تب ہے جب سو سال کی آزادانہ زندگی حاصل کرو ؛

"وہ کیسے ملے ؟"

بڑ کے درخت نے کہا — "ورزش کرو، طاقت ور چیزیں کھاؤ، صبح سویرے اُٹھ کر سیر کرو، بُری چیزوں سے پرہیز کرو۔ اور ..... "

"ہاں۔ ہاں۔ اور ؟"

"بس اَب نہیں کہہ سکتا۔ سردست اِس پر عمل کرو۔ پھر آؤ گے تو کہوں گا۔ چند مُسافر آ رہے ہیں۔ اِن کی خاطر تواضع کرنا ہوگی ؛ (اشکمرج)



خوبصورت کھلونا

پرماتما نے مَرد کو اشرف المخلوقات بنا کر دُنیا کی بادشاہت سونپ دی۔ لیکن وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کا دِل بے چین رہتا اور طبیعت اُداس ؛

تب وہ پھر پرماتما کے حضور میں پہنچا ؛

پرماتما نے پُوچھا ــــــ "اب کیا چاہتے ہو؟"

مَرد نے کہا ــــــ "زندگی بے رس ہے۔ دِل میں ایک خلا سا ہے"۔

تب پرماتما نے اُسے ایک ساتھی دے دِیا ــــــ وُہ عورت تھی۔ اب اِنسان عیش و عِشرت کے جھُولے میں جھُولتا اور حُسن سے لُطف اندوز ہوتا۔ اسکی زِندگی میں ایک کشش، ایک رنگینی ایک مٹھاس تھی۔

اِس طرح اس کی عمر کا وقت ہنسی خوشی میں گزرنے لگا۔ لیکن ہنسی خوشی کا یہ زمانہ طویل نہ تھا۔

اب اس کا تشنہ کام رُوحِ حُسن سے شاداب ہوچکی تھی اور اس کا دِل کسی نامعلوم وجہ سے اُداس، بُجھا ہُوا اور مغموم سا رہنے لگا۔ اور عورت؟ وُہ بھی کھوئی سی معلوم دیتی۔ ایک کمی تھی جس نے دونوں دِلوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کر دیا۔ مرد کی محبّت وہ گرمی، وہ جوش اور وہ شاعرانہ بلند پروازی نہ تھی۔ اور عورت کی اطاعت، فرمانبرداری اور خدمت میں وہ ایثار نہ رہا، جس نے ان دونو روحوں کو ایک کر رکھا تھا۔ نہ معلوم، اِنسان اب کیا چاہتا ہے؟

وُہ پھر اُداس مُنہ بنائے پرماتما کے حضور میں پہنچا۔

پرماتما نے پُوچھا ــــــ "حضرت اب کیوں اُداس ہو؟"

مَرد نے جواب دیا ــــــ "مالک! زِندگی کچھ پھیکی پھیکی معلوم دیتی ہے"۔

پرماتما مُسکرائے ــــــ "ہم نے تمہیں سب جانداروں پر قادر بنایا۔ تمہیں دُنیا کی بادشاہت دِی۔ ایک حسین ساتھی دِیا۔ رنج و غم سے مبرا زِندگی دی۔ لیکن تم اب بھی مطمئن نہیں دِکھائی دیتے"۔

مَرد نے پریشانی سے سر جھُکاتے ہُوئے کہا ــــــ "بھگوان۔ نہ جانے آپ نے سب کچھ دیتے ہُوئے بھی کیا رکھ لیا ہے۔ اِس کو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں"۔

پرماتما نے کہا ــــــ "اچھا تو ایک شرط ہے۔ تمہیں وہ چیز دے دی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تمہاری بے فکر زِندگی چھین لی جائے گی۔ کہو تم اس شرط پر اُس کمی کو پُورا کرنا چاہتے ہو؟"

وہ بے ساختہ بول اُٹھا ــــــ "مَیں ہر کسی شرط پر اِس کمی کو پُورا کرنے کے لئے تیار ہُوں"؂
تب پرماتمانے اُسے ایک ننّھا سا، مُسکراتا ہُوا، شگفتہ سا اور بھولا بھالا کھِلونا دے دِیا۔ جِس کی شکل و صُورت بالکل اسی کی مانند تھی ؂

اَور اِنسان کے گھر کا صحن اِس ننّھے معصوم فرشتے کے توتلے نغموں سے گونجنے لگا ؂
لیکن اَب اِنسان کی زِندگی، پہلے کی بے فکر زِندگی نہ تھی۔ دُنیا میں چاروں طرف اس کے لئے غم و فکر، تشویش و مصیبت، رنج و آلام، کا ایک طُوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جس سے وہ گھبرا جاتا، ڈر جاتا اَور تڑپ اُٹھتا ؂
جب وہ رنج و مصائب سے گھبرایا ہُوا گھر آتا تو وُہ خوبصُورت، ننّھا سا کھِلونا۔ اَبا۔ اَبا، کہتا ہُوا اِس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتا۔ تب اِس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں ؂
اُسے تمام تکلیفیں اَور مصیبتیں بھُول جاتیں۔ اُس کی رُوح پر مسرّت کا ایک نشہ سا چھا جاتا۔ وہ اَپنے بچّے کو پیار سے اُٹھا کر چُوم لیتا، چھاتی سے لگا لیتا اَور پرماتما کا شکریہ اَدا کرتا ؂
اَب وہ عورت کو بھی چاہتا تھا۔ اُسے دُنیا سے بھی مُحبت تھی اور اُس کی زِندگی میں بھی ایک رَس تھا ؂
عورت ــــــ وہ اُس خوبصورت کھِلونے کو پاکر خوشی سے جھُوم سی رہی تھی، اور اس کے دِل میں مرد کے لئے عقیدت کا ایک بحرِ بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا تھا ؂
اُس خوبصُورت کھِلونے نے اُن کے شِکستہ دِلوں کو پھر سے جوڑ دِیا تھا ؂

سُنہری کتاب

فردوس کے سُنہری دَروازے پر ایک ننّھی لڑکی کھڑی تھی۔ یہ اُن لوگوں کے چہروں کو بڑے غور سے تک رہی تھی۔ جو اِس دَروازے سے اَندر داخل ہو رہے تھے ؂
لڑکی ــــــ "کیا مَیں بھی اَندر جا سکتی ہُوں؟"
دربان فرشتہ ــــــ "مجھے معلوم نہیں، ہمارے بادشاہ سلامت آج صرف اُن

لوگوں کو اندر داخل ہونے کا موقعہ دے رہے ہیں جن کے نام اِن کی سُنہری کتاب میں درج ہیں؛

لڑکی —— اِس سنہری کتاب میں کِن لوگوں کے نام درج ہیں؛

فرشتہ —— جن لوگوں نے اپنی زندگی میں نیک کام کیے تھے؛

لڑکی —— کیا میرا نام بھی اِس کتاب میں درج ہے؟

فرشتہ —— مَیں کتاب دیکھ کر بتا سکتا ہُوں؛

لڑکی —— مہربانی فرما کر ضرور دیکھئے۔ میرا خیال ہے، کہ میرا نام اِس کتاب میں ضرور درج ہوگا۔ چونکہ مَیں نے اپنی زندگی میں بہت سے نیک اور اچھے کام کیے ہیں۔ میری سب اُستانیاں ہمیشہ میری تعریف کیا کرتی ہیں۔ کہ تم بہت ہونہار لڑکی ہو؛

فرشتہ —— پیاری لڑکی، مَیں نے تمام کتاب دیکھ لی ہے۔ اِس میں تمہارا نام درج نہیں؛

لڑکی —— ذرا ایک بار پھر ساری کتاب کا ملاحظہ کیجئے۔ مَیں نے ایک دفعہ اپنی کفائیتی صندوقچی میں سے آدھے پیسے ایک پرچارک کو دیئے تھے، تاکہ اِس نقدی سے ایک یتیم لڑکی کی مدد کی جائے؛

فرشتہ —— افسوس! تمہارا یہ کام بھی سُنہری کتاب میں درج نہیں؛

لڑکی —— جب بھی میرے والدین مجھے نئے کھلونے لاکر دیتے ہیں۔ تو مَیں اُن میں سے آدھے کھلونے ہمیشہ غریب بچّوں کو بانٹ دیا کرتی ہُوں۔ یہ کام تو اِس کتاب میں ضرور درج ہوگا؛

فرشتہ —— پیاری بچّی۔ مَیں ایک بار پھر تلاش کرتا ہُوں۔ شائد تمہارا یہ کام درج ہو! افسوس، مَیں نے تمام کتاب ایک سرے سے دُوسرے سرے تک دیکھ لی ہے، مگر تمہارا یہ کام بھی اِس کتاب میں درج نہیں ہے؛

لڑکی —— مجھے اَور کچھ یاد نہیں۔ اور مجھے اِس اَمر کا نہائیت رنج ہے۔ کاش! مَیں نے بھی بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے کوئی نیک کام کیا ہوتا؛

فرشتہ ——— ننھی بچی۔ مہربانی کا کوئی کام ایسا نہیں جو بادشاہ سلامت کو پسند نہ ہو۔ لیکن سنہری کتاب میں وہ کام درج ہیں جو بغیر کسی صلہ و ستائش کے کئے گئے ہوں۔ اس کتاب میں ایک یہ بات ضرور درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک ننھی لڑکی نے ایک بھوکے لڑکے کو بازار میں دیکھا، اور اس پر ترس کھا کر اپنا کیک اسے دے دیا۔ کیا تم وہی لڑکی ہو؟

لڑکی ——— افسوس! مجھے اس کے متعلق کچھ یاد نہیں۔ اگر میں نے کوئی کیک دیا تھا تو میں اسے اب تک بھول چکی ہوں ؛

فرشتہ ——— پیاری بچی۔ خدا ان باتوں کو زیادہ یاد رکھنا چاہتا ہے جن کو ہم بھول جاتے ہیں ؛

فرشتے نے محبت سے ننھی بچی کے ہاتھ کو تھاما اور اسے نورانی زینے پر سے گزار کر بادشاہ کے تخت کے سامنے لے گیا۔ بادشاہ سلامت ننھی بچی کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑے اور اسے اپنی بغل میں بٹھا لیا۔ اب ننھی بچی کے کانوں میں نہایت سُریلے سروں میں آواز آئی:

"میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے کھانے کو دیا۔ یہ مہربانی جو تم نے اپنے ایک ادنےٰ ترین بھائی پر کی، مجھ پر کی۔ پیاری بچی! تمہاری عنایت کا شکریہ!"

لیمپ اور پروانہ

آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں اٹھیں۔ بجلی نے کڑک کر ہوشیار باش کی صدا دی۔ بادل گرجے اور رم جھم رم جھم برکھا ہونے لگی۔ پانی کی بوند بوند میں امرت تھا۔ اور ہر ایک قطرہ زندگی کی مٹھیاں بھر بھر کر چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ بے جان مٹی نے حرکت کی اور بے شمار ننھی ننھی ہستیوں نے دنیا میں پہلی دفعہ آنکھ کھولی۔ انہیں میں ایک پروانہ بھی تھا۔ وہ میرے لیمپ کے قریب آیا۔ اور منڈلا منڈلا کر چکر لگانے لگا ؛

لیمپ نے کہا ——— "دیوانے مجھ پر کیوں گرا پڑتا ہے" ؛

پروانے نے جواب دیا ——— "تو روشن ہے، میرے وطن کا ہے۔ اس لئے تیرے

گلے ملتا ہوں" ؛

لیمپ ہنسا ــــــ "تو خبطی ہے۔ ارے پاگل پیچھے ہٹ کر رہ۔ میری لو پر مستت نہ ہو۔ یہ جلا کر تجھے خاک سیاہ کر دے گی" ؛

پروانے نے کہا ــــــ "تب کیا ہو گا ؟"

"تب تو مر جائے گا" ؛

پروانہ نہ سمجھ سکا۔ مرنا کسے کہتے ہیں۔ بولا ــــــ "وہ کیا ہوتا ہے" ؛

جواب ملا ــــــ "ایک حالت"

"کیسی"

جواب ملا۔ "جیسی پیدا ہونے سے پہلے تھی۔ پروانے نے قہقہہ لگایا۔ اسی کے لئے تو تڑپ رہا ہوں۔ خبردار مجھے نہ روکنا ؛

لیمپ خاموش ہو گیا۔ اب چمنی کی باری تھی۔ وہ تنکیھی ہو کر بولی ــــ "ہوش کرو مجھے ضرر نہ پہنچانا" ؛

"تو کون ؟"

چمنی نے کہا ــــ "شیشے کی دیوار !"

"دو کوڑی کی چمنی اور میرے منہ آئے۔ ہٹ جا پرے۔ تو کون ہے جو ہمارے درمیان قائم رہ سکے" ؛

یہ کہا اور ایک ٹکر ماری۔ چمنی پھٹ گئی اور شگاف میں داخل ہو کر جا نذار پروانہ لو پر گرا۔ لو ایک لمحہ کے لئے اونچی اٹھی۔ گویا اپنے عاشق کا استقبال کیا۔ اور پھر برابر ہو گئی ؎

آ گیا چین اسے شمع پہ جل جانے سے
لذت مرگ کوئی پوچھے تو پروانے سے

●○●

کھٹمل کی پھٹکار

رات کا وقت تھا میں گہری نیند سو یا پڑا تھا۔ یکلخت ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے جسم میں سوئی چبھو دی ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھا اور لیمپ روشن کیا۔ کھٹمل میرے بستر پر براجمان تھا، اور میری طرف مُڑ مُڑ تک رہا تھا:

مَیں نے کہا —— "بابا! میری چارپائی ہے یا کوئی قلعہ کہ دشمن کی طرح دھڑک دھڑک کر آتے ہو۔ کہو میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، جو خواہ مخواہ ستاتے ہو۔ دنیا خالی پڑی ہے۔ آنند کرو، مگر میری کھاٹ چھوڑ دو"

کھٹمل نے کہا —— "تمہاری کھاٹ"؟

مَیں نے کہا —— "ہاں میری کھاٹ!

"کیسے"؟

کھٹمل نے طنزیہ جواب دیا —— "میں تمہارے زمانے کو کیا کروں۔ مینڈک کا گواہ خواجہ۔ میرا نام ہی دیکھو۔ کھاٹ مل۔ یعنی کھاٹ کا مالک":

مَیں نے چلا کر کہا —— "کیا کہتے ہو۔ تم کھاٹ کے مالک ہو"؟

"ہاں میں کھاٹ کا مالک کھاٹ مل ہُوں۔ تم اختصار پسند انسانوں نے کھاٹ مل کا کھٹمل بنا لیا ہے۔ کھاٹ کا مالک تو میں ہوں۔ تم دعوے دار ہوتے ہی کون ہو۔ چاہو تو چار سمجھداروں کی کمیٹی بنا لو۔ جو فیصلہ کر دیں، منظور":

مَیں نے لاجواب ہو کر بات کا رُخ بدل دیا اور کہا —— "اچھا تم انسانوں کا خُون کیوں چُوستے ہو۔ تمہارے لئے قانون کی کوئی دفعہ بنتی چاہیئے":

کھٹمل نے کہا —— "میں تو رات کے وقت تنہائی میں چھُپ کر خُون پر چھاپہ مارتا ہُوں، تم میرے لئے قانون بناتے ہو۔ اپنے بھائیوں کی طرف نہیں دیکھتے جو دُکانوں میں ساہوکار بن کر، کچہری میں عہدیدار بن کر، وکیل بن کر، سادھو بن کر، مہاتما بن کر، دن رات

اِنسانوں کا خون پیتے رہتے ہیں۔ میرے لئے دفعہ بنواتے ہو۔ کیا اُن کے لئے دفعہ کی ضرورت نہیں"؟
"اُن کے لئے موجود ہے۔ تمہارے لئے بننی چاہیئے۔ تم خُون پینا ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے"؟
"یہ اُپدیش پہلے کھٹمل اِنسانوں میں ہونا چاہیئے۔ جب وہ خون پینا ترک کر دیں گے تو ہم تمہارے اُپدیش پر غور کریں گے"؟

مَیں نے کہا ——— "ایک بات بتاؤ۔ تم خُدا پرست لوگوں کو کیوں ستاتے ہو؟ کھٹمل جو ان کھٹمل اِنسانوں کو کاٹے تو قابل معافی ہے، مگر غریب آدمیوں کی نیند خراب کرنے سے کیا حاصل؟"

کھٹمل نے ہنس کر کہا ——— "یہ تو اُن پر احسان ہے۔ کالی رات میں جب سب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو ایک آنکھ کھُلی رہتی ہے، جو سب جگہ دیکھتی ہے، اور ہر طرف کو دیکھتی ہے، اور سب کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ تو ایک کان بچا رہتا ہے۔ جو ہر جگہ سُنتا ہے، اور ہر طرف کی سُنتا ہے۔ مَیں خدا پرستوں کو کاٹ کر اُٹھاتا ہوں۔ کہ رات بیتی جاتی ہے۔ اُٹھو اور آنسو بھری آنکھ اور کانپتی ہوئی زبان سے اپنے دل کے ٹکڑوں کو پیار رکھنا کا لباس پہنا کر اُس کے حضور میں پیش کرو۔ جو ہر وقت دیکھتا ہے اور ہمیشہ سُنتا ہے۔ ایسے رحمت کے وقت میں مَیں سوتی ہوئی رُوحوں کو جگا کر کہتا ہوں۔ کہ اپنے سوامی کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اور اپنے مولا کا سمرن کرو" ؎ (شُدروشن)

داستانِ معدہ

مَیں آٹھ اِنچ لمبا، چار پانچ اِنچ چوڑا اور ڈیڑھ ڈومیبر کی جسامت کا گوشت کا بنا ہُوا ایک تھیلا سا ہُوں، اور ایک اِنسان کے جسم کے اندر رہتا ہوں۔ ایک شخص جتنا کچھ بھی کھاتا پیتا ہے، اُسے مَیں ہی ہضم کرتا ہُوں۔ بھوجن پہنچنے پر پہلے مَیں اس میں ایک ہاضم لعاب اُنڈیل دیتا ہوں، اور پھر اپنی ساری جسامت کو سکیڑ کر اور اپنے اعضا کی مشینری کو کام میں لا کر سارے کھانے کو ایک بار پُوری محنت سے خُوب ہلا دیتا ہوں، تاکہ کھائی ہوئی تمام

اشیاء اچھی طرح رِل جائیں۔ اِس طرح کئی گھنٹوں کی لگاتار اور سر توڑ کوششوں کے بعد اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہوں پھر بھوجن کو آنتوں میں دھکیل دیتا ہوں۔ جتنی دفعہ بھی بھوجن میرے اندر داخل ہوتا ہے، مجھے یہ عمل ہر بار دہرانا پڑتا ہے۔ اِس طرح میں حتے المقدور ایک اِنسان کی زندگی بھر، اور پھر بے لوث اور بے غرضانہ خدمات پوری کوشش کے ساتھ سر انجام دیتا رہتا ہوں۔ اور جو کچھ مجھے مِلتا ہے، اسے سارے جسم کے لئے ایک مُفید مطلب سی چیز بنا کر بھیج دیتا ہوں، اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھتا ؛

مَیں نے اپنی ساری زندگی اِنسان کے فائدہ کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ دُکھ سُکھ اور مشکل، بیماری کی حالت میں بھی مقدور بھر اِنسان کی خدمت سر انجام دیئے جاتا ہوں۔ لیکن اِس طرح اِنسان پر مر مٹنے اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے باوجود بھی اِنسان کے ہاتھوں مجھے جو ایذائیں اُٹھانی پڑتی ہیں، خُدا وہ کسی بدترین دُشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اگر مَیں اپنی وہ ساری دُکھ بھری کہانی سنانے بیٹھوں، تو پتھر سے پتھر دِل بھی موم ہو جائے، اور میری رام کہانی شائد اِنسان کی بنائی ہوئی مہا بھارت سے بھی کہیں زیادہ طویل ہو جائے ؛

خدا معلوم اِنسان کو مجھ سے کیوں خُدا واسطے کا بَیر ہے، کہ وُہ اپنی تمام تر دماغی طاقت کو مجھے ستانے پر ہی صرف کر دیتا ہے۔ ہندوستانی مجھے اپنے جن اطوار سے پریشان کرتے ہیں، ان میں پہلا نمبر کھانے پینے میں ان کی بے اعتدالی ہے۔ پابندی وقت کو تو یہ لوگ ویسے ہی ملحوظ نہیں رکھتے، لیکن بھوجن کے معاملے میں تو انہیں "آزادی کامل" حاصل ہے۔ دِن بھر میں جب کبھی فرصت مِلے، یا کھانے کو جی چاہے، یہ بھوجن کی بیگار سے نپٹ لیں گے۔ اِس لئے ان کے کھانا کھانے کے اوقات اور ان کی طبیعتوں میں بھی آئے دِن تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی تو کئی کئی گھنٹے بے کھائے پیئے گذر جائیں گے، اور کبھی کھانا کھانے کے دو اوقات میں بہت ہی کم وقفہ رہ جاتا ہے۔ اِن کی اِس بد اطواری اور بد اعتدالی کی وجہ سے میرا اپنا سارا پروگرام اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ اوقات غیر معین ہونے کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ پھر یہ لوگ گھر کے کھانے پر ہی اِکتفا نہیں کرتے ؛ بازاری اشیاء پوری کچوری،

گول گپے، بھلے پکوڑی اور پھل وغیرہ تو یہ لوگ روزمرّہ کی خوراک سے خارج سمجھتے ہیں، ان چیزوں کو تو یہ لوگ طبیعت کی تسکین اور لذّت، سواد کے لئے کھاتے ہیں۔

کئی اصحاب تو سارا دن ہی بکری کی طرح چرتے رہتے ہیں۔ اور جب کھانا کھانے بیٹھیں تو بڑے فیلسوف بن جاتے ہیں۔ کہ "مجھے تو بھوک ہی نہیں لگتی"۔ ایسے "مہربانوں" کی بداعتدالیوں کی وجہ سے مجھے تو ایک منٹ کے لئے کبھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ میں تو ایک لمحہ کے لئے کبھی دم نہیں مار سکتا، کیونکہ ابھی پچھلا بھوجن ختم ہوتے نہیں پاتا، کہ اور آجاتا ہے۔ دُنیا میں جتنی بھی مخلوق بستی ہے، سب کو آرام کی ضرورت ہے۔ لیکن انسان کی ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ مجھے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں؟

بعض اصحاب کھانا سامنے آجانے پر بالکل بے قرار ہو جاتے ہیں، اور کھاتے وقت اتنی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، کہ کھانے کی اشیاء چبانے کی زحمت گوارا کئے بغیر دھڑا دھڑ حلق سے اُتارتے جاتے ہیں، اور جب تھالی صفاچٹ کر دیتے ہیں، تب جا کر اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔ چبائے بغیر کھائی ہوئی اشیاء کے ساتھ لعاب دہن ملائے بغیر اُنہیں حلق سے نیچے اُتار دینے سے مجھے جو تکلیف ان اشیاء کو ہضم کرنے میں ہوتی ہے، اُس کا اُنہیں رتی بھر احساس نہیں ہوتا۔ یہ مصیبت جسے بھگتنی پڑے، بس وُہی جان سکتا ہے۔ جو کام دانتوں ایسے تیز جسمانی پرزوں کے لئے مخصوص ہے، وہ مجھ نازک سے عضو کو کرنا پڑتا ہے۔ کئی لوگ زیادہ گرم اشیاء مجھ میں اُنڈیل دیتے ہیں۔ یہ میری طبع نازک کو تو ناگوار گذرتا ہی ہے۔ اس سے اُن لوگوں کی قوت ہاضمہ بھی خراب ہو جاتی ہے۔ گرم گرم اشیاء کے فوراً کھاتے کے بعد ہی یہ لوگ جھٹ برف اور دیگر ٹھنڈی اشیاء بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح قوت ہاضمہ آدھ گھنٹہ کے لئے بالکل ناکارہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی بد اعتدالیاں کرتے والے کیا جانیں!

کئی اصحاب تو لال مرچ اتنی تیز اور زیادہ مقدار میں کھاتے ہیں کہ بھاجی سالن لال ہی رہتا ہے۔ سُرخ مرچ تو ویسے ہی جا ہے ہونٹوں کو لگا دیکھئے، تو وہ جل اُٹھتے ہیں، لیکن مجھ پتلے سے گوشت کے لوتھڑے میں مرچیں بھیتاب دینے سے یہ لوگ کیا مجال دریغ کر جائیں۔ لال مرچ سے بعض اوقات بیرونی اعضاء پر چھالے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن انہیں اس

سے کیا غرض ؟

تیل میں تلی ہوئی اور دیر ہاضم اشیاء کھانے کا تو ہر کسی کو شوق ہوتا ہے۔ کئی لوگ تو گوشت، مچھلی، گھاس، مٹی، پتھر اور حتیٰ کہ کانچ تک چبا جاتے ہیں۔ اِن اشیاء کے کھانے سے مجھے کون کون سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اور میری کیا کیفیت ہوتی ہوگی ؟

کھانے کی اشیاء جتنی ثقیل اور مقدار میں زیادہ ہوتی ہیں، اُسے ہضم کرنے میں اُتنا ہی وقت صرف ہوتا ہے۔ اگر بہت سی مقدار میں ایسی چیزیں مجھ میں جمع ہو جائیں تو اس سے بہت سی زہریلی گیسیں اور مضرِ صحت تیزابی مادے پیدا ہو جاتے ہیں، اور ان اشیاء سے بدبو سی پیدا ہونے لگتی ہے میرا حلیہ بگڑ جاتا ہے اور مجھے کل نہیں پڑتی۔ لیکن قدرت کے اس انتباہ کے باوجود انسان کوئی درسِ عبرت نہیں لیتا، اور نہ ہی کھانے پینے کے معاملے میں کوئی اصلاح کرتا ہے ؛ (غم نصیب معدہ)

تین پریاں

دُنیا بن چکی تھی، اور خُدا کے سامنے اِسے حقیقی مسرّت بخشنے کا سوال پیش تھا ؛ یکایک حسین فرشتوں میں حرکت پیدا ہوئی، اور ایک بے حد حسین پری خدا کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ؛

"مالک ! حقیقی مسرّت مجھ سے ہے" اُس نے کہا ؛

خُدا نے اُسے دُنیا کو حقیقی مسرّت بخشنے کے لئے بھیج دیا۔ اُسے محبّت کہتے تھے ؛

دُنیا میں اس پری کے آتے ہی ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ ہر شخص کے دِل میں ایک میٹھا درد اُٹھا۔ ہر کوئی کسی نہ کسی سے محبت کرنے لگا۔ اور پھر اُداس سی دُنیا میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ محبّت کے نام پر لڑائیاں لڑی جانے لگیں۔ جنگ ہونے لگے کامیاب جدوجہد ترک کر کے اپنی الگ دُنیا بنانے لگے، اور ناکام خودکشیوں پر اُتر آئے ؛

خُدا کا تخت ڈگمگایا۔ ایک بار پھر دربار منعقد ہوا۔ فرشتے اور پریاں اکٹھے ہوئے

خدا نے سب کو صورتِ حالات سے روشناس کرایا؛

مجمع میں پھر ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اور پھر گویا چمک سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک پری آگے آئی۔ اس کے بیش قیمت لباس اور چمک دمک سے سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دربار جگمگا اُٹھا۔ "دنیا کو حقیقی مسرت دینے میں جاؤں گی۔" وہ بولی؛

خدا نے اسے بھیج دیا۔ اس کا نام دولت تھا؛

اس کے زمین پر آتے ہی تمام نقشہ بدل گیا۔ سب دولت کے لئے بھٹکنے لگے۔ محبت دولت کے ہاتھوں فروخت ہونے لگی۔ جنگ اور لڑائیوں میں اضافہ ہو گیا۔ دولت مندوں کا اطمینان اُڑ گیا۔ کیونکہ ان کے پاس دولت تھی، اور غریبوں کے دِل بے اطمینانی کی آماجگاہ بن گئے کیونکہ دولت ان سے چھن گئی تھی؛

خدا کو اپنے کیے کا احساس ہُوا۔ اس دفعہ اس نے خود ایک ایک فرشتے کو بلانا شروع کیا۔ فرشتوں اور پریوں کی قطاریں شہنشاہ جہان کے روبرو ہو کر گزرنے لگیں۔ خدا نے ایک پری کی طرف اشارہ کیا۔ پری آگے آئی۔ سادگی اور معصومیت کی تصویر ——!

"تم جاؤ۔ دولت اور محبت سے بھٹکائے جانے والوں کو حقیقی مسرت بخشو"؛

پری نے اپنے پر ہوا میں پھیلائے اور نہایت سادگی سے اُڑ گئی۔ جہاں جہاں یہ پری پہنچی، مسرت کا دور آ گیا؛

اس کا نام قناعت تھا؛ (اشک)

کانچ کا محل

ایک بہت بڑے کمرے میں، جس کی دیواروں پر چاروں طرف سینکڑوں آئینے لگے تھے کہیں سے ایک بھٹکا ہُوا کُتا گھس گیا۔ سینکڑوں آئینوں میں اپنی شکل دیکھ کر وہ چونکا۔ اُس نے جدھر نظر ڈالی، اُدھر ہی ہزاروں کتے دکھائی دیئے۔ وہ سمجھا کہ یہ سب کتے اُس پر ٹوٹ پڑیں گے اور اُسے مار ڈالیں گے۔ اب ذرا اپنا رعب جمانے کے لئے وہ بھونکنے لگا۔ اُسے سب کتے بھونکتے ہوئے

دِکھائی دیئے۔ اُس کی آواز کی گُونج اُس کے کانوں میں زور سے آنے لگی۔ دِل دھڑکنے لگا۔ وہ ذرا زور سے بھونکا۔ سب کُتّے بھی زور سے بھونکتے دِکھائی دِیئے۔ اَب وہ اُن کُتّوں پر جھپٹا۔ وُہ بھی اُس پر جھپٹے، بیچارا زور زور سے اُچھلا، کُودا، بھونکا اور چِلّایا۔ آخر میں غش کھاکر گر پڑا ؎

کُچھ دیر بعد اُسی کمرے میں ایک دُوسرا کُتّا آیا۔ اُس کو بھی ہزاروں کُتّے دِکھائی دیئے۔ وُہ ڈرا نہیں پیار سے اُس نے اپنی دُم ہلائی۔ سبھی کُتّوں کی دُم ہِلتی دِکھائی دِی۔ وہ خوش ہُوا اور کُتّوں کی طرف دُم ہلاتے آگے بڑھا۔ وُہ خوشی سے اُچھلا، کُودا، اپنے ہی سایہ سے کھیلا، مُسکرایا اور دُم ہِلاتا باہر چلا گیا ؎

جب مَیں اپنے ایک دوست کو پریشان، ناراض اور چڑچڑاتے دیکھتا ہُوں تب مُجھے یہی قِصّہ یاد آتا ہے۔ مَیں اُس کی مثال بھونکنے والے کُتّے سے نہیں دینا چاہتا۔ یہ تو حد درجہ کی بدتمیزی ہوگی۔ مگر اس کہانی سے وہ چاہیں تو کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں ؎

یہ دُنیا ایک کانچ کے محل جیسی ہے۔ اپنی طبیعت، اپنے مزاج کا سایہ ہی اُس پر پڑتا ہے۔ "آپ بھلے تو جگ بھلا"۔ "آپ بُرے تو جگ بُرا"۔ اگر آپ خوش رہتے ہیں۔ دُوسروں کے نُقص نہ دیکھ کر اُن کی خوبیوں کو ہی دیکھتے ہیں تو دُنیا بھی آپ سے نرمی اور پیار کا برتاؤ کرے گی۔ اگر آپ ہمیشہ لوگوں کے عیب ہی دیکھتے ہیں اور اُنہیں اپنا دُشمن سمجھتے ہیں اور اُن کی طرف گھُور کر دیکھا کرتے ہیں تو پھر وُہ کیوں نہ آپ کو کاٹنے کو دَوڑیں ؎

تیسرا دوست

شہر میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اُس کے تین دوست تھے۔ مگر وہ ایک دوست سے حد سے زیادہ محبّت رکھتا تھا۔ اور اُسے جان سے بھی عزیز جانتا تھا۔ لیکن خُدا کی قُدرت وہ دوست اس محبّت کرنے والے شخص کی ذرا پرواہ نہ کرتا تھا ؎

وُہ آدمی اپنے دُوسرے دوست سے بے شک محبّت تو کرتا تھا، مگر پہلے دوست کی نسبت بہت کم۔ لیکن یہ دوست بے وفا تھا۔ اس کے دِل میں محبّت کرنے والے شخص کے لِئے

محبت تھی :-
تیسرے دوست کی طبیعت اِن دونوں سے نرالی تھی۔ وہ شخص اس کی بالکل پرواہ نہ کرتا تھا، اور کبھی محبت کا اظہار تک نہ کرتا تھا۔ مگر وہ دوست اُس شخص پر دِل وجان سے فدا تھا، اور ہر وقت اُس شخص کی خیر خواہی میں لگا رہتا تھا :-
اتفاق سے اُس شخص کے خلاف کسی جُرم میں مُقدمہ دائر ہو گیا۔ جج نے اُسے اپنی صفائی میں گواہ پیش کرنے کا حُکم دیا۔ اُس شخص کو اپنے پہلے دوست پر جس پر وُہ دِل وجان سے فدا تھا۔ بڑا ناز تھا۔ اُس نے اُس کے پاس جا کر اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا اور گواہی دینے کے بارے میں اِلتجا کی۔ مگر اُس دوست نے ایسا کرنے سے صاف اِنکار کر دیا :-
پھر مُصیبت زدہ شخص اپنے دُوسرے دوست کی خدمت میں حاضر ہو کر گواہی دینے کے لئے مُلتجی ہُوا۔ اُس نے شہادت دینے کا اُس کے ساتھ اقرار تو کر لیا۔ مگر افسوس کہ وہ وقت مُقررہ پر کچہری کے دروازہ تک ہی اُس کے ساتھ گیا۔ اس سے آگے جانے سے اُس نے صاف اِنکار کر دیا :-
جب دونوں دوستوں نے ایسے آڑے وقت میں بے وفائی کا اظہار کیا۔ اور اُسے بالآخر حاکم کے سامنے رُوبرُو پیش ہونا تھا تو اس کا تیسرا دوست جسے اُس نے اپنی مُصیبت کا حال تک نہ سُنایا تھا۔ اُس کے ساتھ موجود تھا۔ حاکم کے سامنے اُس سچے دوست نے ایسی پُر زور شہادت دی کہ وہ صاف بری ہو گیا، اور خوش خُوش گھر لوٹا :-

جانتے ہو، یہ تین دوست کون ہیں ؟
پہلا دوست "زر" جو گمراہ انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جب انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، تو یہ عزیز ترین دوست سب سے پہلے اُس سے جُدائی اختیار کر لیتا ہے :-
دُوسرا دوست "رشتہ دار" ہے۔ جو انسان کی موت کے وقت اُس سے بہت ہی ہمدردی کا اظہار کرتا بلکہ ساتھ دینے کا دم بھرتا ہے، مگر افسوس وہ شمشان بھُومی یا قبر تک ساتھ دینا ہی گوارا کرتا ہے، اور آگے جانے پر قطعاً رضامند نہیں ہوتا :-
تیسرا دوست "نیک عمل" ہے۔ جسے گمراہ انسان اپنی کوتاہ اندیشی سے دوست ہی تصور

نہیں کرتا۔ جب انسان کا اِس دنیا سے تعلق قطع ہو جاتا ہے، تو صرف "نیک اعمال" ہی اُس کے ساتھ جا کر اُسے آئندہ جنم میں سُرخرو بناتے ہیں۔ دھن، دولت اور عزیز، رشتہ دار نہیں ؏

نقل سے بچیئے۔ ہمیشہ اصل خریدیئے

ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" کی تصنیف شُدہ اپنے مضمون کی بے نظیر اور لاجواب کتابیں پبلک میں اس قدر مقبول ہُوئی ہیں کہ ان کے چودہ چودہ ایڈیشن تک چھپ چکے ہیں۔ اِن کتابوں کی بڑھتی ہوئی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت کو دیکھ کر نقال لوگ ایک آدھ لفظ کا ہیر پھیر کر کے اِن کتابوں کے ناموں سے مِلتے جُلتے نام رکھ کر، اِن کی نقلیں تیار کرنے لگے ہیں۔ اس سے یہ بات تو صاف ظاہر ہی ہے کہ اِن کتابوں نے اپنی خاص الخاص بے پناہ خوبیوں اور دلچسپیوں کی بدولت ہی اِتنی مقبولیت حاصل کی کہ آج ان کی نقلیں تیار ہونے لگی ہیں۔ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایڈیٹر "رہنمائے زندگی" کی ایک ایک کتاب ایک لمبے عرصہ کی ریسرچ، اپنے مِشن کی خاص لگن، برسوں کی لگاتار محنت اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہوتی ہے جبکہ حاسد اور نقال لوگوں کا دِل میلا ہوتا ہے اور وہ محض پیسہ بٹورنے کی نیت سے کام کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اصل کتاب کا خریدار جہاں مُصنّف کی محنت، قابلیت اور جدّت کی داد دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کا موجب بنتا ہے —— وہاں نقلی کتاب کو قبول کرنے والا خریدار ملک میں گھٹیا لٹریچر کی اشاعت اور نقالوں کی تعداد بڑھانے کی نُقصان دہ غلطی کرتا ہے۔ پس، آپ ہمیشہ اصل خریدیئے۔ نقل سے بچیئے ؏

شری مہانند ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے دِلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی میں چھپوا کر دفتر "رہنمائے زندگی" ۱۴۳۹ ملتانی ڈھانڈہ، پہاڑ گنج۔ نئی دہلی ۱ سے شائع کیا ؏

RAHNUMAI ZINDGI
NEW DELHI

ANNUAL 1957
DAILY-LIFE TRUE STORIES

REGD. NO.
D. 250.

تندرستی، خوبصورتی و درازیٔ عمر کے قیمتی گُر بتانے والی زمانۂ حال کی بہترین کتاب

رہنمائے صحت

بارہ حصے مجلد



رہنمائے صحت میں صحت و تندرستی کے
سنہری اصول، بیماریوں سے بچنے اور تندرست
رہنے کیلئے مفید مشورے، ہر طرح کی کمزوری و
لاغری کو دور کر کے ہمیشہ جوان بنائے رکھنے کی
بالتصویر کسرتیں، دنیا کے مشہور آدمیوں کی قابل تقلید
صحت کے راز اور ان کے ذاتی تجربات، عمر
بڑھانے اور سو سال تک جینے کے قدرتی طریقے
گھروں میں عام ہونے والی بیماریاں اور ان کے لئے
آسان اور بے خطا نسخے سر سے پاؤں تک تمام
مردانہ اور زنانہ اعضاء کی جوانی و خوبصورتی بڑھانے
اور اسے مدت تک قائم رکھنے کے پوشیدہ راز
جن بیماریوں کا ذکر شرم کے مارے ڈاکٹر حکیم تک سے
نہیں کیا جاتا عورتوں مردوں کی ایسی تمام پرائیویٹ

بیماریوں کیلئے وہ دوائیں نایاب چٹکلے
بیماریوں میں تیار ہونے اور
نسخے جو کروڑوں سے دکھلاتے ہیں
شہریوں کے فائدے کی ایک سو مشہور
ہندوستان اور یورپ کے اصل فارمولے
اشتہاری دوائیوں ویدوں حکیموں و
ملک کے نامی ویدوں اور سینہ بسینہ
اور ملک کے بار بار آزمودہ اور سینہ کتاب
ڈاکٹروں کے ایسے نسخے درج کر کے کتاب
محفوظ چلے آرہے مفید مطلب بنا دیا ہے
کو ہر طرح سے مکمل اور سدھار کر زندگی کا سچا
جو لوگ اپنی صحت کو خواہشمند ہیں ان کیلئے
لطف اٹھانے کے اشد ضروری ہے
اس کتاب کا مطالعہ

قیمت چھ روپے محصول ڈاک 3/1
چھ رنگا ٹائٹل

۲۰۰ بیش قیمت مضامین
۱۵۰ تصویریں

بارھواں ایڈیشن ... صفحات کے نہایت خوبصورت
اضافہ کیساتھ ۱۲ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے